وحشت

حیات اور فن

معید رشیدی

معید رشیدی

بیسویں صدی کے ممتاز شعرا میں حضرت علامہ وحشتؔ اپنے ہم مرتبہ شعرائے کرام میں سے کسی سے کم نہیں تھے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو اہلِ نقد و نظر نے حضرت وحشتؔ کے ساتھ وہ انصاف نہیں کیا جو ان کا حق تھا۔ اگر چہ چند انتہائی بالغ نظر شعرائے کرام نے ان کے کلام اور فن کو مستند مانتے ہوئے اپنی اپنی رائیں دی ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر اردو تاریخ ادب میں حضرت وحشتؔ کے بارے میں ایک سناٹا سا پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ رام بابو سکسینہ نے بھی ہندوستان کے شعرائے کرام میں وحشتؔ کا نام نہیں لیا۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بنگال کے اردو اہلِ نقد و نظر نے کوئی توجہ نہیں دی، کیوں کہ بنگال میں اردو شعرا کی تو کمی نظر نہیں آتی، لیکن نثر نگار خال خال دکھائی دیتے ہیں۔

اس کمی کو بہت بڑی حد تک جناب معید رشیدی نے اپنی گراں قدر کتاب 'وحشتؔ: حیات اور فن' سے پورا کر دیا ہے۔ میری نظر سے حضرت وحشتؔ پر اتنی مفصل اور معتبر کتاب ابھی تک نہیں گزری۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے توسط سے اردو دنیا حضرت وحشتؔ کو اس بلند مقام پر پہچانے گی جو ان کا حق ہے۔ یہ کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ ہندوستان کی ہر لائبریری میں رکھی جائے، تا کہ اہلِ تحقیق وحشتؔ کے بارے میں صحیح استفادہ کر سکیں۔

— سالک لکھنوی

ARSHIA PUBLICATIONS

D-829, Dilshad Garden, Delhi-110095 (INDIA)

Mob: (0) 9899706640, (0) 9958401344

Email: arshiapublicationspvt@gmail.com
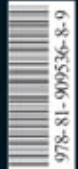
WAHSHAT : Hayaat Aur Fan
(Research and Criticism)
by: Moid Rasheedi
Year of Ist Edition : 2010
ISBN : 978-81-909536-8-9
Rs.: 140/-

نام کتاب	:	**وحشت**: حیات اور فن
موضوع	:	تحقیق وتنقید
مصنف وناشر	:	معید رشیدی
اصل نام	:	عبدالمعید
موجودہ پتا	:	237,Jhelum,JNU,New Delhi-67
مستقل پتا	:	H-10/2,B.L-5,Kankinara-743126, Kolkata(N),West Bengal
ای میل وموبائل	:	moidrasheedi@gmail.com, Mob:09910519945
مطبع	:	کلاسک آرٹ پریس، دہلی
اشاعت	:	۲۰۱۰ء
قیمت	:	۱۴۰/روپے
تعداد	:	۵۰۰
زیرِاہتمام	:	عرشیہ پبلی کیشنز
سرورق	:	روہت کوشک (9818999500)

ARSHIA PUBLICATIONS
D-829, Dilshad Garden, Delhi-110095 (INDIA)
Mob: (0) 9899706640, (0) 9958401344
Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

اماں

اور

ابا کے نام

جن کی آنکھیں ہمیشہ جاگتی رہتی ہیں
شاید کسی کی منتظر ہیں
جن کے لب ہمیشہ ورد میں رہتے ہیں
شاید انھیں کچھ شکوہ ہے
جن کے ہاتھ ہمیشہ اس سمت اٹھتے ہیں
جہاں خدا رہتا ہے
جن کا دل اس چشمۂ حیواں سے سیراب ہے
جو مقدس اور عظیم ہے، اور جو میری روح اور
وجود کا اٹوٹ حصہ ہے!!!!

فہرست

حیات

فن

○○○

عرض حال

بنگال کی مٹّی نے بے شمار شاعر پیدا کیے جن میں ایک نام رضا علی وحشتؔ کا بھی ہے۔ ملک الشعرا قاضی محمد صادق اخترؔ، عبدالغفور نساخؔ، عصمت اللہ راسخؔ اور شمس کلکتوی کے بعد وحشتؔ آسمانِ ادب پر روشن ستارے کی طرح چمکے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان میں ان کی شاعری کا طوطی بولنے لگا، جس کا اعتراف انصاف پسند شعرا و ناقدین نے دل کھول کر کیا۔ وحشتؔ کو بھی اس کا احساس تھا، جس کا غماز یہ شعر ہے:

سر زمینِ ہند گونج اٹھی تری آواز سے
شعر نے وحشتؔ ترے اک شور برپا کر دیا

یہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں، بلکہ حقیقت ہے۔ وحشتؔ نے نہ صرف اردو شاعری کی آبیاری کی بلکہ انھوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کی ہر ممکن کوشش بھی کی۔ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ انھوں نے شعوری طور پر غالبؔ کی تقلید کی اور ببانگِ دہل کی۔ اس تقلید سے انھیں نقصان بھی پہنچا اور وقتی فائدہ بھی۔ فائدہ اس طرح کہ اہلِ نقد و نظر نے انھیں غالبِؔ دوراں اور غالبِؔ ثانی مان لیا، لیکن نقصان یہ ہوا کہ وہ مقلد کی حیثیت سے دیکھے جانے لگے۔ حالاں کہ ان کی شاعری میں ان کا اپنا رنگ بھی خاصا موجود ہے، جس کی نشاندہی اہلِ فکر و نظر نے کی ہے۔ زمانہ گزرتا گیا اور وحشتؔ تقلید تقلید کے شور میں دب کر رہ گئے۔ معدودے چند اہلِ نظر نے ان کی

شاعری کو تقلید کی عینک کے بغیر دیکھا۔ وحشتؔ کی شاعری پر لکھتے وقت ناقدین کے ذہن پر پہلے ہی سے وحشتؔ بحیثیت مقلّد کا دبیز پردہ پڑا ہوتا ہے۔ نتیجتاً وہ جرأت ہی نہیں کر پاتے کہ ان کی شاعری کو اردو کی جدید شاعری کی روشنی میں دیکھ سکیں۔ اگرچہ متعدد علمائے ادب اور ناقدین نے ان کی شاعرانہ انفرادیت کا اعتراف کیا ہے۔

وحشتؔ بیسویں صدی کے شاعر ہیں۔ بیسویں صدی میں ہر خاص و عام کے ذہن پر غالبؔ کی شاعری چھائی ہوئی تھی۔ شعرا بڑی تعداد میں غالبؔ کا تتبع کر رہے تھے۔ اس دور کے تقریباً ہر شاعر نے غالبؔ کی شاعری کا اثر قبول کیا۔ بعض نے غالبؔ کی تقلید پوشیدہ طور پر کی اور بعض نے کُھلّم کُھلّا۔ اگر اُس دور کے دیگر شعرا اور غالبؔ کے کلام کا موازنہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ان کا کلام بھی اتباعِ غالبؔ پر مبنی ہے۔ ایسے میں وحشتؔ ہی موردِ الزام کیوں ٹھہریں، اور کیا یہی انصاف ہے؟ اس مسئلے پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اس کتاب میں ایک باب، بہ عنوان 'غالبؔ کے اثرات' شامل ہے، جس میں، میں نے اِس مسئلے پر کچھ کہنے کی جسارت کی ہے۔ وحشتؔ اردو کے وہ مستند شاعر ہیں، جنھوں نے اپنے دیگر ہم عصروں کے کاندھے سے کاندھا ملا کر اردو غزل کا احیا کیا۔ حسرت، فانی، اصغر اور جگر کے ساتھ وحشت کا شمار بھی اردو کے جدید شاعروں میں ہونا چاہیے۔ جو لوگ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، وہ اپنی ایمانداری اور غیر جانبداری کا دم بھرنا چھوڑ دیں۔ حالی اردو کے پہلے اور سخت گیر نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے وحشتؔ کی شاعری کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ شبلی نے ان کے کلام میں 'جدت، ندرت اور پختگی' کا اعتراف کیا۔ حسرت نے ان کی غزل پر فخر کیا۔ اقبال معترف ہوئے۔ شرر نے ہامی بھری اور نیاز فتح پوری نے ان کی شاعری کو الہام پارہ کہہ دیا۔

وحشتؔ کے معاصر شعرا نے انھیں ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا۔ حسرتؔ موہانی نے جب اپنی مشہور غزل کہی، جس کا مطلع ہے:

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

تو اس کے مقطعے میں اپنے اہم معاصر شعرا کا ذکر کرتے ہوئے وحشتؔ کا نام بھی اقبالؔ کے ساتھ لیا:

ہیں شادؔ و صفیؔ شاعر، یا شوقؔ و وفاؔ حسرتؔ
پھر ضامنؔ و محشرؔ ہیں، اقبالؔ بھی وحشتؔ بھی

علامہ اقبالؔ نے بھی خود کو وحشتؔ کا مداح بتایا۔ اس طرح ان کے عہد میں ان کی ناقدری کم ہوئی۔ ان کے ساتھ ناانصافی کی جو بات کی جاتی ہے، اس ضمن میں کہنا چاہوں گا کہ اس کی ذمے دار اس وقت کے بنگال کی وہ ادبی فضا ہے جس میں چشمک کو ذرا کم، اور عقیدت کو زیادہ دخل تھا۔ اہلِ بنگالہ نے وحشتؔ کو 'ساحرِ بنگالہ' اور 'طوطیِ بنگالہ' جیسے القاب سے تو نوازا، لیکن اس کے نتائج سے بے خبر رہے کہ یہ چیزیں شاعر کے مرتبے میں کوئی اضافہ تو نہیں کرتیں، البتہ اس کے دائرۂ تفہیم کو محدود ضرور کر دیتی ہیں۔ معاصرین نے انھیں غالبؔ ثانی تو کہہ دیا اور انھوں نے بھی فخریہ طور پر خود کو غالبِ دوراں کہا، مگر اس حقیقت سے بے نیاز رہے کہ اردو غزل کو ایک ہی غالبؔ کا ذہن نصیب ہوا ہے، اور خود کو غالبِ ثانی کہنا کچھ زیادہ اہمیت کی بات نہیں۔ انھوں نے خود پر غالبؔ کا لیبل آپ ہی چسپاں کیا۔ اس لیے ناقدین نے جو انھیں نظر انداز کیا تو ایک سطح پر اس کے ذمے دار وہ خود بھی ہیں۔ اس کا احساس انھیں بھی ہوا اور انھیں کہنا پڑا:

''غالبؔ کی تقلید میں نے بے شک کی۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ میں کچھ اوریجنل خیالات نہ پیش کر سکوں۔ میرے دیوان کا مطالعہ اگر گہرا ہو تو ظاہر کر دے گا کہ میں نے بھی کچھ نہ کچھ پیش کیا ہے۔'' (مکتوب بنام ارشد کاکوی، مورخہ ۱۶؍اگست ۱۹۵۴ء مشمولہ: مکاتیب وحشت، ص: ۱۳۰)

ہمیں اسی 'اوریجنل' سے غرض ہے کہ ان کے مقام و مرتبے کے تعین میں وہی اشعار اہم ترین حوالہ ہیں جو ان کے مخصوص رنگ و آہنگ کے غماز ہیں۔ اگر باریک بینی سے ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ایسے اشعار کی ان کے یہاں کمی نہیں جو ان کے مخصوص اسلوب کا نتیجہ ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عقیدت کی عینک کے ساتھ، تعصب کی عینک بھی اتاری

جائے اور شعری محاسن، فکری تنوع اور تخلیقی وفور کی روشنی میں ان کے کلام کو پڑھا، سمجھا اور پرکھا جائے۔ کیوں کہ بقول خواجہ احمد فاروقی:

''وحشتؔ کے کمالات کا عدمِ اعتراف نہ صرف تاریخی غلطی ہے بلکہ ناسپاسی بھی ہے۔'' (وحشت کی انفرادیت، مطبوعہ: سہ ماہی 'روحِ ادب' کلکتہ، ۱۹۸۴ء)

گیان چند جین نے بالکل صحیح کہا ہے کہ تحقیق نہایت 'حاسد داشتہ' ہے۔ اس مقالے سے متعلق مجھے اپنی کم مایگی کا احساس ہے۔ بقول وحشتؔ:

ہم سے ہوا نہ حق ادا اس کی نگاہِ ناز کا

یہ کتاب اس وقت ضبطِ تحریر میں آئی تھی جب میں بی۔ اے (آنرز) کا طالب علم تھا۔ آج تحقیق کے طریقۂ کار سے متعلق میرا نقطۂ نظر بدلا ہے۔ دہلی آنے کے بعد اب جو کتاب کی اشاعت کی نوبت آئی، تو میں نے اپنے محدود وسائل میں اسے از سرِ نو دیکھنا شروع کیا۔ نظریات میں تبدیلی کی وجہ سے بعض امور قلم زد کر دیے گئے۔ میں نے بساط بھر کوشش کی کہ تمام بنیادی و ثانوی متون پر ایک بار پھر نگاہ ڈالی جائے۔ اس کے لیے میں نے کلکتے کا سفر بھی کیا اور بہت حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔ 'حیات' والے باب میں میں نے کوشش کی ہے کہ واقعات کا بیان کم سے کم الفاظ میں ہو، لیکن ان کی روح برقرار رہ جائے۔ وحشتؔ کی حیات اور فن کے کتنے ہی گوشے ایسے ہوں گے جو تشنہ رہ گئے ہیں یا ان تک میری رسائی نہ ہو سکی۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں ان تمام پہلوؤں سے نقاب ہٹایا جائے گا۔ اپنی اس تصنیف کے حوالے سے نہ میں کسی قسم کی خوش فہمی یا خوش عقیدگی میں مبتلا ہوں اور نہ مجھے کسی نوع کا دعویٰ ہے۔ بس ایک طالب علم کی کوشش ہے کہ کسی طرح یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ نظریات تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ فکر نامیاتی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی قندیل ہمیشہ روشن رہنی چاہیے۔ سوچ کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رہے، تاکہ نئی آب و ہوا کو راہ مل سکے۔ تحقیق میں کوئی شے حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ تنقید کا کوئی گوشہ مکمل نہیں ہوتا۔ میرے اس مقالے میں اگر کوئی خوبی نظر آ جائے تو میں اسے اپنی کامیابی سمجھوں گا۔ اگر کوئی عیب/نقص نظر آئے تو اس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں، بلکہ میں خود ہوں۔

شکریے کی ادائیگی میرے لیے کوئی رسم نہیں، بلکہ میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اقبال عظیم (مصنف: مشرقی بنگال میں اردو) نے ناصر علی خاں سرہندی کو ناصریؔ لکھا ہے۔ میں نے بھی اقبال عظیم کے حوالے سے ناصریؔ لکھا تھا، لیکن اس جانب اس عہد کے برگزیدہ ناقد شمس الرحمٰن فاروقی نے میری توجہ دلائی اور رہنمائی کرتے ہوئے بتایا کہ ناصریؔ غلط ہے۔ اصل نام ناصر علی خاں سرہندی ہے۔ اس طرح میں ایک غلطی کے ارتکاب سے بچ گیا۔ ان کا شکریہ لازمی ہے۔ حضرت سالک لکھنوی، اس وقت واحد ادیب ہیں جنھوں نے ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند ادبی تحریک کی پہلی کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ انھوں نے بعض امور میں میری رہنمائی کی اور بعض واقعات کی صحت کو استناد بخشا۔ مجھ ناچیز پر قلم اٹھایا۔ ان کے الفاظ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ ان کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ پروفیسر قمر رئیس اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ انھی کے ایک مکتوب سے مجھے دہلی آنے کی ہمت اور تحریک ملی۔ انھوں نے اس کتاب کے لیے اپنے حوصلہ افزا کلمات سے نوازا۔ شکریہ ادا نہ کروں تو ناسپاسی ہوگی، لیکن ان کی آنکھیں اب کہاں ڈھونڈوں۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے 'مباحثہ' میں مجھے جگہ دی اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کتاب پر لکھا۔ ان کا بے حد ممنون ہوں۔ پروفیسر یوسف تقی ہمہ وقت علمی کاموں میں مصروف رہتے ہیں، لیکن بعض متون کی فراہمی میں انھوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ کتاب کی اشاعت کے لیے مسلسل تقاضا کیا اور فلیپ کے لیے رائے لکھ کر حوصلہ افزائی کی۔ ان کا احسان مند ہوں۔ ڈاکٹر شاہد اختر اور ڈاکٹر ہمایون جمیل خاں کی شفقت نہ ہوتی تو اس کام کے لیے ہمت جٹا پانا، میرے بس کا نہ تھا۔ ان کا شکریہ کسی صورت میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر مظہر مہدی نے آخر آخر میں ایک بنیادی متن فراہم کیا۔ ان کے لیے میرے پاس شکریے کے الفاظ نہیں ہیں۔ ڈاکٹر معصوم شرقی پرانی کتابوں کے رسیا ہیں۔ ان کی ذاتی لائبریری سے میں نے فائدہ اٹھایا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب میرے لیے کلکتے کی مختلف لائبریریوں کی خاک چھاننا نہایت مشکل تھا، کہ وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ ان کا بے حد مشکور ہوں۔ راغب اختر بڑے بھائی کا درجہ رکھتے ہیں۔ کتاب کی ظاہری تزئین میں ان کے مشورے شامل رہے۔ فیاض احمد وجیہہ اور جابر زماں سے دوستی محض چند

سالوں پر محیط ہے، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان سے برسوں کا یارانہ ہے۔ اگر آخری مراحل میں ان کے مشورے شامل نہ ہوتے تو کتاب اتنی جلد پریس نہیں پہنچ پاتی۔ عزیز دوست امتیاز سرمد بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہایت عرق ریزی سے پروف پڑھا۔ ناسپاسی ہوگی اگر اظہار ندیم کا ذکر نہ کروں کہ انھوں نے مجھے طباعت کے مراحل کی مشکلات سے محفوظ رکھا۔ نیشنل لائبریری کلکتہ، مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی سنٹرل لائبریری، ہگلی محسن کالج لائبریری، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی لائبریری کے اراکین کا سپاس گزار ہوں کہ مواد کی فراہمی میں ان لائبریریوں سے میں نے کافی فائدہ اٹھایا۔ آخر میں ان تمام حضرات کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی سطح پر اس کام کے دوران معاونت کی۔ حالاں کہ یکساں طور پر تمام لوگوں کے لیے شکریے کا لفظ بے معنی سا لگتا ہے کہ یہ محض احساس کا نام ہے۔

—— معید رشیدی

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔110067
20مارچ2010

○○○

حرفِ چند

بیسویں صدی کے ممتاز شعرا میں حضرت علامہ وحشتؔ اپنے ہم مرتبہ شعرائے کرام میں سے کسی سے کم نہیں تھے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو اہلِ نقد و نظر نے حضرت وحشتؔ کے ساتھ وہ انصاف نہیں کیا جو ان کا حق تھا۔ اگر چہ چند انتہائی بالغ نظر شعرائے کرام نے ان کے کلام اور فن کو مستند مانتے ہوئے اپنی اپنی رائیں دی ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر اردو تاریخ ادب میں حضرت وحشتؔ کے بارے میں ایک سناٹا سا پایا جا تا ہے۔ حتیٰ کہ رام بابو سکسینہ تک نے ہندوستان کے شعرائے کرام میں وحشتؔ کا نام تک نہیں لیا۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بنگال کے اردو اہلِ نقد و نظر نے کوئی توجہ نہیں دی، کیوں کہ بنگال میں اردو شعرا کی تو کمی نظر نہیں آتی، لیکن نثر نگار خال خال دکھائی دیتے ہیں۔

اس کمی کو ایک بہت بڑی حد تک جناب معید رشیدی نے اپنی گراں قدر کتاب 'وحشتؔ: حیات اور فن' سے پورا کر دیا ہے۔ میری نظر سے حضرت وحشتؔ پر اتنی مفصل اور معتبر کتاب ابھی تک نہیں گزری۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے توسط سے اردو دنیا حضرت وحشتؔ کو اس بلند مقام پر پہچانے گی جو ان کا حق ہے۔ یہ کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ ہندوستان کی ہر لائبریری میں رکھی جائے، تاکہ اہلِ تحقیق وحشتؔ کے بارے میں صحیح استفادہ کر سکیں۔

—— سالک لکھنوی

کلکتہ
۱۸ر فروری ۲۰۰۷ء

○○○

تقریب

وحشتؔ کلکتوی کو غالبِ ثانی یا غالبِ دوراں بھی کہا جاتا رہا ہے۔ایسے بیان میں ممکن ہے غلو کا پہلو ہو لیکن اس کا احساس تو ضرور ہوتا ہے کہ وحشتؔ اردو کے ممتاز شاعروں میں ایک ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان پر اور ان کے فن پر بڑے اہم لوگوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔سید لطیف الرحمٰن نے اپنی کتاب 'ناسخؔ سے وحشتؔ تک' میں وحشتؔ کے فن پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان کی شاعری کے بعض نکات کو تجزیاتی انداز سے پیش کیا ہے، پھر بھی ضرورت اس بات کی تھی کہ ان پر مستقل کتاب یا کتابیں لکھی جائیں جن میں ان کے احوال و آثار پر بھی روشنی ڈالی جائے۔متعلقہ عہد کے اہم پہلوؤں پر بھی، نیز ان کے اختصاص کے ساتھ ساتھ ان کے دوستوں اور شاگردوں پر توجہ کی جائے۔

سبھی لوگ جانتے ہیں کہ وحشتؔ کے زمانے میں کلکتہ ایک علمی مرکز تھا۔بے حد متحرک اور فعال شعرا اور ادبا جمع تھے۔وحشتؔ کی قربت سے سبھی فیض اٹھا رہے تھے لیکن تقسیم کے بعد وحشت مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) ہجرت کر گئے اور کئی لحاظ سے یہاں کی ادبی محفلیں تعطل کا شکار ہو گئیں۔ایسا لگا کہ ایک جمود کی کیفیت طاری ہے لیکن پھر لوگ متحرک ہوئے اور خوب ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ وحشتؔ کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی۔جمیل مظہریؔ کی وحشتؔ سے وابستگی بہر

طور قائم رہی اور جمیل مظہریؔ، پرویزؔ شاہدی، بیخودؔ کلکتوی اور کئی دوسرے شعرا فعال رہے۔اس طرح کلکتہ کی ادبی حیثیت ختم یا گم نہیں ہو پائی۔ نئے لوگوں نے بڑی محنت کی اور اب بھی کلکتہ ایک اہم ادبی مقام ہے جس پر کم توجہ کی جاتی ہے، نہ معلوم کیوں۔

کچھ دن پہلے معید رشیدی صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ 'وحشتؔ: حیات اور فن' پر وہ تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کر چکے ہیں، جو اب اشاعت کے مرحلے سے گزرنے والا ہے۔انھوں نے اپنے تحقیقی مقالے کی ایک کاپی بھی بھیج دی جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ مسودہ ۷۰ اصفحات پر مشتمل ہے۔خفی خط میں لکھا ہوا،شاید کتابی صورت میں اس سے دو گنے صفحات گھیر لے۔بہر حال میں نے مقالے کی فہرست پر ایک نظر ڈالی اور اس کے بعد اس پورے مسودہ پر ایک نگاہ ڈالی تو مجھے احساس ہوا کہ معید رشیدی نے وحشتؔ کے آثار و احوال نیز ان کی شاعری وغیرہ پر بے حد سنجیدگی سے کام کیا ہے۔چنانچہ ان کی حیات کے سلسلے میں آبا و اجداد کے احوال، ان کی تعلیم و تربیت، مطالعہ، رہائش، ملازمت، شادی، اولاد، مزاج ومیلان کے بعد ان کی شاعری کا آغاز، سلسلۂ تلمذ، مشاعروں سے ان کا شغف، بزمِ احباب سے ان کی وابستگی اور ان کی ہجرت نیز وفات تک کے تمام امور زیرِ بحث لائے ہیں۔ترقی پسندی سے بھی ان کے رشتے کی وضاحت کی ہے اور وحشت کے تلامذہ پر تحقیقی نگاہ ڈالی ہے۔پھر ان کی تصانیف، تالیفات اور ترجمے کی صورتوں کی وضاحت کی ہے۔ یہ سب امور وحشتؔ کے احوال و آثار کے ضمن میں ہیں۔اس کے بعد منطقی طور پر وحشت کے فن پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔اس سلسلے میں وحشت کے نظریۂ فن، اسلوب، روایات سے ان کا تعلق وغیرہ کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ان کی شاعری کے بعض پہلو مثلاً عشقیہ، حزنیہ، متصوفانہ انداز، سیاسی، ملّی اور قومی محتویات پر خصوصی نظر ڈالی گئی ہے اور بڑی چابکدستی سے غالبؔ کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔احیائے غزل میں وحشتؔ کا کیا رول رہا ہے، اسے بھی مرکزِ نگاہ رکھا ہے۔معید رشیدی نے وحشتؔ کے اختصاص کو نشان زد کرتے ہوئے ان کی نظم نگاری پر بھی ایک نگاہ ڈالی ہے اور غزل گوئی پر تو وہ پہلے ہی روشنی ڈال چکے ہیں۔وحشتؔ کی مکتوب نگاری بھی ان کے پیشِ نظر رہی ہے اور اخیر میں اس کا احساس دلایا گیا ہے کہ وحشتؔ

مشاہیر کی نظر میں کیا کچھ تھے۔

معید رشیدی کا یہ مقالہ جامع ہے۔ رطب و یابس سے پاک ہے اور ان کے تجزیاتی نتائج بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ مقالہ اپنے محتویات کے اعتبار سے بسیط ہے اور وحشتؔ کلکتوی کے سلسلے میں اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ میں معید رشیدی کی محنت اور ان کی تحقیقی کاوش کو اہم سمجھتا ہوں۔

— پروفیسر وہاب اشرفی

پٹنہ
جون 2008

○○○

پیش گفتار

وحشتؔ کلکتوی بلا شبہ اردو کے نو کلاسکی شعرا کی صف میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ شخصیت کمالِ فن کے لحاظ سے ان کے معاصرین عزیزؔ لکھنوی اور شادؔ عظیم آبادی کی ہم دوش سمجھی جاتی تھی۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ وحشتؔ ان چند قادر الکلام شعرا میں تھے، جنھوں نے مرزا غالبؔ کے منفرد رنگ میں غزل کہنے کی خاصی کامیاب کوششیں کی تھیں جس کا اعتراف وحشتؔ کے نام ایک خط میں مولانا الطاف حسین حالیؔ نے بھی کیا ہے:

''مولانا اگر انصاف سے دیکھیے تو مرزا کا تتبع کرنا درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا مگر آپ نے ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا ہے۔''

بہ حیثیت سخنور اور ادیب وحشتؔ کے کارناموں سے سارا ملک آشنا تھا لیکن ان کا شمار بنگال اور کلکتہ شہر کے ان عمائدین میں بھی تھا جنھوں نے اردو زبان کی سرپرستی کی اور اردو تہذیب کو زندہ رکھا۔ افسوس اس کا ہے کہ ایسے دیدہ ور اور بلند قامت شاعر کی قدر شناسی کا حق ہم نہیں ادا کر سکے۔ ان کے بارے میں صرف دو معمولی سوانحی کتابیں مختصر انتخابات کے ساتھ شائع ہو سکیں جو کسی بھی طرح ان کے شایانِ شان نہیں تھیں۔

وحشتؔ شناسی کے میدان میں جائے استاد خالی تھی۔ یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ اسے کسی

عالم اور محقق نے نہیں بلکہ وحشتؔ کے ایک طالب علم معید رشیدی نے بھرا اور اس عمل کی تکمیل میں وہ ایک طالب علم کی جگہ سے اٹھ کر اچانک ایک عالم اور اولین وحشتؔ شناس کے منصب پر فائز ہو گئے۔ میری یہ بات کوئی شاعرانہ تلازمہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ معید رشیدی نے ایک مکتوب میں مجھے لکھا کہ وہ بی-اے کے طالب علم ہیں اور جب کورس کی کتابوں میں شامل وحشتؔ کا کلام پڑھا اور لائبریری میں ان کے بارے میں تنقیدی مواد تلاش کیا تو سخت مایوسی ہوئی۔ نتیجہ میں انھوں نے وحشتؔ کی زندگی، شخصیت اور شعری کارناموں پر یہ تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر دیا۔ اس مقالہ پر جب میں نے نظر ڈالی تو دم بخود رہ گیا۔ کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ علمی اور تنقیدی مقالہ بی-اے کے ایک طالب علم کے ہاتھوں ضبط تحریر میں آیا ہے۔ اس میں تحقیق کا جو معیار ہے۔ مواد کی فراہمی کے بعد اسے مقالہ میں سمونے اور استدلال کرنے کا جو انداز ہے۔ افہام و تفہیم کا جو سلیقہ ہے۔ ابواب کی تقسیم اور مقدمات قائم کر کے انھیں علمی اور منطقی مہارت سے آگے بڑھانے اور نتائج نکالنے کی جو مہارت ہے وہ کسی پختہ کار اور منضبط ذہن کی گواہی دیتی ہے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے ان کی جو چند تحریریں اور اشعار پڑھے ہیں اور پچھلے دنوں کلکتہ کی بعض محفلوں میں ان سے جو تبادلۂ خیال ہوا وہ کم عمری کے باوجود ان کی ذہنی بالیدگی اور تربیت یافتہ ادبی ذوق کا آئینہ دار تھا اور بلاشبہ وہ ان چند ذہین طلبہ کی صف میں دکھائی دیے جو طلبِ علم میں دیوانے ہوتے ہیں۔

وحشتؔ کی زندگی، سیرت اور ادبی شخصیت کے اجزائے پریشاں کو انھوں نے پہلے باب میں جس طرح سمیٹا ہے اس کی داد تو دی جائے گی لیکن اس سے بھی دشوار طلب کام وحشتؔ کی شاعری کا تنقیدی محاکمہ تھا۔ یہاں بھی انھوں نے وحشتؔ کی عشقیہ شاعری، حزنیہ شاعری، متصوفانہ شاعری اور قومی شاعری کے ان امتیازات کا احاطہ کیا ہے جن سے معاصرین میں ان کا ایک الگ تشخص قائم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ احیائے غزل میں ان کی سعی و کاوش اور غزل گوئی میں ان کے خاص رنگ کے خال و خط بھی نمایاں کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں مقالہ کا ایک اہم باب ہے 'غالبؔ کے اثرات'۔ اس باب میں مقالہ نگار نے علمی بصیرت کے ساتھ غالبؔ اور وحشتؔ کی مشترک زمینوں اور ہم رنگ اشعار کا موازنہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ وحشتؔ کے دوسرے ممتاز معاصرین کے کلام

کے فنی اوصاف و عناصر کے آئینہ میں وحشتؔ کے منفرد لہجہ کی خوبیوں کو جتایا ہے۔

معید رشیدی نے وحشتؔ کی نظم نگاری اور دوسری اصنافِ شعر میں ان کے مخصوص رنگ و اسلوب کی قدر و قیمت بھی واضح کی ہے۔ اس نوع کا تنقیدی جائزہ جیسی علمی بصیرت، استدلال اور منضبط یکسوئی کا مطالبہ کرتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ معید رشیدی کے مقالے میں اس کے نقوش روشن نظر آتے ہیں۔

امید ہے کہ اہلِ نظر اس نوعمر عالم کے اس کارنامہ کی دل کھول کر داد دیں گے۔

— پروفیسر قمر رئیس

نئی دہلی،

25 دسمبر 2006

○○○

معروضات

کلکتہ کے ادبی مردم بے زار ماحول میں جہاں بونے اپنا قد اونچا کرنے اور 'ہوس پرست' خودستائی کے نشے میں اتنے سرشار ہیں کہ انھیں اپنے اسلاف کے کارناموں کو دیکھنے کی بھی فرصت نہیں، وہیں ایک طالب علم 'وحشت: حیات وفن' کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھ ڈالتا ہے تو انتہائی حیرت بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی۔ وہ ہونہار طالب علم معید رشیدی ہے، جس کی تحریر میں وہ پختگی اور جس کے تجزیے میں وہ منصفانہ شعور ہے، جسے دیکھ کر کوئی بھی یہ پیشین گوئی کرسکتا ہے کہ اس کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔ اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں وحشت کی زندگی اور فن کا کوئی گوشہ نہیں چھوٹا ہے۔ حالاں کہ یہ کام مغربی بنگال کے کسی سرکاری، نیم سرکاری یا ادبی ادارے کو انجام دینا چاہیے تھا، لیکن افسوس یہاں تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔ بہت منظّم طریقے سے اردو کے قدیم سرمایے کو برباد کرنے کا کام انجام دیا جارہا ہے۔

خدا کرے معید رشیدی کی یہ تصنیف اہل بنگالہ کے لیے بانگ درا ثابت ہو! اردو بولنے، پڑھنے لکھنے والے سنجیدہ لوگ اٹھیں اور بزرگوں کے ادبی کارناموں کے قدیم سرمایے کو نااہل اور متعصب لوگوں کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچائیں۔ معید رشیدی اپنی اس کتاب کی وجہ سے اردو کے ادبی منظرنامے میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

— پروفیسر یوسف تقی

کلکتہ

۹/اپریل ۲۰۱۰

○○○

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

فرسٹ ایئر آنرز کے داخلے کی لسٹ میں ایک نام عبدالمعید کا بھی آیا۔ مارکس بہت اچھے تھے۔ میرٹ لسٹ میں پہلا نام اسی کا تھا۔ حسبِ روایت اس بات کا یقین تھا کہ یہ لڑکا بھی دوسرے ہائر مارکس والوں کی طرح انگریزی یا کسی دوسرے مضمون میں داخلہ لے گا مگر حیرت ہوئی کہ اس نے اردو میں داخلہ لے لیا۔ دو چار کلاسوں ہی میں کھلنے لگا کہ یہ لڑکا کوئی عام طالب علم نہیں ہے۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوئے۔ معید رشیدی کے مضامین پکّی روشنائی میں آنے لگے۔ کچھ خدشات کے باوجود میں نے زور سے پیٹھ ٹھونک دی۔ کہا بیٹا امتحان پاس کرنے کی خاطر تو سب پڑھتے ہیں، تمھیں تو آسمان کے تارے توڑنے ہیں:

دلیلِ راہ دلِ شب چراغ ہے تنہا
چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا

معید نے اپنے طور پر وحشتؔ کی تلاش شروع کی اور ایک دن مجھے یہ بتا کر متحیر کر دیا کہ وحشتؔ صاحب پر کسی مبسوط کتاب کی عدمِ دستیابی کا مسئلہ سب کو پریشان رکھتا ہے۔ اس لیے ان پر باضابطہ کتاب لانے کا منصوبہ میں نے بنالیا ہے۔ اس نے اپنا پروجیکٹ بتایا اور میری تائید چاہی۔ میں نے اسے آگ میں کود جانے کا مشورہ دے تو دیا مگر اس بات کا خوف بھی تھا کہ اس کوشش میں ایسا نہ ہو کہ وہ امتحان بھی خراب کر بیٹھے اور کتاب بھی ادھوری رہ جائے۔ فرسٹ پارٹ کا رزلٹ آیا۔ اس نے اسّی (۸۰) فیصد مارکس حاصل کیے اور کتاب کا مسودہ بھی تیار ہو گیا۔ ماشاء اللہ!

لیجیے صاحب ہتھیلی پر سرسوں جمانا سنتے آئے تھے۔ دیکھ بھی لیا۔ ہم سب نے تحقیق کی توسی نوپسس تیار کیا۔ گائڈ کے مشورے لیے۔ مواد کی فراہمی میں دن رات لگائے تو پی-ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ معید نے وحشتؔ کی حیات اور فن کا خاکہ خود تیار کیا۔ مواد کی فراہمی خود کی۔ انضباط کے ساتھ حاصل شدہ مواد کی بنیاد پر ابواب قائم کیے۔ تقابلی مطالعے کی جرأت کی۔ تحقیق کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوا اور وحشتؔ پر وہ یادگار کتاب لکھ دی جو قیامت تک اسے وحشت شناسوں کی صف کا امام بنائے رکھے گی۔ معید رشیدی نے یہ کتاب وحشتؔ کی عقیدت اور محبت میں ڈوب کر نہیں لکھی ہے۔ اس نے ادب کے ایک ایماندار طالب علم کی طرح وحشتؔ کی باز یافت کا کام کیا ہے۔ اس لیے وہ کہیں بھی جانب دار نہیں ہے۔ اس نے اگر وحشتؔ کو بحیثیت انسان بہت اونچی حیثیت دی ہے تو اس لیے کہ وحشتؔ شرافت، وضع داری اور انسان نوازی کا پیکر تھے۔ اگر اس نے اتباعِ غالبؔ کی روشنی یا ذاتی رنگ میں وحشتؔ کے کلام کو ان کے ہم عصروں پر فوقیت دی ہے تو اس لیے نہیں کہ اس نے کوئی عینک لگا رکھی ہے۔ وہ اس لیے کہ اس کے اندر کا ایماندار ناقد اس کو اس فیصلے پر پہنچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس نے زبان بھی ایسی لکھی ہے جو شستہ اور سلیس ہے۔ اس لیے کہ اس کو کوئی ہوکا نہیں ہے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مجھے معید رشیدی کی شکل میں وہ شاگرد نصیب ہوا جو اختر الایمان کی شکل میں رشید احمد صدیقی کو اور فیض کی شکل میں پطرس بخاری کو نصیب ہوا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ معید رشیدی کو نظر بد سے بچائے، اسے حالات کی ستم ظریفیوں سے اپنی پناہ میں رکھتے ہوئے اس مقام تک پہنچائے جو کسی کسی کے ہی حصے میں آتا ہے، اور اس کی اس پہلی کتاب کو قبولیت عام اور بقائے دوام کا درجہ عطا کرے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین۔

— ڈاکٹر شاہد اختر

ہگلی محسن پوسٹ گریجویٹ کالج

مغربی بنگال، 18 اپریل 2007

○○○

حیات

بہت شورش انگیز تھے میرے ارماں
بہت حسرت افزا مری داستاں ہے

وحشتؔ

آباواجداد ـــ ولادت

خان بہادر مولانا رضا علی وحشتؔ کا سلسلۂ نسب ان کے جدا مجد ذوالفقار خاں سے ملتا ہے۔ ذوالفقار خاں، شہنشاہ اورنگزیب کے عہد میں شاہی فوج کے معروف جنرل تھے۔ وحشتؔ نے اپنے کانوں سے اپنے دادا کو کہتے سنا کہ ناصر علی خاں سرہندی نے ایک دفعہ ذوالفقار خاں کی تعریف میں قصیدہ کہا، جس کا مطلع تھا:

اے شانِ حیدری زجبین تو آشکار

نام تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار

(اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص:۷۱۶)

نواب ذوالفقار خاں نے یہ مطلع سن کر کہا کہ بس اب نہ پڑھیے، اور ناصر علی خاں سرہندی کو ایک لاکھ روپے انعام دیے۔ منظر اعظمی کے مطابق یہ رقم تیس ہزار ہے۔ (اُردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ص:۴۰۶) اقبال عظیم نے ناصر علی خاں سرہندی کو ناصریؔ لکھا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس ضمن میں راقم کی رہنمائی کی اور بتایا کہ ناصر علی خاں سرہندی بالکل درست ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہندوستان کی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ ہندوستان کی آزادی کی پہلی لڑائی تھی۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی قیادت میں ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگوں نے انگریزی سلطنت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، لیکن بدقسمتی سے بغاوت کچل دی گئی اور باغیوں پر وہ قہر ڈھایا گیا جس کی نظیر ہندوستان کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ بہادر شاہ ظفرؔ جلا وطن کر کے رنگون میں قید کر دیے گئے۔ جب بادشاہ کی یہ حالت تھی تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دوسرے امرا، درباریوں اور عام شہریوں کی کیا حالت رہی ہوگی۔ محفلیں اجڑ گئیں۔ رونقیں ختم ہو گئیں۔ گلی، کوچے اور بازار سونے ہو گئے۔ دہلی کا شیرازہ بکھر گیا۔ شرفا اپنی عزت و آبرو بچا کر

وطن سے نکل پڑے۔ وحشتؔ کے دادا حکیم غالب علی (ابن حکیم غلام علی ابن حکیم غلام رسول) بھی دہلی میں قیام پذیر تھے۔ دوسرے رؤسا کی طرح انھوں نے بھی دہلی چھوڑ دی اور ہگلی میں آ بسے۔ غالب علی اچھے طبیب تھے۔ ان کے خاندان میں طبابت کئی پشتوں سے چلی آتی تھی۔ آتے ہی طبابت شروع کر دی۔ حکیم صاحب کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ جب حکیم صاحب کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے ایک بنگالی خاتون سے شادی کر لی۔ اسی دوسری بیوی کے بطن سے ہگلی میں وحشتؔ کے والد گرامی مولوی شمشاد علی کی پیدائش ہوئی۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ضلع ہگلی بھی اردو شاعری کا ایک مرکز رہا ہے۔ دہلی کی تباہی کے بعد وہاں سے مسلمانوں کے کئی گھرانے بنگال میں آ کر بطور خاص ہگلی، کلکتہ، مرشد آباد وغیرہ میں بس گئے۔ ہگلی میں ان کی آبادی چنسورہ، پنڈوا، سری رام پور وغیرہ میں آباد ہوئی اور یہاں بھی شعر و سخن کی مجلسیں قائم ہونے لگیں۔ شعرا کے حلقے بنے۔ ہگلی کے تمام شعرا میں قاضی صادق علی خاں سب سے مشہور ہوئے۔ وحشتؔ ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''ہگلی میں قاضی محمد صادق اختر اردو کا وہ باکمال شاعر پیدا ہوا کہ آج تک فضائے بنگالہ اس کے ذکر سے گونج رہی ہے۔ اس نے اردو شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ یہ وہی بنگالی شاعر ہے جسے اس کے ہم عصر لکھنوی شعرا نے شاعر بے بدل مانا اور جسے غازی الدین حیدر، بادشاہ اودھ نے ملک الشعرا کا خطاب دے کر اپنی قدر دانی و بے تعصبی کا نمونہ سارے ہندوستان کے لیے چھوڑا۔'' (مضامین وحشتؔ، ص ص: ۱۶۲-۱۶۳)

ہگلی کے دیگر اہم شعرا میں ناسخؔ کے شاگرد عصمت اللہ خاں انسخ کا نام سرِ فہرست ہے۔

وحشتؔ کے والد ماجد مولوی حکیم شمشاد علی نے ہگلی میں عربی و فارسی پڑھی اور وہیں تھوڑی بہت انگریزی بھی سیکھ لی۔ انگریزی تعلیم سے یہ فائدہ ہوا کہ پولس کے محکمے میں انسپکٹر ہو گئے، لیکن یہ نوکری انھیں راس نہ آئی۔ بڑے رحم دل انسان تھے، اور اس محکمے میں بغیر سختی کے کام نہیں چلتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہ نوکری چھوڑ دی اور تلاشِ روزگار میں کلکتے چلے آئے۔

پوسٹ آفس میں ملازم ہو گئے۔ مختلف مقامی ڈاک خانوں میں پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے کام کیا اور کلکتے میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے مدرسہ عالیہ کے مدرس مولوی رحیم بخش کی صاحب زادی سے نکاح کیا، جو بنگالی خاتون تھیں، مگر اردو آسانی سے بول سکتی تھیں۔ ۸۴ سال کی عمر پا کر اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ انہی کے بطن سے ۱۸؍ نومبر ۱۸۸۱ء کو کڑایا روڈ، پارک سرکس، کلکتہ میں وحشتؔ کی ولادت ہوئی۔ بعض لوگوں نے وحشتؔ کی جائے پیدائش ہگلی بتائی ہے۔ اس کی تصدیق کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا، لیکن تردید کے لیے ایک بڑا ثبوت وحشتؔ کی خود نوشت سوانح عمری کی شکل میں مل جاتا ہے جو انھوں نے ماہنامہ 'کائنات' لاہور (مدیر: وفا راشدی) کے لیے لکھی تھی۔ وحشتؔ کہتے ہیں:

> ''میں ۱۸؍ نومبر ۱۸۸۱ء میں شہر کلکتہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد مولوی شمشاد علی ہگلی کے رہنے والے تھے۔ والدہ باشندہ کلکتہ تھیں۔'' (مضامین وحشت، ص: ۹)

وحشتؔ کے اس بیان سے ان کی جائے پیدائش کے اختلاف کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے اور کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ وحشتؔ کی مختصر خود نوشت سوانح عمری 'ادبی دنیا' لاہور کے وحشتؔ نمبر ۱۹۳۷ء میں شامل ہے۔ 'مضامینِ وحشتؔ' میں یہی خود نوشت سوانح عمری 'وحشتؔ بہ زبانِ خود' کے عنوان سے موجود ہے۔

تعلیم و تربیت

وحشتؔ کی اولین تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ گھر ہی پر قرآن شریف پڑھا اور مزید ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی۔ گھرانہ تعلیم یافتہ تھا۔ انھوں نے اچھا ماحول پایا جس میں ان کی شخصیت پروان چڑھی۔ ذہین اور وسیع النظر تھے۔ حصول علم کا شوق تھا۔ اردو اور فارسی کے ساتھ انگریزی پر بھی عبور تھا۔ انھوں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شعبہ انگریزی سے تعلیم پائی اور یہیں سے ۱۸۹۸ء میں انٹرنس کا امتحان بھی پاس کیا۔ انٹرنس کی سرٹیفکیٹ ان کے پاس سب سے بڑی علمی سند تھی۔ اس کے باوجود ان کی علمیت مسلم تھی۔ فارسی سے خاص شغف تھا۔ زبان پر گہری نظر تھی۔

شوقِ مطالعہ

مطالعے کا شوق انھیں جنون کی حد تک تھا۔ ہمیشہ کتابوں کے اوراق میں غرق رہتے۔ اسی مطالعے نے ان کے ذہن کو وسیع بنایا۔ مطالعے ہی کا نتیجہ تھا کہ انھیں زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہوئی۔ فن کی باریکیوں پر بھی ان کی عمیق نگاہ تھی۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ میرؔ و سوداؔ، غالبؔ و مومنؔ، سعدیؔ و حافظؔ عرفیؔ وظہوریؔ کے ساتھ گولڈ اسمتھ، بائرن، کیٹس، جانسن، مکالے، تھیکرے، شیکسپیر وغیرہ کی شعری/ افسانوی تخلیقات پر بھی عالمانہ گفتگو کرتے تھے۔ وفا راشدی نے انھیں رائل اشیاٹک سوسائٹی لندن کا رکن خاص بتایا ہے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ ہزاروں کتابوں پر مشتمل تھا۔ اپنی وفات سے کچھ روز قبل انھوں نے اپنی نادر و نایاب کتابیں ڈھاکہ یونیورسٹی کی نذر کر دی تھیں۔ ہجرت سے پہلے انھوں نے اپنی کتابوں کا بڑا حصہ کلکتہ یونیورسٹی لائبریری اور دلکشا لائبریری کو دے دیا تھا۔

اقامت

صرف آخری چند ایام کو چھوڑ کر وحشتؔ نے اپنی ساری زندگی کلکتے میں گزاری۔ جاب چارنک نے ۱۶۹۰ء میں یہ شہر بسایا تھا۔ دہلی کی مرکزیت ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۲ء تک یہ شہر ہندستان کا پایۂ تخت بنا رہا، لیکن دہلی پھر راجدھانی بنی۔ مگر اس سے کلکتے کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ دنیا کے کونے کونے سے لوگ اس شہر میں اپنی قسمت آزمانے روزی روٹی کے لیے آنے لگے۔ وحشتؔ کے والد نے بھی اسی غرض سے ہگلی سے کلکتے کا رخ کیا۔ وحشتؔ کا عنفوانِ شباب کلکتے کے مشہور علاقے جان نگر روڈ میں گزرا۔ انھوں نے ۱۹۱۱ء میں اپنے کسب خاص سے ۲/۱/۲ دلکشا اسٹریٹ کلکتہ میں دو منزلہ مکان بھی بنوایا یا خریدا تھا۔ انھیں کلکتے سے دلی لگاؤ تھا، مگر اپنی آخری عمر میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان (ڈھاکہ) چلے گئے اور آخر دم تک ۲۰/ ایل عظیم پورہ کالونی ڈھاکہ کی تیسری منزل پر اقامت پذیر رہے۔

ملازمت

انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد مالی دشواریوں نے اعلیٰ تعلیم کی حصولیابی میں رکاوٹ ڈالی۔ مجبوراً ڈاکٹر خانے میں کمپاؤنڈر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ذہین و طرّار تھے۔ ذہانت رنگ لائی۔ جلد ہی (۱۹۰۱ء) گورنمنٹ آف انڈیا امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ میں تقرری ہو گئی، جہاں عرصے تک انھوں نے اس دفتر کے شعبۂ فارسی میں چیف مولوی کا کام انجام دیا۔ ۱۹۲۶ء میں جب اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج، کلکتہ) قائم ہوا تو اردو کے پروفیسر کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔ دس سال تک بحیثیت صدر شعبۂ اردو و فارسی اپنے فرائض نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیے۔ وہاں انھوں نے سالانہ مشاعرے کی بنیاد بھی ڈالی، جس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں وظیفہ حاصل کر کے خانہ نشین ہوئے۔ انھی کی وجہ سے کالج میں ایسا علمی و ادبی ماحول قائم ہوا کہ استاد اور طالب علم سب اس سے متاثر ہوئے اور لوگوں میں ذوق و شوق بڑھتا گیا۔ وظیفے کی حصولیابی کے بعد، خانہ نشین ہونے کے باوجود، شاید انھیں زندگی بیٹھ کر گزارنا نصیب نہ تھا۔ اسی قت لیڈی برابورن کالج کا قیام عمل میں آیا۔ جب اردو فارسی کے لیے کوئی خاتون پروفیسر نہ مل سکیں تو نظر انتخاب وحشتؔ پر پڑی۔ کئی سال تک اس کالج سے وابستہ رہے۔ اسی دوران ان کی طبیعت علیل رہنے لگی اور وہ پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ وحشتؔ یونیورسٹی کی کوئی سند نہ رکھتے تھے، مگر بذات خود مطالعۂ کتب سے اپنے اندر غیر معمولی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صرف انٹرنس پاس ہونے کے باوجود وہ ایک زمانے تک فارسی و اردو میں ایم-اے اور پی-ایچ-ڈی کے طلبہ کے استاد، نگراں اور ممتحن رہے۔

شادی — اولاد

وحشتؔ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی ۹/ دسمبر ۱۹۰۶ء میں لارڈ کرزن کے پرسنل سرجن ڈاکٹر ظہیر الدین کی نواسی اور مولوی محمد عباس علی ڈپٹی مجسٹریٹ متوطن کھلنا (بنگالہ) کی دختر نیک اختر زبیدہ خاتون سے ہوئی۔ ۲۴/ ستمبر ۱۹۳۱ء میں پہلی اہلیہ زبیدہ خاتون کی وفات ہوئی۔

وحشتؔ نے قطعۂ تاریخِ وفات لکھا:

جب مجھے تاریخ کا خیال آیا — لکھ دیا وحشتؔ درِ شہوارِ خلد
۱۳۵۰ھ

احباب کے اصرار پر انھوں نے ۱۹۴۱ء میں عقدِ ثانی کیا۔ دوسری اہلیہ ان کی رشتے دار تھیں اور بیوہ ہو چکی تھیں۔ وفا راشدی نے انھیں صاحبِ اولاد بھی بتایا ہے۔ وحشتؔ بالکل اپنے بچّوں کی طرح ان کے بچّوں کی بھی پرورش کرتے رہے۔ وفا راشدی کے مطابق پہلی بیوی سے وحشتؔ کے چودہ بچّے ہوئے جن میں چار بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کے نام معلوم ہو سکے۔ ان چار بیٹوں کے نام جو معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں —— علی حیدر، علی حسن، علی امام، علی اشرف جبکہ پانچ بیٹیوں کے نام یہ ہیں —— سلطانہ، رضیہ، شکیلہ، عائشہ، جمیلہ۔ ان کی دوسری بیوی سے کوئی بچہ نہیں ہوا۔

وحشتؔ کا سب سے بڑا لڑکا نہایت ذہین تھا۔ آٹھویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا کہ مرض جنون میں مبتلا ہو گیا، جس کی وجہ سے وحشتؔ ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ بیٹے کی بیماری انھیں اندر ہی اندر کھائے جاتی تھی۔ انھوں نے علاج و معالجے میں کسی طرح کی کمی نہ کی۔ دوا کے ساتھ دعا بھی کراتے رہے۔ مگر آرام وقتی ہی ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک زمانے تک مفقود الخبر رہا۔ شاید ۱۹۴۹ء کے ہندو مسلم فساد میں ہلاک ہو گیا۔

مزاج

وحشتؔ کی طبیعت کم گوئی، کم آمیزی، متانت اور بردباری کا پیکر تھی۔ وہ سنجیدہ بھی تھے اور شگفتہ مزاج بھی۔ نئے ملنے والے ان کی شگفتہ مزاجی سے ناآشنا رہتے، مگر بے تکلف احباب کی مجلسوں میں وہ اپنے لطائف سے دوسروں کو خوب ہنساتے اور خود بھی ان کی ہنسی میں شریک ہو کر اپنی بے تکلّفی کا ثبوت دیتے۔ اپنی کم آمیزی کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:

ہر شخص سے مانوس جو ہوتا نہیں وحشتؔ
یہ ہے کہ کم آمیز ہے مغرور نہیں ہے

وحشتؔ حد درجہ خوددار و غیور انسان تھے۔ حکومت وقت نے ان کی ادبی خدمات کے صلے

میں لٹریری پنشن مقرر کی، لیکن ان کو اپنی ادبی خدمات کی قیمت لینی منظور نہ ہوئی۔ کئی دفعہ ان کے دوستوں اور تلامذہ (جن میں جسٹس مودودالرحمٰن، امیر الاسلام شرقی اور ظفر ہاشمی قابل ذکر ہیں) نے ان کے دیوان کی طباعت کی پیش کش کی، لیکن انھوں نے کسی کا احسان لینا گوارہ نہ کیا۔ ان کی خودداری کی مثال یہ بھی ہے کہ اگر وہ کہیں جاتے تو سواری کا کرایہ خود ادا کرتے، کسی کو تکلیف نہ دیتے۔ بڑے منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ سب سے ہنس کر ملتے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، سب کی عزت کرتے۔ ان سے کسی کی بھی تکلیف برداشت نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کا بڑا لڑکا علی حیدر مرضِ جنون میں مبتلا ہوا تو ان کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ تین بار اسے لے کر رانچی اسپتال گئے۔ اسے بہار کے کسی خانقاہ میں بھی لے گئے اور وہاں ایک ماہ قیام بھی کیا۔ جب جنون شدّت اختیار کرتا تو وہ سارے گھر کو سر پر اٹھا لیتا، کتابیں پھاڑتا، سامان پھینکتا، لوگوں پر حملہ آور ہوتا۔ وحشتؔ نے پریشان ہو کر اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی اور جب انھوں نے کہا کہ تمھاری یہی سزا ہے تو وہ ان ہی کا شعر مخصوص طرز میں پڑھنے لگا:

ہمارے پاؤں میں تم نے تو زنجیرِ وفا ڈالی
تمھارے ہاتھ سے کیوں رشتۂ مہر و کرم چھوٹا

شعر نے وحشتؔ پر اتنا اثر کیا کہ وہ دہاڑیں مار کر رونے لگے۔ ان کو روتے دیکھ کر گھر کے سارے افراد بھی رونے لگے۔ آس پاس کی خواتین دوڑی آئیں۔ آخر دیوانے کی زنجیر کھول دی گئی۔

اخلاق و عادات

وحشتؔ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ وہ ایسی شمع تھے جس کی روشنی سے آج بھی بنگال کا اردو ادب منور ہے۔ وہ بڑے انسان بھی تھے اور بڑے شاعر بھی۔ اخلاق، ان کی شخصیت کا ناگزیر پہلو ہے۔ اُن واقعات کے مطالعے کے بغیر ہم ان کی شخصیت پر کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتے، جن کا تعلق ان کی سیرت سے ہے۔ اس سلسلے میں اوّل بات یہ ہے کہ ان کا شخصی کردار متنازعہ فیہ نہیں ہے۔ ان کے اکثر محققین اور ناقدین نے انھیں فرشتہ صفت بتایا ہے۔ لطیف الرحمٰن نے تو انھیں

انسانِ کامل تک کہہ دیا ہے، لیکن ہمیں ان محققین سے نہ مکمل اتفاق ہے اور نہ ہی مکمل اختلاف۔ اس لیے کہ انسان کے اندر خیر اور شر، دونوں طرح کے جذبات کا پایا جانا عین فطری ہے اور وحشتؔ بھی انسان ہی تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہاں خیر کا پہلو غالب ہے، مگر جہاں ایک طرف لوگ ان کے اوصاف بیان کرتے نہیں تھکتے وہیں، ان پر تنقیدیں بھی کی جاتی ہیں۔ مثلاً وہ انگریزوں کے خوشامدی تھے، اور یہی وجہ ہے کہ انھیں خان بہادر کا خطاب ملا تھا، لیکن ان کے انگریزوں کے خوشامدی ہونے کی دلیل کہیں نہیں ملتی۔ نہ ان کی تحریروں سے اس کا انکشاف ہوتا ہے، نہ ان کے مکاتیب سے، اور نہ ہی ان کی شاعری سے۔ انگریزوں سے گہرے مراسم کے باوجود انھوں نے انگریزوں کی شان میں قصیدے نہیں لکھے، لیکن یہ تنقید، بجا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں عملی طور پر کوئی حصہ نہیں لیا۔ حالاں کہ ان کے معاصر شعرا میں بہتوں نے براہِ راست جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ انھیں جیل کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ یہاں حسرتؔ موہانی، محمد علی جوہرؔ، ابوالکلام آزادؔ وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے بھی کچھ وقت تک عملی سیاست سے براہِ راست دلچسپی لی، لیکن وحشتؔ نے عملاً کچھ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں کہیں کہیں جمود اور سکوت کا احساس ہوتا ہے۔ جب ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تو ملک بھر کے ادبا و شعرا اس میں شریک ہوئے، مگر وحشتؔ نے اس سے دور ہی رہنا قرینِ مصلحت جانا اور آخر تک دور ہی رہے۔ اِسی طرح ان کی سیرت کے اور بھی پہلو ہوں گے جن سے اختلاف ممکن ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو قابل گرفت ہیں اور ذرا تلخ بھی ہیں مگر ہم انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ وحشتؔ کی سیرت کا واضح نقشہ کھینچنے کے لیے ہر پہلو کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ مطالعہ وہی صحیح ہے جو غیر جذباتی اور غیر جانبدار ہو۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ وحشتؔ کی شخصیت کا ایسا پہلو تھا جس کے مطالعے سے ہمارے ذہن میں وحشتؔ کی ایک الگ تصویر سامنے آتی ہے، مگر ابھی وحشتؔ کی سیرت کا وہ بیان باقی ہے جو انھیں ہر دلعزیز بناتا ہے۔ اُن واقعات کی طرف بڑھنے سے قبل بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا قلمی خاکہ یہاں پیش کر دیا جائے، تاکہ ان کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ پروفیسر

اقبال عظیم ان کا قلمی خاکہ پیش کرتے ہیں:

> ''کشیدہ قامت بھاری بھرکم، بایں عمر ماشاء اللہ بھرا پرا چہرہ، عارض زنخداں صاف پورے لب پر کتری ہوئی مونچھیں۔ آنکھوں پر تکلفات سے خالی چشمہ، سر پر عنابی رنگ کی مخملی ہوم کیپ، جو مولانا کے گزرے ہوئے بانکپن کی صاف چغلی کھاتی ہے، بدن پر صوفیانہ رنگ کی ستھری شیروانی، جس کی بائیں جیب سے بٹن کے کاج تک پھیلی ہوئی گھڑی کی روپہلی زنجیر دور سے چمکتی ہے، ٹخنوں سے اوپر تک کم و بیش علی گڑھ کٹ پائجامہ اور گہرے رنگ کے موزے پہنے ہوئے جس وقت مولانا کسی مشاعرہ کی مسندِ صدارت پر رونق افروز ہوتے ہیں تو ساری محفل میں ان کی شخصیت، سب سے الگ ایک خاص توجہ کی طالب ہوتی ہے، ان کی محبت بھری نگاہیں ہر نئے آنے والے سے گویا یوں مخاطب ہوتی ہیں کہ 'بھئی میں کیا کروں' سب نے مل کر زبردستی یہاں بیٹھا دیا ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔''
> (اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص: ۱۷۵)

وحشتؔ ہر شخص سے محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ صبح ہو یا شام، دوپہر ہو یا رات، ان کے دروازے پر اگر کوئی چلا آتا تو خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے۔ فوراً گھر میں پردہ کرواتے۔ مہمان کو اندر لے جا کر صوفے پر بٹھاتے اور خود چھوٹی سی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ ابھی گفتگو جاری ہی رہتی کہ چائے اور بسکٹ حاضر۔ (ایضاً) جہاں تک ممکن ہوتا وہ مہمان نوازی میں کمی نہ کرتے۔ چھوٹی سی ادبی نشست ہو یا کوئی بڑا مشاعرہ، ممکن ہوتا تو دعوت پر ضرور شرکت کرتے اور وقت مقرّرہ پر پہنچ جاتے۔ چھوٹے بڑے ہر قسم کے ادبی رسالے کے لیے اگر کوئی ان کی سرپرستی چاہتا تو صرف اس لیے قبول کر لیتے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ خط و کتابت کا بھی یہی حال تھا۔ اِدھر خط آیا اُدھر جواب تیار۔ اگر کوئی شاگرد خط کے ساتھ جوابی لفاف یا ٹکٹ بھیج دیتا تو سختی سے منع کرتے۔ سید لطیف الرحمٰن نے وحشتؔ کے اخلاق و اطوار کا بڑا عمدہ نقشہ کھینچا ہے:

> ''وحشتؔ صاحب کا اخلاق و خلوص کسی خاص طبقہ تک محدود نہ تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے تھے اور ان کے اخلاق میں خلوص بھی ہوتا تھا۔

وحشت صاحب سے مل کر کسی کو یہ شکایت نہیں ہوئی کہ وحشت صاحب مجھ سے ٹھیک سے نہیں ملے۔ خاکساری، سنجیدگی، خوش خلقی، خوش مزاجی، راست گوئی، ایفائے وعدہ، سیر چشمی، ایثار، فیاضی، غم خواری، صبر و توکل، لحاظ و مروت، احباب پرستی، شاگردوں کو اپنی اولاد سمجھنا، ان کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ جاننا، پابندیِ وقت، وضعداری وغیرہ وحشت صاحب کے وہ نمایاں اوصاف تھے جن کی وجہ سے وہ بڑی عزت اور محبت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔''

(سید لطیف الرحمٰن، نساخ سے وحشت تک — ص:۱۴۹)

اظہر قادری نے 'نقوش' لاہور کے 'شخصیات نمبر' میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جو اس امر کا غماز ہے کہ وحشت کبھی احساسِ برتری کا شکار نہ ہوئے۔ واقعہ یوں ہے کہ ان کے ایک ہم جماعت تھے جو زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے۔ پڑھائی چھوڑ کر چھوٹا سا چائے خانہ کھول رکھا تھا۔ وہ چائے خانہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ جہاں کوئی شریف اور معقول قسم کا آدمی جا کر بیٹھتا، لیکن وحشت جب کبھی اس راہ سے گزرتے تو ضرور اس چائے خانے میں تھوڑی دیر بیٹھتے اور ایک پیالی چائے بھی ضرور پیتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کہیں ان کے ہم جماعت کے دل میں یہ گمان نہ گزرے کہ وحشت اب بڑے آدمی ہو گئے اور مجھ سے ملنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

وحشت کو السٹریٹڈ ویکلی کے معمے حل کرنے کا پرانا شوق تھا۔ فخر الدین آثر صدیقی نے اپنے مضمون 'سید رضا علی وحشت' میں لکھا ہے کہ ''نہ تو وہ پان کھاتے تھے نہ سگریٹ بیڑی کا شوق تھا۔ اگر کوئی نشہ تھا تو کراس ورڈ کے معمے کا تھا۔ یہ شوق کیا تھا ایک نشہ تھا۔ خود اپنے نام سے بھیجتے۔ کبھی کبھی دوسروں کے نام سے بھی بھیجتے تھے۔ ایک بار میرے بھائی صاحب کے نام سے بھیجا اور پانچ ہزار کی رقم اول انعام میں ملی، ساتھ ہی ایک گھڑی بھی آئی۔ رقم تو خود لی، ہاتھ گھڑی بھائی صاحب کو مرحمت فرمائی۔'' (سوغات، ص:۲۶۸) معمہ حل کرنے کے لیے پابندی کے ساتھ رسالہ خریدا کرتے تھے۔ ایک روز شبیر کاظمی کے یہاں جنھوں نے بزم احباب کے جلسے میں اس واقعے کو بیان کیا، بیٹھے ہوئے تھے کہ ہاکر آ کر رسالہ دے گیا۔ وحشت نے شبیر صاحب سے پوچھا کہ آپ بھی معمے حل کرتے ہیں۔ شبیر صاحب نے کہا — 'نہیں'۔ میں اپنی بچّی کے اصرار پر لیتا ہوں۔

اسے تصویروں کا بہت شوق ہے۔ وہ تصویریں کاٹ کر رکھ لیتی ہے۔ وحشت نے کہا کہ اب سے آپ نہ خریدا کریں۔ میں ہر ہفتے آپ کو دے دیا کروں گا۔ اس کے بعد وحشت دو سال تک کلکتے میں رہے اور پابندی کے ساتھ، ہر سنیچر کو وہ رسالہ دے آیا کرتے تھے۔ جون ۱۹۵۰ء میں جب ہجرت کر کے ڈھاکہ جانے لگے تو روانگی سے ٹھیک ایک دن قبل سنیچر کا دن تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح شبیر صاحب کے گھر رسالہ دے آئے۔ حالاں کہ وطن کے چھوٹنے کا غم انھیں کھائے جا رہا تھا اور وہ سفر کے خیال سے سخت پریشان تھے۔

سید محمود طرزی نے اپنے مضمون 'حضرت علامہ خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی' جو 'مہر نیم روز' کراچی کے 'وحشت نمبر' میں شامل ہے، میں ایک واقعے کا ذکر کیا ہے جو وحشت کی بے نیازی اور سخاوت پر دال ہے۔ اسی واقعے کو سید لطیف الرحمٰن نے بھی 'نساخ سے وحشت تک' (ص:۱۵) میں نقل کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے، غالباً ۱۹۳۷ء میں سیماب اکبر آبادی کلکتے آئے ہوئے تھے۔ سیماب کے اعزاز میں مسلم انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ میں عظیم الشان طرحی مشاعرہ ہوا۔ وحشت کی صدارت تھی۔ محمود طرزی جب مشاعرے میں پہنچے تو کپتان عبد الصمد قمر صدیقی نے دریافت کیا کہ مشاعرے کے لیے کچھ کہا ہے۔ ان کے انکار پر قمر صاحب ذرا پریشان ہوئے۔ انھوں نے قمر صاحب سے کہا کہ اس طرح میں کوئی غزل وحشت کے دیوان میں ہو تو گھر سے نقل کر کے منگا دیجیے۔ قمر صاحب نے تعجب سے پوچھا کہ اس سے کیا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ آپ غزل منگا دیجیے اور باقی سب مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ انھوں نے فوراً رضا کاظمی کو بھیج کر اپنے مکان سے غزل نقل کر کے منگائی اور ان کے حوالے کر دی۔ وقفے کے دوران انھوں نے سہ منزلہ پر انسٹی ٹیوٹ کے آفس میں جا کر غزل ایک دوسرے کاغذ پر لکھی اور مقطعے میں وحشت کی جگہ طرزی بٹھا کر مشاعرے میں شریک ہو گئے۔ قمر صدیقی سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کریں گے۔ لہٰذا مشاعرے میں انھوں نے سب سے آخر میں ان کا نام پکارا۔ اب صرف وحشت پڑھنے کو باقی رہ گئے تھے۔ طرزی صاحب نے کھڑے ہو کر مطلع پڑھا۔ ان کا پڑھنے کا انداز، گرجدار آواز اور جوانی کی جوانی اگر نہ بھی ہوتی، تب بھی غزل ہر اعتبار سے کامیاب رہتی۔ مطلع سننے کے بعد سامعین نے دل کھول کر داد دی، لیکن انھیں بے حد تعجب ہوا کہ وحشت داد دینے میں سب سے آگے ہیں اور وہ سوچنے

لگے کہ استاد اپنے کلام کی خود ہی تعریف کر رہے ہیں۔ ایسا تو انھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ سامعین نے اصرار کر کے اس مطلعے کو بار بار پڑھوایا اور جب انھوں نے مطلع ثانی پڑھا تو تمام مشاعرہ تحسین و آفرین کے شور میں ڈوبا ہوا تھا لیکن مولانا وحشتؔ خاموش تھے۔ طرزیؔ صاحب نے اندازہ کر لیا کہ اب مولانا کو یاد آیا کہ وہ انھی کا مال چوری کر کے انھی کے سامنے پڑھ رہے ہیں، مگر مولانا کی داد و دہش اور سخاوت کا اظہار بھی تو دیکھیے۔ جب انھوں نے مقطع پڑھا تو وحشتؔ کی جگہ طرزیؔ خود انھوں نے ہی با آواز بلند پڑھ دیا۔ تین چار روز کے بعد اخبارات میں پوری غزل طرزیؔ صاحب کے نام سے شائع ہو گئی اور پھر احباب تو ان کی اس ڈھٹائی پر اکثر اظہارِ خیال کرتے رہے اور قہقہے لگاتے رہے، لیکن مولانا نے کبھی بھولے سے بھی اشارہ نہیں کیا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ ۱۹۵۰ء میں جب مولانا اپنا دیوان اشاعت کے لیے مرتب کر چکے تو طرزیؔ صاحب نے دبی زبان سے دریافت کیا کہ حضور آپ نے اُس غزل کا کیا کیا؟ آج آنسو نکلتے ہیں۔ وحشتؔ جی کھول کر ہنسے۔ طرزیؔ صاحب کی زندگی میں وحشتؔ کی ایسی ہنسی آخری تھی۔ فرمایا کہ وہ غزل تو میں نے تم کو اسی روز دیدی اور وہ میرے اس دیوان میں نہیں ہے۔

سالکؔ لکھنوی نے وحشتؔ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کے اخلاق و اطوار کا جائزہ لیا ہے۔ تقریباً ہر اتوار کو وحشتؔ کے مکان پر دوستوں، ہم مرتبہ شاعروں، شاگردوں اور اہلِ ذوق کی نشست ہوا کرتی تھی۔ سالکؔ صاحب اس نشست میں بزرگوں کی صحبت سے فیض پانے اور ان کی عالمانہ گفتگو سننے کے لیے شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے محمود طرزیؔ کی گل فشانیاں بھی وہیں دیکھیں۔ انھیں ناطقؔ لکھنوی سے ملنے کا اتفاق بھی وہیں ہوا۔ ابراہیم ہوشؔ اور شمسؔ عظیم آبادی کی صحبت میں رہنے کا موقع بھی انھیں وہیں نصیب ہوا۔ جب حکومت نے وحشتؔ کو 'خان بہادر' کے خطاب سے نوازا تو ہر طرف سے مبارک بادیاں آنے لگیں۔ سالکؔ صاحب بھی مبارک باد دینے ان کے گھر پہنچے۔ سالکؔ صاحب خود لکھتے ہیں:

> ''خان بہادر کا خطاب ملا تو سیکڑوں مبارک بادیاں ان کی خدمت میں پہنچ گئیں۔
> میں نے بھی حاضری دی۔ اطلاع ہوئی۔ ذرا دیر بعد شرف باریابی حاصل ہوا۔

> میں نے ڈرتے ڈرتے قدم رکھا کیوں کہ 'خان بہادروں' سے واقف تھا۔ لیکن مجھ سے کسی خان بہادر نے نہیں، وحشتؔ نے ہاتھ ملایا۔ وہی تبسم۔ وہی شفقت، وہی اندازِ محرمانہ!''
> (بحوالہ خصوصی شمارہ 'آبشار'، کلکتہ ۱۹۹۵ء)

شاگردِ وحشتؔ عباس علی خاں بیخودؔ نے وحشتؔ کے بارے میں صائب رائے قائم کی ہے:

خوبیاں جتنی ہیں بیخودؔ آدمیت کے لیے
سب کی سب گویا بنی ہیں ایک وحشتؔ کے لیے

وحشتؔ کا اخلاق حد درجہ بلند تھا۔ نیکی اور خیر خواہی ان کے خمیر میں پڑی ہوئی تھی۔ ان میں انتہائی درجے کی خاکساری، خوش مزاجی اور راست گوئی تھی۔ احباب پر جان چھڑکنا اور شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح چاہنا، ان کی عادت تھی، پریشانیوں میں بھی اپنی مخصوص وضعداری کے پابند رہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اصول کے پکے تھے۔ شاعری کے علاوہ ان کے محاسن اخلاق میں بھی لوگوں کے لیے بڑی کشش تھی۔ انھوں نے کبھی ذات پات اور مرتبے کی تفریق نہ کی۔ ان کی انکساری اور خوش خلقی کا یہ عالم تھا کہ پہلے پہل ملنے والوں کو تکلّف و تصنّع کا دھوکا ہوتا، مگر جن لوگوں کو ان سے بار بار ملنے کے مواقع میسر آئے وہ جانتے تھے کہ موصوف مشرقی تہذیب و اخلاق کا نمونہ تھے۔ ڈاکٹر عندلیبؔ شادانی نے ان کے اسی وصف کا اقرار کیا ہے:

> ''میں نے انھیں مشرقی تہذیب و اخلاق کا نمونہ پایا۔''
> (تاثرات، مشمولہ مہر نیم روز، کراچی ۱۹۵۷ء۔ وحشتؔ نمبر)

وحشتؔ کی تمام عمر سادہ اور بے تکلف گزری۔ ان کا جو ظاہر تھا، وہی باطن تھا۔ منصف مزاج، قول کے صادق اور وقت کے نہایت پابند تھے۔ بقول عندلیبؔ شادانی:

> ''اردو ڈپارٹمنٹ کی بعض کمیٹیوں کے وہ ممبر تھے۔ کسی میٹنگ میں وہ کبھی ایک لمحے کی تاخیر سے بھی نہیں پہنچے۔ وقت کی پابندی ان کے لیے فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ اگرچہ اس کی بدولت انھیں ہمیشہ انتظار کی زحمت اٹھانی پڑتی تھی لیکن وہ آخری وقت تک اپنی اس وضع پر قائم رہے۔''

(تاثرات، مشمولہ مہر نیم روز، کراچی ۱۹۵۷ء۔ وحشت نمبر)

وہ خلوص کا جیتا جاگتا مجسمہ تھے۔ عزیزوں کے علاوہ اجنبی اور غیر بھی ہمیشہ ان کی مروّت اور دردمندی سے فیض یاب ہوتے۔ وہ خود پریشانیوں میں گھرے رہتے۔ اس کے باوجود عزیزوں اور شاگردوں کی ہر ممکن مدد کرتے۔ غریب طلبہ کی تعلیم اور نادار لڑکیوں کی شادی کا انتظام بھی اپنے ذاتی خرچ سے کرتے۔ دوستوں سے ملاقات اور بیماروں کی عیادت میں دیر نہ کرتے۔ نوکروں سے بھی شفقت اور ہمدردی سے پیش آتے۔

وحشت جب اسلامیہ کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے تو ان کے ایک رفیقِ کار ان کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے ان سے جلتے تھے اور کھلم کھلاّ لوگوں کے سامنے ان کی برائی کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے بیخود صاحب سے کہا کہ میاں بیخود! تمھیں کوئی اور شاعر نہیں ملا کہ وحشت سے اصلاح لیتے ہو۔ بیخود صاحب نے جواب دیا کہ ہوسکتا ہے کہ وحشت سے اچھا شاعر اور استاد ہو، لیکن مجھے جس شے نے ان کی طرف کھینچا ہے وہ ان کا اخلاق ہے۔ وہ فرمانے لگے کہ میاں! ان سے تمھیں اخلاق سیکھنا ہے یا شاعری۔ جب بھی وحشت کے سامنے ان صاحب کا ذکر ہوتا تو وحشت خاموش رہتے۔ ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہتے اور جہاں تک بن پڑتا ان کی تعریف ہی کرتے۔ (بحوالہ: مضمون بیخود، مشمولہ: ماہنامہ جدید اردو، کلکتہ)

ابراہیم ہوش کا ذاتی تجربہ ملاحظہ فرمائیے جو وحشت کے اخلاقی پہلو پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ کلکتے کے خضر پور علاقے میں ایک نواب ڈلن رہا کرتے تھے جو والیِ رام پور کے چھوٹے بھائی تھے۔ نواب صاحب اپنے دولت کدے پر عظیم الشان کل ہند مشاعرہ کروا رہے تھے۔ پورے ہندوستان سے شعرا بلائے گئے۔ کلکتے سے وحشت کلکتوی، آرزو لکھنوی، ناطق لکھنوی، عباس علی خاں بیخود، آصف بنارسی، واصف بنارسی، پرویز شاہدی، قمر صدیقی، شمس عظیم آبادی، ابراہیم ہوش، احسن احمد اشک، سالک لکھنوی، جرم محمد آبادی، جوان سندیلوی، ناوک لکھنوی وغیرہ شامل تھے۔ ابراہیم ہوش نوجوان شاعروں میں تھے۔ انھوں نے اس مشاعرے کے لیے غزل تو کہہ لی، مگر اصلاح سے محروم رہی۔ ابراہیم ہوش نے سوچا کہ اس کی اصلاح کسی بڑے شاعر سے کروا لیں گے اور یہ بڑا

شاعر ان کی نظر میں وحشت کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے ویلسلی سکنڈ لین میں وحشت کے در دولت پر حاضری دی۔ وہاں پتا چلا کہ وحشت گھر پر موجود نہیں ہیں اور کہیں گئے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر بہت پریشان ہوئے، کیوں کہ وقت بہت کم تھا اور غزل کی اصلاح بھی اسی دن ہونی تھی۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ وحشت کے علاوہ وہ اور کس سے رجوع کریں اور کس کے دروازے پر دستک دیں۔ بہت غور و فکر کے بعد انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان کی اس غزل کی اصلاح صرف وحشت ہی کو کرنی چاہیے۔ کسی اور کو نہیں، لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ انھیں کہاں تلاش کیا جائے، کیوں کہ یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کس طرف گئے ہیں اور کس کے پاس گئے ہیں۔ آخر دل کڑا کر کے کچھ دیر کے بعد انھوں نے پھر ویلسلی سکنڈ لین کا رخ کیا اور وحشت کے مکان پر دوبارہ دستک دینے کے بعد دریافت کیا کہ کم از کم یہ بتا دیا جائے کہ حضرت وحشت کس علاقے میں گئے ہیں اور کس کے پاس گئے ہیں۔ گھر کے اندر سے جواب ملا کہ یہ تو نہیں معلوم کہ موصوف کس کے پاس گئے ہیں، البتہ یہ بتا گئے ہیں کہ وہ پارک سرکس جا رہے ہیں اور شام تک واپس آئیں گے۔

دن کے چار بج رہے تھے اور شام ہونے ہی والی تھی۔ اس لیے وہ وحشت کو ڈھونڈھنے کے لیے پیدل ہی پارک سرکس کی طرف چل پڑے۔ جب وہ پارک سرکس ٹرام ڈپو کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وحشت ٹرام کے انتظار میں ڈپو کے نزدیک ہی ٹرام اسٹاپ پر کھڑے ہیں۔ انھیں دیکھ کر خوشی کا ٹھکانا نہ رہا، یعنی ساری مایوسی، بد دلی اور پریشانی کافور ہو گئی۔ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے وہ ان کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور انھیں بڑی عقیدت سے آداب کیا۔ انھیں دیکھ کر وحشت مسکرائے۔ یہ ان کی دیرینہ عادت تھی کہ چھوٹا ہو یا بڑا، سب سے مسکرا کر ملتے۔ ابراہیم ہوش کے سلام کا جواب دینے کے بعد وحشت نے فرمایا...... ''کہیے کیا بات ہے اور آپ کدھر جا رہے ہیں۔'' بقول ہوش ''یہ وحشت کے اخلاق اور تہذیب کا ادنیٰ نمونہ تھا کہ وہ چھوٹوں کو بھی ہمیشہ آپ ہی کہہ کر مخاطب کرتے۔ ہوش نے عرض کیا'' حضور، آپ ہی کو ڈھونڈھنے نکلا تھا۔ میں آپ کے دولت خانے سے آ رہا ہوں۔ وہاں پتا چلا کہ حضور پارک سرکس کی طرف گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ پارک سرکس چلا چلوں اگر آپ کہیں مل گئے تو فبہا ورنہ شام کو پھر آپ کے

دولت کدہ پر حاضری دوں گا''۔ ہنستے ہوئے وحشتؔ نے کہا......''خیر تو ہے، ایسی کیا ضرورت لاحق ہوگئی کہ آپ اتنی زحمت برداشت کر رہے ہیں۔'' ہوشؔ نے جواباً کہا......''حضور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کل نواب ڈلن کے یہاں مشاعرہ ہے۔ میں نے غزل کہہ لی ہے، مگر ابھی تک وہ اصلاح سے محروم ہے۔'' وحشتؔ کی عالی ظرفی / بلند کرداری کا اسی سے اندازہ کیجیے کہ انھوں نے ان کی بات سنتے ہی فرمایا کہ ''ٹھیک ہے میں آپ کی غزل دیکھ لوں گا۔ آئیے اسی پارک میں چل کر کہیں بیٹھیں۔''

وحشتؔ کی عظمت اور اعلیٰ تفکر کا ابراہیم ہوشؔ ہی نہیں، بلکہ سارا ملک قائل تھا، لیکن ان کے حسن اخلاق اور خلوص کا یہ رنگ دیکھ کر ہوشؔ کی روح بھی فرطِ عقیدت سے دوزانو ہوگئی اور وفورِ مسرّت سے ان کی آنکھ میں آنسو بھر آئے۔ ہوشؔ کہتے ہیں کہ وحشتؔ جیسا باکمال شاعر جسے لوگ امام الشعرا طوطیِ بنگالہ اور بلبل ہزار داستان کے نام سے یاد کرتے ہیں ایک معمولی اور مبتدی شاعر کے کلام پر اصلاح دینے کے لیے نہ صرف عرضِ مدعا سنتے ہی آمادہ ہوگیا بلکہ ایک معمولی انسان کی طرح پارک کے اندر کہیں چل کر بیٹھنے اور کلام پر اصلاح دینے کے لیے بھی کسی تکلّف کو راہ دیے بغیر اسی وقت تیار ہوگیا۔ اس سے بڑھ کر ان کی اعلیٰ ظرفی، بلند اخلاقی، انسانیت نوازی اور روا داری کا کیا نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

(وحشتؔ اپنے کردار کے آئینے میں، از: ابراہیم ہوش، مشمولہ: سوغات، ۱۹۸۱ء، ص: ۲۵۵)

ابراہیم ہوشؔ اور وحشتؔ جب پارک کے اندر داخل ہوئے تو انھیں وہاں کوئی بینچ خالی نہیں ملی۔ یہ دیکھ کر وحشتؔ نے کہا ''میاں بیٹھنے کے لیے بینچ کی کیا ضرورت ہے، آئیے پارک کے کسی گوشۂ عافیت میں ہری بھری دوب پر بیٹھا جائے وہاں کوئی مخل نہیں ہوگا اور میں اطمینان اور سکون سے آپ کی غزل دیکھ سکوں گا۔'' چنانچہ وہ لوگ پارک کے ایک گوشے میں ہری بھری اور چاندنی کی طرح بچھی ہوئی گھاس پر بیٹھ گئے اور وحشتؔ نے دس منٹ کے اندر غزل دیکھ لی۔ ایک دو مصرعوں میں ترمیم کرکے اسے اچھی خاصی معیاری غزل میں تبدیل کر دیا۔ (ایضاً)

نواب ڈلن کے یہاں مذکورہ مشاعرہ جنوری ۱۹۴۱ء کی رات ۹ بجے منعقد ہوا۔ نواب صاحب

کی کوٹھی کے احاطے میں بہت عمدہ اور خوشنما پنڈال بنایا گیا تھا، جہاں کلکتے کی تقریباً تمام معزز ہستیاں براجمان تھیں۔ مثلاً غیر منقسم بنگال کے وزیر اعظم اے۔ کے فضل الحق اور ان کی کابینہ کے دیگر وزرا، شہید سروردی، خواجہ سر ناظم الدین، مسٹر تمیزالدین، سر آدم جی داؤد، مرزا ابوالحسن اصفہانی، محمڈن اسپورٹنگ کے جنرل سکریٹری خواجہ نورالدین اور بہت سے دوسرے امرا، رؤسا، خطاب یافتگان وغیرہ۔ مشاعرے کی صدارت اے۔ کے فضل الحق فرما رہے تھے، چوں کہ وہاں طعام کا بھی بندوبست تھا، اس لیے میزبان کے فرائض شہید سروردی، خود مسٹر اے۔ کے فضل الحق اور دوسرے معززین انجام دے رہے تھے، اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں بچھے جارہے تھے۔

مشاعرے کے آغاز میں اے۔ کے فضل الحق نے بنگالی نژاد ہونے کے باوجود شستہ اردو میں تقریر کی اور کہا کہ چوں کہ میں مشاعرے کا صدر بنایا گیا ہوں، اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ صرف صدارت کروں اور خود کوئی شعر نہ پڑھوں۔ اس لیے میں اپنے ہی کلام سے اس مشاعرے کا آغاز کرنا چاہتا ہوں اور چند شعر جو میں نے کہے ہیں آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ جو اشعار میں پڑھنے والا ہوں وہ کہاں تک موزوں ہیں اور اس میں کوئی خوبی یا حسن موجود ہے یا نہیں، بہرکیف جو کچھ بھی ہے میں پڑھ رہا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے چند اشعار طرح پر پڑھے۔ اب یہ نہ پوچھیے کہ وہ کلام کیسا تھا۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اردو کے چند الفاظ ایک جگہ مجتمع کر دیے گئے تھے جنھیں وزن وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں تھا اور جن کو کسی حال میں بھی شعر نہیں کہا جاسکتا تھا، لیکن مشاعرے میں موجود تمام لوگوں نے اس لیے دل کھول کر داد دی کہ وہ اشعار نما غزل اے۔ کے فضل الحق نے پڑھی تھی جو وزیر اعظم بنگال اور طرفہ یہ کہ بنگالی نژاد تھے۔'' (وحشتؔ اپنے کردار کے آئینے میں، از: ابراہیم ہوشؔ، مشمولہ سوغات، ۱۹۸۱ء، ص: ۲۵۵) اے۔ کے فضل الحق نے اپنا کلام سنا کر مشاعرے کا آغاز کر دیا۔ اب دوسرے پڑھنے والوں میں مبتدی حضرات نے اپنا کلام پڑھا۔ مصرع طرح غالبؔ کا یہ مشہور مصرع دیا گیا تھا:

''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے''

مبتدی شعرا کے بعد کہنہ مشق، اور کہنہ مشق شعرا کے بعد اساتذہ کی باری آئی۔ پوری محفل ہمہ

تن گوش ہوگئی۔ اسٹیج پر وحشتؔ کلکتوی، ثاقبؔ لکھنوی، نوحؔ ناروی، قدیرؔ لکھنوی، مجذوبؔ لکھنوی، بسملؔ الہ آبادی، احسانؔ دانش، آرزوؔ لکھنوی، سراجؔ لکھنوی جیسے ملک گیر شہرت رکھنے والے اساتذہ موجود تھے۔ ان اساتذہ کرام میں ہر ایک اپنی جگہ سوچ رہا تھا کہ پہلے کون پڑھے گا، لیکن یہ وحشتؔ کی عالی ظرفی اور حسن اخلاق کی دلیل ہے کہ جوں ہی اساتذہ کے پڑھنے کی باری آئی انھوں نے کسی کا انتظار کیے بغیر سب سے پہلے اپنی بیاض کھولی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ کلکتے کے شعرا شروع ہی سے یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ تمام لکھنوی شعرا، غیر لکھنوی شاعروں کے کلام پر داد دینے میں بخل و احتیاط سے کام لے رہے ہیں، اور کسی کو کھل کر ایسی داد نہیں دے رہے ہیں، جس کا وہ مستحق ہے۔ چنانچہ وحشتؔ کے ساتھ بھی انھوں نے وہی رویہ اختیار کیا اور ان کے اشعار کی کما حقہ توصیف/تعریف سے گریز کی کوشش کی، لیکن اسے وحشتؔ کے کلام کا جادو اور اس کی بھر پور تاثیر کہیے کہ ان کا یہ رویہ بہت دیر تک قائم نہ رہ سکا اور وہ بھی بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو گئے۔

(وحشت اپنے کردار کے آئینے میں، از: ابراہیم ہوشؔ، مشمولہ سوغات، ۱۹۸۱ء، ص: ۲۵۷)

اس مشاعرے میں دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ نوحؔ ناروی اپنا کلام سنا رہے تھے کہ ایک شعر کے دوران جس کا آخری مصرع یہ تھا:

''آپ وہ کانٹا نکالیں جو ہمارے دل میں ہے''

ان کی مصنوعی بتیسی نکل کر ان کے دامن پر گر پڑی جسے انھوں نے جھٹ سے پھر اپنے منہ میں فٹ کر لیا۔ اس کے بعد غزل سرائی شروع کی۔ ان کی بتیسی گر پڑنے پر نوجوان شعرا کو ہنسی تو بہت آئی اور قریب تھا کہ قہقہے مار کر ہنسنے لگتے، لیکن وحشتؔ کی موجودگی اور آداب محفل کا لحاظ کرتے ہوئے بڑی مشکلوں سے انھوں نے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور صرف مسکرا کر رہ گئے۔ (ایضاً، ص: ۲۵۹)

یہ وحشتؔ کی نرم مزاجی اور ضبط نفس ہی ہے کہ اگر کوئی شخص ان پر اعتراض کرتا تو وہ چپ چاپ سن لیتے اور زبان سے ایسی بات نہ نکالتے جو معترض کی شان کے خلاف ہو یا جس سے معترض کو تکلیف پہنچے۔ ایک مرتبہ کسی صاحب نے وحشتؔ کے کسی شعر پر اعتراض کیا۔ وحشتؔ کے ایک

شاگرد اس اعتراض کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور آپ کے شعر پر فلاں شخص نے یہ اعتراض کیا ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، وحشتؔ نے جواب دیا، چونکہ یہ اعتراض وحشتؔ کے شعر پر ہے اس لیے صحیح ہے ورنہ غلط۔ یہ کہہ کر انھوں نے اساتذہ کے دس بارہ شعر سنداً پیش کر دیے۔ (مضمون نظیر صدیقی ماہنامہ نگار، لکھنؤ ۱۹۵۷ء/نساخ سے وحشت تک، ص: ۱۵۲)

کسی پر تنقید کرنا وحشتؔ کی فطرت/مزاج کے خلاف تھا۔ صرف یہی نہیں کہ وہ کسی پر تنقید نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے تلامذہ کو بھی روکتے تھے۔ واقف بہاری کہتے ہیں کہ ''میں نے ایک مرتبہ ایک حضرت کی بے جا تعلّیوں سے برافروختہ ہو کر ان کے دیوان پر اعتراضات کیے اور قبل اشاعت ضمناً ایک خط میں مولانا (وحشتؔ) سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ صرف ان اغلاط سے بچنے کی کوشش کیجیے۔ اشاعت کی ضرورت نہیں۔ اس سے لوگ آپ کی خالص ادبی خدمت کو شہرت پسندی پر محمول کریں گے (خدا مجھے مولانا کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے)۔'' (سید لطیف الرحمٰن، نساخ سے وحشتؔ تک، ص: ۱۵۳)

جمیلؔ مظہری وحشتؔ کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی رضاؔ مظہری ان کے شاگرد نہیں تھے، لیکن صرف اس لیے کہ وہ جمیلؔ مظہری کے چھوٹے بھائی تھے وحشتؔ کو ان سے پدرانہ محبت تھی۔ ۱۹۳۸ء میں پٹنے میں رضاؔ صاحب کی شادی ہوئی۔ جمیلؔ مظہری نے وحشتؔ کو شرکت کی پر اصرار دعوت دی، لیکن وحشتؔ چونکہ سفر کی ہمت نہ رکھتے تھے اور سفر سے بہت گھبراتے تھے۔ اس لیے شادی میں شریک نہ ہو سکے۔ شادی کے بعد رضاؔ مظہری کلکتے واپس آئے۔ جمیلؔ مظہری بہ سلسلۂ ملازمت پٹنے ہی میں تھے۔ کچھ روز بعد رضاؔ مظہری کے نام وحشتؔ کا خط آیا کہ فلاں روز میں نے تمھاری شادی کی خوشی میں احباب کو مدعو کیا ہے۔ آ جانا۔ اس سلسلے میں کافی اہتمام بھی کیا گیا۔ اس پروگرام میں وحشتؔ نے رضاؔ مظہری کو پھولوں کا ہار پہنایا اور سہرا پڑھا۔ رضاؔ مظہری کا بیان ہے کہ وحشتؔ ایسے خوش تھے جیسے وہ اپنے لڑکے علی حسن کے سر پر سہرا باندھ رہے تھے۔ (سید لطیف الرحمٰن، نساخ سے وحشتؔ تک، ص: ۱۶۱)

وحشتؔ بڑے خوش مزاج انسان تھے۔ انھیں غصے کی حالت میں شاذ و نادر ہی دیکھا گیا۔ رضاؔ

مظہری لکھتے ہیں:

''برادرِ معظم حضرت جمیلؔ مظہری نے مجھ سے وہ واقعہ بیان کیا جب انھوں نے اپنے استاد وحشتؔ کو صرف ایک بار غصے میں دیکھا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ غالباً ۲۷ء یا آغاز ۲۸ء حضرت صفیؔ لکھنوی کلکتہ تشریف لائے تھے۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ میں ان کے خیر مقدم کے لیے ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ وحشتؔ صاحب کو مجبوراً صدر بننا پڑا تھا اس لیے صفیؔ سے پہلے نہ پڑھ سکتے تھے۔ صفیؔ صاحب نے اپنا کلام سنایا تو کافی سے زیادہ اُن کو داد ملی۔ ان کے بعد حضرت وحشتؔ نے اپنی غزل سنائی تو سامعین نے عموماً اور ان کے شاگردوں نے خصوصاً بہت زیادہ جوش سے داد دی۔ دوسرے دن کالج میں انھوں نے میرے بھیّا اور ان کے ساتھیوں کو کلاس میں بلوا کر بے حد غصے کے ساتھ ڈانٹا کہ آپ لوگوں نے صفیؔ صاحب کے سامنے مجھے خفیف کیا اور کلکتہ کی مہمان نوازی کو بھی رسوا کیا۔ آپ لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ ہمارے مہمان ہیں اور ہندوستان کے برگزیدہ شاعر ہیں۔ ان کے کلام سے زیادہ داد آپ کو میرے اشعار کی ہرگز نہ دینا چاہیے تھا۔ وہ کیا سمجھے ہوں گے؟ شاگردوں نے دست بستہ معافی مانگی تو ان کا غصہ فرو ہوا۔ یہ تھی عالی ظرفی اس عظیم شاعر کی جو صرف عظیم شاعر نہیں بلکہ عظیم انسان بھی تھا۔ بڑا شاعر بننا اتنا دشوار نہیں جتنا بڑا انسان بننا ہے۔'' (یادگارِ وحشتؔ، کلکتہ، مرتبہ: اسحاق راشد — ص: ۴۹)

وحشتؔ نے زندگی کی آسائشوں کے ساتھ درد و غم بھی جھیلے تھے۔ وہ لاکھ مصیبت میں گھرے ہوں لیکن زبان سے اُف تک نہ کرتے تھے۔ اظہارِ غم ان کی خود دار طبیعت کو گوارا نہ تھا، یہی درد و غم ان کی شاعری میں در آئے:

جہاں میں چھوڑ جاتا میں المناک ایک افسانہ
اگر مجھ سے مری روداد غم تحریر ہو جاتی

طور دیکھے ہیں زمانے کے ہمارے دل نے
اب کہاں اس میں تمنا کا گزر ہوتا ہے

وحشتؔ کے اخلاق و اطوار کی طویل داستان ہے۔ سارے واقعات کا بیان یہاں ممکن نہیں۔ جو کچھ ان کے اخلاق سے متعلق لکھا گیا، اس کی روشنی میں ہم وحشتؔ کی انسان نوازی کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں:

''طویل ہے یہ کہانی کہاں تلک کہیے!''

آئیے اب وحشتؔ کے مخصوص اطوار کا جائزہ لیں تاکہ ان کی شخصیت کا ہر پہلو روشن ہو سکے۔ وہ بڑے ہی روایتی اور رکھ رکھاؤ والے انسان تھے۔ لباس کے معاملے میں پکے ہندوستانی تھے۔ اکثر عادتیں انھوں نے یوروپین اپنائی تھیں۔ بنگال چیمبرس آف کامرس سے انسلاک کے ناتے اور انگریزوں کو اردو سکھانے کی وجہ سے انھیں انگریزوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ غالباً ان کی اکثر باتیں انھیں پسند بھی آتیں۔ وقت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کسی سے وعدہ کر لیا تو ضرور پورا کرتے۔ دوستوں اور عزیزوں کے علاوہ زیادہ کسی سے بے تکلف نہ ہونا ان کی فطرت تھی، لیکن اپنے مخصوص عزیزوں اور احباب سے خاصے بے تکلف تھے۔ ان کی یوروپین عادتوں کو ان کے اردگرد کے اینگلو انڈین ماحول نے بھی کچھ تقویت پہنچائی تھی، کیوں کہ کرسمس اور نئے سال کے کیک، چاکلیٹ، چلغوزے، پھل وغیرہ ان کی زندگی میں کافی اہم تھے۔ انگریزی ادب اور شاعری سے ان کو خاصا لگاؤ تھا۔ انگریزی زبان پر بھی مہارت رکھتے تھے، مگر ہندوستانی تہذیب کا رنگ بھی ان پر گہرا تھا۔ اکثر بنگالی پروفیسروں/ دانشوروں سے ان کے مراسم تھے، لیکن بنگالی کلچر سے وہ بہت زیادہ قریب نہیں تھے جس کی وجہ کچھ اور نہیں، بلکہ کلکتے کا وہ خصوصی ماحول تھا جہاں ہر زبان اور ہر کلچر کی کھپت تھی اور اب بھی ہے۔ اپنے اپنے دائرے میں سب ہی ترقی کر سکتے ہیں۔ (سوغات ۱۹۸۱ء، کلکتہ، مرتبہ: اسدالزماں اسد، ص ۲۷۷)

۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۰ء تک وحشتؔ کا قیام نمبر ۱۷ ویلسلی سکنڈ لین (موجودہ اے-کے-ایم صدیق لین) میں تھا۔ ویلسلی سکنڈ لین کا مکان دو منزلہ تھا۔ دروازے پر پردہ پڑا رہتا اور عام دنوں میں یہ کمرہ بند ہی رہتا۔ اس کمرے میں ہر اتوار کی دو پہر یا شام کو ملنے جلنے والوں کی بھیڑ رہتی تھی۔

خوب شعروشاعری ہوتی تھی اور مختلف موضوعات پر گفتگو بھی ہوا کرتی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ہال تھا۔ ہال کے اندر داخل ہوتے ہی سامنے کی طرف وحشتؔ کا کمرہ پڑتا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ وہاں سے سکنڈ لین اور ویلسلی اسٹریٹ کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔ کمرے میں برمی سیگون کا پرانا جہازی سائز کا بڑا سا ایک پلنگ تھا جس پر ہمیشہ صاف اور سفید چادر بچھی رہتی تھی۔ پلنگ کھڑکی کے قریب ہی تھا۔ دروازے اور پلنگ سے ملی ہوئی ایک بڑی سی میز بھی تھی جس پر کتابیں، رسائل، یونیورسٹی کے جانچنے کے پرچے، ہومیو پیتھک دواؤں کے بکس اور ٹانک کی شیشیاں رکھی ہوتیں۔ کمرے کے دروازے کے دوسرے کونے پر بڑی سی الماری تھی۔ پلنگ کے نیچے ہمیشہ ایک صندوق اور دو بڑے دیگوں کے علاوہ یونیورسٹی یا بورڈ کے تازہ آئے ہوئے بے شمار پیپر کے بنڈل بھی رکھے ہوتے تھے۔ اینٹ لگا کر پلنگ کو اونچا کیا گیا تھا، مگر چادر ایسی ڈالی جاتی کہ اینٹیں چھپ جاتیں۔ گھر پر ہونے کی صورت میں پلنگ ہی پر گاؤ تکیہ کے سہارے دراز ہوکر یا تو مطالعہ کرتے یا پھر خطوط کے جواب دیتے۔ لکھتے وقت بستر ہی پر یا تو تکیے کے سہارے بیٹھ جاتے یا پھر وہیں سے میز پر جھک کر لکھتے۔ کتابوں کا ایک ذخیرہ ۱۹۳۵ء میں دلکشا اسٹریٹ سے ویلسلی سکنڈ لین میں منتقل ہوتے وقت وہ پارک سرکس کے دلکشا انسٹی ٹیوٹ کو دے آئے تھے۔ پھر بھی اس گھر میں ہر طرف کتابیں تھیں۔

(وحشتؔ کلکتوی — چند یادیں چند باتیں، از: ابوالخیر محمد فاروق، مشمولہ سوغات، ۱۹۸۱ء، ص: ۲۷۸)

وحشتؔ کی مصروفیت کچھ زیادہ ہی تھی۔ ان کا ہر روز کا پروگرام کافی مصروفیت کا ہوتا تھا۔ صبح کو نکل جاتے۔ انگریزوں کو پڑھا کر، دوستوں سے مل کر دوپہر کو آتے۔ کھانے کے بعد قیلولہ کرتے۔ تین ساڑھے تین بجے سے اٹھ کر خطوط کے جواب دیتے، شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دیتے اور اسی نوع کے دوسرے ادبی اور سرکاری امور بھی انجام دیتے۔ شام کی چائے کے بعد انگریزوں کو پڑھانے یا دوستوں سے ملنے چلے جاتے۔ ہر جگہ جانے کا معمول بنا رہتا۔ فرصت کے وقت اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے گھر جاتے۔ اتوار یا چھٹی کے دنوں میں دوپہر کے بعد گھر دوستوں اور شاگردوں سے ملاقات کے لیے وقف ہوتا۔ ملاقاتی عموماً تین ساڑھے تین بجے تک آنا شروع ہو جاتے۔ نوکر تین بجے تک جا کر نیچے کمرے کا دروازہ کھول دیتا۔ لوگوں کو بٹھاتا اور

اوپر وحشتؔ کو اطلاع دیتا کہ کون کون سے صاحبان تشریف لائے ہیں۔ پھر وحشتؔ خود نیچے اترتے۔ چائے اور دوسرے لوازمات سجائے جاتے اور شام گئے تک ان کی یہ محفل جمی رہتی۔ چھٹیوں میں یا شام کو، جب انھیں کہیں جانا نہ ہوتا اور موسم خوشگوار ہوتا تو وہ چھت پر چلے جاتے۔ ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی جسے ٹہل ٹہل کر پڑھتے۔ صوفیوں اور اولیا سے انھیں کافی عقیدت تھی۔ کلکتے میں ہونے والے مزاروں کے عرس میں شریک ہوتے۔ باقاعدہ نماز تو نہیں پڑھتے تھے، لیکن مذہب سے انھیں شدید ذہنی/ روحانی لگاؤ تھا۔ عید اور بقرعید کے دن نماز کے بعد فوراً قبرستان کا رخ کرتے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد گھر آتے۔ ہاتھ میں مٹھائیوں کا ڈبا ضرور ہوتا۔ بچوں کو ایک ایک روپے عیدی دیتے۔ عیدی والے نوٹ ہمیشہ نئے اور کرارے ہوا کرتے تھے۔

(سوغات ۱۹۸۱ء، کلکتہ، مرتبہ: اسدالزماں اسد، ص: ۲۷۵)

وحشتؔ کے یہاں ہر سال دھوم دھام سے محفل میلاد کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ وہ جب تک ۱۷ ویلسلی سکنڈ لین میں رہے، ہر سال میلاد ضرور منعقد کراتے۔ میلاد ربیع الثانی کے چاند میں ہوا کرتا تھا۔ میلاد کے دن خاندان کے تمام لوگ ان کے یہاں جمع ہو جاتے تھے۔ شام سے پہلے ہی اوپر کی منزل کے ہال کو خالی کروا دیا جاتا اور ہال میں سفید چادریں بچھا دی جاتیں۔ ہال کے بیچ گاؤ تکیے، گلاب پاش اور میلاد کی کتابیں رکھ دی جاتیں۔ وحشتؔ مغرب سے پہلے ہی ہال میں ٹہلنا شروع کر دیتے۔ مغرب کی نماز کے بعد لوگ آنا شروع ہو جاتے اور سات بجے کے قریب میلاد کا آغاز ہو جاتا۔ ڈاکٹر طاہرؔ اور مولانا محمد حنیف اسلم میلاد شریف کی کتاب سے مخصوص صفحات پڑھتے۔ قمرؔ صدیقی اور اظہرؔ قادری اپنی خوبصورت آواز میں وحشتؔ کی مختلف نعتیں سناتے۔ یہ سالانہ میلاد وحشتؔ کے گھر کی روایت سا بن گیا تھا۔ میلاد میں ان کے احباب اور شاگردوں کا بڑا حصہ موجود ہوتا۔ عباس علی خاں بیخودؔ، محمود طرزیؔ، قمرؔ صدیقی، پروفیسر اخترؔ، ابوجعفر کشفیؔ بطور خاص اپنے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اہم کردار ادا کرتے تھے۔ میلاد کے بعد مخصوص بکس میں جو اس تقریب کے لیے خاص طور پر بنوایا جاتا تھا، اور جس پر انگریزی میں رضا علی وحشتؔ لکھا ہوتا تھا، سب کو اس زمانے کے مشہور مٹھائی بنانے والے علاؤ الدین کی دکان کے چار لڈو ملا کرتے تھے۔ کلکتے سے ہجرت سے چند سال قبل لڈو بکس کے بجائے کاغذ کے ٹھونگوں میں ملنے لگے تھے۔ (ایضاً، ص: ۲۷۶)

۱۹۴۷ء میں ہونے والے کلکتے کے بھیانک فسادات سے بددل ہو کر ۱۹۵۰ء میں وحشتؔ ہجرت کر کے ڈھاکہ چلے گئے۔ اس سلسلے میں آثرؔ صدیقی کا یہ بیان ملاحظہ ہو، جس سے وحشتؔ کی بالکل نئی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے:

> ''آخر ۱۹۵۰ء میں ترکِ وطن کرنا پڑا۔ مجھے اور اظہرؔ قادری کو بلایا اور فرمایا کہ وہ مشرقی پاکستان جانے پر مجبور ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پانی کے جہاز سے سفر کریں ہم دونوں کو ٹامس کُک کے دفتر سے پتہ چلانے کا حکم دیا اور یہ بھی فرمایا کہ آپ لوگ دریافت کیجیے کہ ایک طوطے پر کتنا ٹکٹ لگے گا۔ میں نے عرض کیا کہ طوطے کو آزاد کر دیجیے تاکہ نجات ملے۔ راضی نہ ہوئے۔ کہا کہ ایک زمانے کا ساتھی ہے کیوں کر چھوڑ دوں۔ پھر کئی دنوں کے بعد خیال بدل دیا اور بذریعہ ریل سفر کیا۔ وطن چھوڑنے کا آپ کو بہت صدمہ ہوا۔''
>
> (سید رضا علی وحشتؔ، از: آثرؔ صدیقی، مشمولہ سوغات، ۱۹۸۱ء، ص: ۲۶۶)

ڈھاکہ سے کلکتہ وحشتؔ اپنی پنشن اور دوسری چیزوں کے سلسلے میں آتے رہے۔ آنے کا یہ سلسلہ ۱۹۵۵ء تک جاری رہا۔ جب وہ کلکتے آتے تو ان دنوں ان کا قیام ۱۴۷ ربیک بگان روڈ موجودہ شمس الہدیٰ روڈ میں ہوتا۔ کلکتے آنے سے پہلے وہ اپنے نواسے ابوالخیر محمد فاروق (ابوالخیر محمد فاروق وحشتؔ کی بہن کے نواسے ہیں۔ اس نسبت سے وہ وحشتؔ کے بھی نواسے ہوئے) کو خط لکھ کر ساری تفصیلات سے آگاہ کر دیا کرتے۔ انھیں سارا پروگرام پہلے ہی بتا دیا کرتے اور آنے کے بعد اسی پر عمل بھی کیا کرتے۔ ابوالخیر محمد فاروق لکھتے ہیں:

> ''اب تو وہ خطوط ضائع ہو چکے ہیں لیکن اپنے آنے سے پہلے وہ مجھے ایک خط ضرور لکھتے اور اس میں تفصیل سے اپنا پروگرام لکھ دیتے کہ وہ کب پہنچ رہے ہیں، میں ان سے شہر کے ایئر ٹرمینل میں کس وقت ملوں پھر ان کو کہاں لے جاؤں وغیرہ وغیرہ۔ اپنے مختصر سے قیام کے دوران وہ اپنے پروگرام کے لحاظ سے سبھوں سے ملتے۔ پنشن کا انتظام کرتے۔ محترم ڈاکٹر صابر خاں ضبطؔ صاحب کے یہاں جاتے اور وقت مقررہ ہی پر ڈھاکہ لوٹ جاتے۔ پروگرام

> میں جہاں تک مجھے یاد ہے شاذونادر ہی کوئی تبدیلی ہوتی اور کسی مجبوری کے تحت ان کے پروگرام میں کوئی تبدیلی یا اضافہ ہوتا تو ان کو ناگوار ہوتا۔ ان کے تمام احباب میرے خیال میں ان کی اس عادت سے واقف تھے۔ اس لیے ان کو وہ لوگ کسی بات پر مجبور نہ کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک ایسے ہی قیام کے دوران کسی نے ان کو اپنے گھر آنے پر مجبور کیا۔ پہلے تو انھوں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی لیکن انھیں جانا ہی پڑا۔ واپس آتے ہی میری نیّا (نیّا ابوالخیر کی نانی، پیار سے نیّا کہتے تھے۔ نیّا وحشتؔ کی بہن تھیں) کو فوراً انھوں نے کہا ''بھئی حبیب (وحشتؔ اپنی بہن کو پیار سے حبیب کہا کرتے تھے) یہ دعوت نہیں عداوت تھی!''
>
> (وحشتؔ کلکتوی- چند یادیں چند باتیں، از: ابوالخیر محمد فاروق مشمولہ سوغات ۱۹۸۱ء، ص: ۲۸۰)

پنشن کی وصولی اور دیگر مصروفیتوں کے علاوہ ان کے پروگرام میں کلکتے کے نیو مارکٹ جانا بھی ضروری تھا۔ کلکتے کے اس لینڈ مارک سے ان کو کافی انسیت تھی۔ کلکتے میں مختلف خریداریوں کے بعد ناہوم کے کیک بھی ضروری تھے۔ ایک ڈبّا تو ڈھاکہ جاتا اور ایک اپنی ہمشیرہ کے لیے۔ ایک دفعہ ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے نیو مارکٹ جیسی کوئی اور جگہ دیکھی ہے؟ جواب میں انھوں نے کہا کہ وہ بچپن سے نیو مارکٹ دیکھ رہے ہیں اور اس کی رونق میں کوئی کمی نہیں آئی، اور پھر مخصوص انداز میں یہ شعر پڑھا:

الٰہی یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

(ایضاً)

ان کی وفات سے چند سالوں قبل ان کی طبیعت بہت ناساز رہنے لگی۔ انھیں شوگر کا مرض لاحق ہو گیا، لیکن پنشن لینے کے لیے جب بھی وہ کلکتے آتے تو زکریا اسٹریٹ ضرور جاتے اور مرضِ ذیابطیس کے باوجود فالودہ بھی ضرور کھاتے۔ ابوالخیر محمد فاروق لکھتے ہیں:

> ''زکریا اسٹریٹ بھی ایک دن جانا ضروری ہوتا۔ مولانا کی دکان کی لنگیاں، ٹوپی بخشی کی جنتری، علاؤالدین کی مٹھائیوں کے بعد وہ ضرور کہتے ''چلو ابوالخیر کہیں

فالودہ کھائیں!'' انھیں ذیابطیس کی شکایت تھی اور مجھے معلوم تھا کہ انھیں میٹھے
سے کافی پرہیز کرنا چاہیے لیکن کلکتہ میں ایسے Indulgence سے کون کسی کو
روک سکتا تھا۔'' (ایضاً،ص:۲۸۱)

ان کی مقبولیت کے قصے تو بہت مشہور ہیں اور جن لوگوں نے ان کو اور قریب سے دیکھا ہے وہ
اس طرح کے بہت سے واقعات سنا سکتے ہیں۔ ابوالخیر کہتے ہیں کہ انھیں بھی دو چار بار ان کے
ساتھ ہوتے ہوئے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔ اسلامیہ کالج، جو ان دنوں سنٹرل کالج (موجودہ
مولانا آزاد کالج) ہو چکا تھا، سے ان کی وابستگی آخر دم تک رہی۔ ڈھاکے سے بھی کالج کے سالانہ
مشاعرے کے لیے مصرع طرح بھیجتے رہے۔ غالباً ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء کے آغاز میں جب وہ کلکتے
آئے تو کالج چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ فرینڈز پریرا ان دنوں کالج کے پرنسپل تھے اور کسی زمانے
میں وحشتؔ کے کلیگ (Colleague) بھی رہ چکے تھے۔ ابوالخیر ہی وحشتؔ کو کالج لے گئے۔
اس وقت بھی پرنسپل کا رعب اور دبدبہ ہوا کرتا تھا۔ ابوالخیر کالج اسٹوڈینٹس یونین کے جزل
سکریٹری تھے اور ان کی پہنچ پرنسپل تک نسبتاً آسان تھی۔ انھوں نے ہی پریرا کے کمرے میں جاکر
وحشتؔ کے آنے کی خبر دی۔ ان کا نام سنتے ہی پریرا نے کہا۔ "Oh, the grand old
man is here" اور خود ہی باہر آکر انھیں اپنے آفس میں لے گئے۔ اس سے بخوبی پتا چلتا
ہے کہ ان کے رفقائے کار ان کی کس قدر عزت کیا کرتے تھے۔ (ایضاً،ص:۲۸۱)

وحشتؔ کالج کے اساتذہ، اپنے مرحوم دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے متعلق مزے مزے
کی باتیں کیا کرتے تھے۔ بیخودؔ سے متعلق کہتے تھے کہ ان کو اپنے طلبہ میں پاپولر ہونے کا گر آتا ہے۔
ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ پرویزؔ شاہدی کی بھی بڑی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ انھیں مشاعرہ
مین (Mushaira Man) کا خطاب دیا تھا۔ پروفیسر نیاز احمد کی تنقیدی صلاحیتوں کے قائل تھے۔
جمیلؔ مظہری اور رضاؔ کاظمی کو تو اپنے خاندان ہی کا فرد سمجھتے تھے۔ شاکرؔ کلکتوی سے بھی بڑی محبت
تھی۔ ان کے شاعرانہ مزاج اور فن پر گرفت کی ثناخوانی سے نہ تھکتے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی سنیٹ
کے ممبر ہونے کی وجہ سے بنگالی اساتذہ اور دانشوروں سے بھی مراسم تھے۔ تعریف کا جو بھی مستحق

ہوتا، اس کی تعریف ضرور کرتے۔ (ایضاً،ص:۲۸۲) وحشتؔ کی شہرت کے دو واقعے ابوالخیر
محمد فاروق کی زبانی سنیے:

''مجھے لطف ان کے ساتھ ٹرام میں سفر کرتے وقت آتا تھا۔ اردو سے ذوق رکھنے
والے کنڈکٹر اکثر ان کو جانتے تھے اور ان سے ٹکٹ نہیں لیتے تھے۔ اس بات
سے وہ کافی ضیق ہوا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ترکِ کلکتہ سے پہلے وہ اس لیے
ہمیشہ ٹرام کے پاس رہتے تھے۔ ان کی شاعری اور ان کی شخصیت میں کچھ تو سحر
ضرور ہوگا جس نے ان کو عوام سے اس قدر قریب کر رکھا تھا!''
(وحشتؔ کلکتوی- چند یادیں چند باتیں، از: ابوالخیر فاروقی، مشمولہ سوغات ۱۹۸۱ء، ص:۲۸۲)

''ایک بار پارک سرکس کے سوسائٹی ریستوراں میں ان کے ساتھ جانے کا
اتفاق ہوا۔ جب کاؤنٹر پر پیسے دینے لگے تو مالک نے لینے سے انکار کر دیا۔ اب
ان کا اصرار اور مالک کا انکار اور کئی تماشائی۔ بڑا دلچسپ سین تھا۔ لیکن اس قسم
کے تکلفات انھیں قطعی پسند نہیں تھے۔'' (ایضاً)

کلکتے میں ان دنوں قیام کے دوران وہ روز بالکل صبح اندھیرے اٹھتے۔ منہ ہاتھ دھونے کے
بعد سیر کے لیے نکلتے۔ آدھے گھنٹے تک پارک سرکس میدان کا چکر لگاتے۔ آتے وقت 'اسٹیٹسمین'
خریدتے اور پھر ناشتہ کرتے۔ ناشتے کے بعد اپنے روز کے پروگرام دیکھتے۔ رات میں سونے سے
قبل وہ اگلے دن کے تمام پروگرام ترتیب وار نوٹ بک میں درج کرتے اور اسی پروگرام کے تحت
گھر سے نکلتے۔ کہتے کہ ہر چیز کا Method ہونا چاہیے۔ اس سے وقت ضائع نہیں ہوتا اور کام بھی
ہو جاتے ہیں۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اگر خطوط کے جواب لکھنے ہوتے تو یہ کام بھی کر لیتے۔ خط عموماً
پوسٹ کارڈ ہی پر لکھتے۔ خط پوسٹ کرنے کے سلسلے میں کسی پر اعتبار نہ کرتے۔ خود ہی جاکر پوسٹ کر
تے۔ ان کا قیام ان دنوں جس فلیٹ میں ہوتا، اس کے قریب ہی ایک ہیئر ڈریسنگ سیلون بھی تھا
(شاید اب بھی ہو)۔ اس کے مالک کا نام حکیم تھا۔ شیو کے لیے روز وہاں جاتے اور حکیم کی باتوں
سے محظوظ ہوتے۔ خصوصاً اس کی کلکتیہ اردو سے۔ اسے 'حکیم فرزانہ' کا خطاب دیا تھا۔
(ایضاً،ص:۲۸۳)

وحشتؔ Establishment کے قائل تھے۔ انگریزوں کی حکومت، اہلیت اور ان کی بعض حکمتِ عملیوں کی تعریف کرتے تھے۔ ان لوگوں سے ان کی ذاتی دوستی نے ان پر کافی اثر کیا تھا۔ سیاسی سوجھ بوجھ بھی اعلیٰ رکھتے تھے۔ واقعہ ہے کہ ایران کا تذکرہ اور اس کی سیاست کی باتیں عام تھیں۔ شاہِ ایران سی-آئی-اے والوں کی مدد سے اپنے تخت پر پھر آبیٹھے تھے۔ مصدق جیل میں تھے، جن پر مقدمہ چلایا جارہا تھا۔ غالباً ۱۹۵۳ء کی بات ہوگی۔ مصدق کی متنوع تصاویر اخباروں میں آیا کرتیں۔ کبھی روتے ہوئے، کبھی دل گرفتہ، کبھی عدالت کے کٹہرے میں اپنی مدافعت کرتے ہوئے۔ وحشتؔ کو مصدق سے زیادہ ہمدردی نہ تھی۔ مصدق کی ان باتوں کی ایکٹنگ کیا کرتے اور کہتے کہ اگر اس میں صلاحیت اور سیاسی سمجھ ہوتی تو شاہ کبھی واپس نہ آتا، اور مثال انگریزوں کی دیتے کہ مصدق کو پہلے ان سے ڈپلومیسی سیکھنی چاہیے تھی۔

(سوغات ۱۹۸۱ء، کلکتہ، مرتبہ: اسدالزماں اسد، ص: ۲۸۴)

ادب، زبان اور کلچر کے معاملات میں روشن خیال تھے۔ اردو سے ان کی محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ اردو کے خلاف ہونے والی سازشوں کی مخالفت میں پرزور دلائل پیش کرتے تھے۔ انھوں نے شعرا کی نئی روش سے متعلق ناگواری کا اظہار کیا، لیکن ادب اور شاعری کی ہر اس تخلیق کو پسند کیا، جس میں خوبصورتی اور حسن ہو۔ ہاں اپنے خیالات کے بے جھجک اظہار میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔ ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند شعرا کا زبردست مشاعرہ کلکتہ یونیورسٹی ہال میں ہوا۔ جوشؔ ملیح آبادی، سردارؔ جعفری، نیازؔ حیدر، ساغرؔ نظامی اور اس مرتبے کے دیگر شعرا بھی آئے۔ پروفیسر ہیرالال چوپڑہ نے کلکتے میں پہلی بار اسی مشاعرے میں اپنا کلام سنایا۔ ’روزانہ ہند‘ کے فگارؔ صاحب نے اس مشاعرے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن اس کے سیاسی رنگ کی وجہ سے بعد میں اپنے اخبار میں تردیدیں شائع کرتے رہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کا رشتہ اس وقت ملک کی اشتراکی تحریک سے بہت گہرا ہو چکا تھا۔ کمیونسٹ تحریک کے بہت سے سیاسی فیصلوں نے اردو کی ترقی پسند تحریک کو زیرِ دام کیا تھا۔ وحشتؔ نے اس مشاعرے کا افتتاح کیا تھا۔ افتتاحی تقریر میں انھوں نے ان دنوں کی ترقی پسند تحریک پر تھوڑی سی روشنی ڈالی تھی۔ ذہنی طور پر شاید انھوں نے اس تحریک

سے وابستہ نہ ہونے کا اقرار کیا تھا۔ پھر ایک غزل سنائی تھی اور مشاعرے سے چلے آئے تھے۔

(سوغات ۱۹۸۱ء، کلکتہ، مرتبہ: اسدالزماں اسد، ص: ۲۸۴)

وحشتؔ کو ترقی پسند تحریک میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن ان کے بہت سے شاگرد، مدّاح اور احباب اس تحریک سے وابستہ تھے۔ وہ ان کی اچھی تخلیق کے مداح تھے۔ پرویزؔ شاہدی، ناظرؔ الحسینی، احسانؔ دربھنگوی، ابراہیم ہوشؔ اور کلکتے کے ایسے ہی اکثر شعرا اور ادبا کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ جوشؔ، جگرؔ اور نئے لکھنے والوں میں فیضؔ، سردارؔ جعفری اور مجروحؔ سلطان پوری کا اکثر ذکر کیا کرتے۔ خاص طور پر سردار جعفری کی ادبی فہم و فراست، وسیع مطالعہ اور شاعری کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے، لیکن بعض شعرا کی فنی ناپختگی اور بے پروائی کے شاکی بھی تھے، اور ان کے کلام سے متعلق کہتے تھے کہ ان کا پڑھنا وقت کو برباد کرنا ہے۔ ان کو شاعری کے سیاسی مسلک میں کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن انھیں شعری وفور، فنی پختگی، خیال کی ندرت اور جذبات کی گیرائی کا زیادہ خیال رہتا تھا، خواہ یہ گیرائی کسی کے بھی کلام میں ہو۔ انھوں نے ترقی پسند افسانہ شاید کم ہی پڑھا تھا، مگر کرشن چندر، عصمت، بیدی، منٹو وغیرہ کی ادبی خدمات سے واقف تھے۔ ان کی بے نیازی کا ایک واقعہ سنیے۔ ابوالخیر کہتے ہیں:

> ’’اردو نقادوں نے شاید ہی گہرائی سے ان کے کلام کے مطالعے کی ضرورت سمجھی ہو، اکثر تذکروں میں ان کا ذکر ہی نہیں ہے۔ میں نے ایک بار ان سے اس کی وجہ پوچھی، ہنس کر کہا تھا: ’’شاید میں اس قابل نہیں ہوں!‘‘ (ایضاً، ص: ۲۸۵)

وحشتؔ کے دل میں اپنے پرانے دوستوں اور تلامذہ کے لیے گہری محبت تھی۔ (ڈھاکے سے) کلکتے آنے سے پہلے وہ ایک دو پروگرام کا خاکہ یوں بنالیتے کہ کسی جگہ ان کے تمام احباب جمع ہو جائیں۔ ایک دوپہر یا شام ’بزمِ شاکری‘ کے لیے بھی مقرر ہوتی۔ شاکر کلکتوی کے بھی دل میں وحشتؔ کے لیے بڑی عقیدت تھی۔ یہ مختصر محفلیں نہایت دلچسپ ہوا کرتیں، اور وحشتؔ یہاں کافی مطمئن نظر آتے۔ شعر و ادب کے ساتھ سیاست پر بھی باتیں ہوتیں۔ اپنی تازہ غزلیں پڑھ کر سناتے۔ دوسروں کا بھی کلام سنتے اور داد دیتے۔ حسبِ موقع وہ اس انداز سے اشعار پڑھتے کہ

سننے والا مچل کر رہ جاتا۔ ایک دفعہ رضاؔ کاظمی کے گھر پر شام کی چائے کا پروگرام تھا۔ وہاں جمیلؔ مظہری، عباس علی خاں بیخودؔ، آغا حشر کاشمیری کے علاوہ کئی اور احباب بھی موجود تھے۔ شعرا پر تبصرے ہو رہے تھے کہ اجتبیٰ رضوی کا ذکر نکل آیا۔ وحشتؔ نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی اور یہ کہا کہ ''اجتبیٰ نے کیا غضب کی ترقی کی ہے۔'' چائے کے بعد کلام سنانے کی باری آئی۔ انھوں نے مطلع ہی پڑھا تھا (ان دنوں ان کی آواز کمزوری اور بیماری سے کافی مدھم ہوگئی تھی) کہ آغا حشر کاشمیری نے کہا، ''حضور سنائی نہیں دیتا کچھ زور سے پڑھیے''۔ وحشتؔ نے بے ساختہ کہا:

''اسی دن کے لیے ایک شعر لکھ چھوڑا ہے، آپ بھی سنیں'' پھر شعر سنایا:

مجھے اب طعنۂ افسردگی دیتا ہے تو اے دل
کبھی طوفان تھا میں بھی زمانہ یاد کر میرا

(سوغات ۱۹۸۱ء، کلکتہ، مرتبہ: اسد الزماں اسد، ص:۲۸۶)

'بزم شاکری' کی اسی طرح کی ایک محفل شمس الدین عازم کے گھر منعقد ہوئی تھی۔ وحشتؔ بھی شریک ہوئے تھے۔ ان دنوں ان کے ہاتھوں میں کچھ رعشہ بھی آ گیا تھا۔ ناشتے کے بعد جب وہ چائے پینے لگے تو رعشہ سے پیالی اور طشتری کے درمیان جلترنگ سا ہونے لگا۔ عازمؔ نے بڑی محبت سے پیالی اپنے ہاتھوں میں لی اور انھیں چائے پلائی۔ چائے پیتے ہوئے برجستہ انھوں نے اپنا ایک شعر پڑھا:

ساقی نے اپنے ہاتھ سے مجھ کو پلائی مئے
حالت جو دیکھی اس نے کفِ رعشہ دار کی

عازمؔ شرما گئے اور محفل میں اس برمحل شوخ شعر نے ایک عجیب سی لہر دوڑا دی۔ (ایضاً، ص:۲۸۶)

کلکتے میں ان کے پرانے دوست اسرائیل خان تھے۔ ہمیشہ سوٹ بوٹ میں رہتے۔ بڑے ہی رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ وحشتؔ کے ساتھ بنگال چیمبرس آف کامرس میں وہ بھی انگریزوں کو ہندوستانی پڑھایا کرتے اور غالباً وحشتؔ کی لکھی ہوئی کتاب Hindustani Mannual (یہ کتاب انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے وحشتؔ نے لکھی تھی) کا حساب بھی رکھتے تھے۔ وہ اوپر

رینج پارک سرکس کے علاقے میں رہتے تھے۔ جب بھی وحشتؔ ڈھاکے سے کلکتے آتے ان سے ضرور ملتے۔ (ایضاً، ص:۲۸۶)

عباس علی خاں بیخودؔ وحشتؔ کے عزیز شاگرد تھے۔ بیخودؔ کے گھر ان کی دعوت سے واپس آ کر ان کی ضیافت کی بڑی تعریف کرتے۔ ایک دفعہ جب وہ کلکتے آئے تو بیخودؔ اسلامیہ اسپتال میں آنتوں کے آپریشن کے لیے گئے ہوئے تھے۔ کلکتے آنے کے بعد ان کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ جب ان کو اسلامیہ اسپتال بیخودؔ صاحب کے کمرے میں لے جایا گیا تو انھیں دیکھ کر بے ساختہ رونے لگے اور انھیں گلے سے لگا لیا۔ (ایضاً، ص:۲۸۶)

پابندی سے خطوط کے جواب دیتے۔ بیماری، دکھ مصیبت پر تسلّی کے خطوط لکھتے۔ عزیزوں اور دوستوں کو دواؤں کے نام اور بیماری کے لحاظ سے احتیاط برتنے کی تاکیدیں کرتے۔ خوشی کے موقعوں پر مبارک باد کے دو حرف ضرور لکھتے۔

آغازِ شاعری

وحشتؔ نے تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں۔ گھر کی چہار دیواری میں انھیں علم و فن کا گہوارہ اور شائستگی کا سبق تو ملا ہی تھا، گھر سے باہر کے تعلیمی ماحول میں بھی تہذیب و شائستگی کے تقاضوں کو بنیادی اقدار کی جگہ حاصل تھی۔ اسی ماحول میں وحشتؔ کی پرورش ہوئی اور شعور پروان چڑھا۔ ان کے دادا حکیم غالب علی بھی شاعر تھے۔ وفاؔ راشدی کے مطابق وحشتؔ کے والد مولوی حکیم شمشاد علی خود بھی اردو اور فارسی میں طبع آزمائی فرماتے تھے (وفا راشدی، بنگال میں اردو، ص:۹۹) افسوس کہ ان کے کلام کا کوئی نمونہ دستیاب نہ ہو سکا۔

اس طرح شاعری سے وحشتؔ کی نسبت موروثی ٹھہرتی ہے۔ انھیں شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ ذہنی مناسبت کی بنا پر اساتذہ کا کلام شوق سے پڑھتے تھے۔ بہ زبانِ وحشتؔ:

''بات یہ ہے کہ میں لڑکپن ہی سے اساتذہ کا کلام شوق سے پڑھا کرتا تھا اور بعض اشعار کا دل پر گہرا اثر ہو جاتا تھا۔ مومنؔ کا تغزل میرے لیے بڑی جاذب بیت رکھتا تھا اور اس کا تناسب الفاظ بھی مجھے بھلا لگتا تھا۔''

('ادبی دنیا'، لاہور، وحشتؔ نمبر ۱۹۷۳ء)

طالب علمی کے زمانے میں وحشتؔ کا سابقہ مولوی خلیل احمد سے پڑا جو وحشتؔ کے استاد بھی تھے اور اردو اور فارسی کے خوش فکر شاعر بھی۔ وحشتؔ نے اکثر انھیں اشعار گنگناتے سنا تھا۔ وحشتؔ نے بھی اپنے استاد کی نقل کرنی شروع کی۔ استاد نے شاگرد کا شوق دیکھ کر حوصلہ افزائی کی اور دورانِ درس کچھ حد تک رموزِ شعر و سخن سے بھی روشناس کرایا۔ وحشتؔ ابھی میٹرک کے طالب علم تھے کہ تلمیذِ غالب سخن دہلوی کی کتاب 'سروشِ سخن' ہاتھ لگ گئی جس کے مطالعے سے وہ غالبؔ سے بہت مانوس ہوئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے ذہن و دل پر غالبؔ کا کلام چھا گیا۔ بچپن ہی سے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ اس سے شوقِ شعر گوئی کو جو گھر کی فضا اور استاد کے فیضِ صحبت سے حاصل ہوا تھا، صلابت ملی اور شعر و سخن کا مشغلہ ان کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ غالباً ۱۸۹۶ء میں ان کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی۔ پندرہ سال کی عمر سے مشقِ سخن کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اہلِ فن ان کی شاعری کے قائل ہوئے۔

شمسؔ کلکتوی کی شاگردی

وحشتؔ نے جن سے اکتسابِ فن کیا ان میں دو نام آتے ہیں — مولوی خلیل احمد اور ابولقاسم محمد شمسؔ۔ مولوی خلیل احمد، وحشتؔ کے معلّمِ خاص رہے۔ مولوی صاحب کو شاعری سے شغف تھا۔ شاعری سے وحشتؔ کی دلچسپی میں ان کا فیضِ اثر شامل ہے۔ لیکن شاعری میں باقاعدہ شاگرد وہ شمسؔ کلکتوی کے ہوئے۔ ابولقاسم محمد شمسؔ کلکتوی اردو کے مشہور شاعر و تذکرہ نگار عبدالغفور نساخؔ کے فرزند تھے۔ وفاؔ راشدی نے انھیں فرید پوری لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۸۶۱ء بمقام فرید پور مشرقی بنگال میں ہوئی (وفا راشدی، بنگال میں اردو، ص:۱۷) اور سید اقبال عظیم یہ کہہ کر کہ "شمسؔ عام طور پر کلکتوی مشہور ہیں۔ اس لیے کہ ان کی تعلیم و تربیت کلکتے ہی میں ہوئی اور وہیں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بسر ہوا۔ لیکن ان کا اصل وطن فرید پور مشرقی بنگال ہے (سید اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص:۶۶)، شمسؔ کو مشرقی بنگال کا شاعر قرار دے دیا۔ مگر حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ شمسؔ کے شاگردِ رشید وحشتؔ نے بھی اپنے مضمون "شمسؔ کلکتوی' جو ماہنامہ 'خاور'

ڈھاکہ (۱۹۵۲ء) میں شائع ہوا، میں لکھتے ہیں کہ شمسؔ فرید پور مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئے، لیکن وفا راشدی، سید اقبال عظیم اور یہاں تک کہ وحشتؔ کو شمسؔ کی جائے پیدائش کے سلسلے میں مغالطہ ہوا۔ شانتی رنجن بھٹّاچاریہ نے اپنے مضمون 'بنگال میں اردو شاعری انیسویں صدی کے آخر تک' ڈاکٹر جاوید نہال نے اپنی کتاب 'انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب' اور سید لطیف الرحمٰن نے 'نساخؔ سے وحشتؔ تک' میں اس بات کا انکشاف کیا کہ ابولقاسم محمد شمسؔ ۱۲۸۴ھ بمقام بانکے ضلع بھاگل پور (صوبہ بہار) میں پیدا ہوئے۔ فرید پور سے شمسؔ کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ خود کو ہمیشہ کلکتوی ہی لکھتے رہے اور شمسؔ کلکتوی ہی کے نام سے دنیائے ادب میں مقبول ہیں۔

شمسؔ کو شاعری ورثے میں ملی۔ انھوں نے اپنے والد کے بجائے اپنے والد کے شاگردِ خاص مولوی عصمت اللہ انسخ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد میں داغؔ دہلوی کے شاگرد ہوئے اور تا عمر داغؔ کے رنگ میں شعر کہتے رہے۔ کلکتے میں ان کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ خود مسلم الثبوت استاد ہوئے۔ یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں وحشتؔ جیسا شاگرد نصیب ہوا۔ وحشتؔ ہی نے ان کی وفات کے بعد بڑی مشکلوں سے ان کا دیوان مرتّب کر کے شائع کیا۔ شمسؔ کے شاگردوں میں حبیب النبی صولتؔ، اکمل حسین اکملؔ، خان بہادر محمد یوسف رنجورؔ، منشی عبدالکریم نشترؔ چھپروی وغیرہ نے کمالِ فن حاصل کیا۔ لیکن جو شہرت وحشتؔ کے حصے میں آئی، اس سے سب محروم رہے۔ وحشتؔ اپنے استاد سے بھی آگے نکل گئے اور امام الشعرا/ طوطیِ بنگالہ/ غالبِؔ دوراں کہلائے۔ پھر بھی وہ اپنے استاد سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ کہتے ہیں:

غلام معتقد ہوں وحشتؔ اس صاحب مروت کا
نصیبوں سے ملا ہے آج شمسِؔ نکتہ داں مجھ کو

شمسؔ سے وحشتؔ کی شاگردی کا واقعہ بھی سنتے چلیے۔ ۹۶-۱۸۹۵ء میں بادشاہ نواب صاحب عظیم آبادی کے یہاں جو الیٹ روڈ کلکتہ میں مقیم تھے، عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ شمسؔ نے اس مشاعرے میں اپنی سحر انگیز شاعری سے لوگوں پر بڑا اثر ڈالا۔ حبیب النبی صولتؔ، وحشتؔ کے قریبی دوستوں میں تھے۔ وہ وحشتؔ کو شمسؔ کی خدمت میں لے گئے۔ شمسؔ

نے بڑی خوشی سے اصلاح کی ذمہ داری قبول کی اور وحشتؔ تخلص عنایت فرمایا۔ وحشتؔ ان سے متعلق رقم طراز ہیں:

"عبدالغفور نساخؔ مصنف تذکرہ سخنِ شعرا کو معاصر غالبؔ تھے۔ میں نے نہیں دیکھا، مگر ان کے خلف الرشید ابولقاسم شمسؔ سے مجھ کو تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ جب مجھے شعر و سخن کا شوق ہوا، میری عمر پندرہ سولہ سال کی تھی۔ میرے ایک عزیز مجھے ان کی خدمت میں لے گئے اور انھوں نے بخوشی مجھے اپنا شاگرد بنایا۔ مرحوم کی عمر اس وقت کوئی پینتیس سال کی ہوگی۔ عالم تجرید میں ایک گوشۂ تنہائی انھوں نے اپنے لیے پسند کیا۔ وہیں میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ مرحوم کا لب ولہجہ اہلِ زبان کا سا تھا۔ اور حضرت داغؔ دہلوی کی شاگردی پر ناز کرتے تھے۔ تتبع کا حق ادا کیا اور داغؔ نے ان کی زبان کی تعریف کی۔" (بحوالہ: وفا راشدی، حیات وحشت، ص: ۶۳)

وحشتؔ نے ابھی بہ مشکل اپنے استاد سے استفادہ کیا تھا کہ استاد کی وفات ہوگئی۔ استاد کے انتقال کے بعد انھوں نے کسی اور سے مشورہ کرنا مناسب نہیں سمجھا، اپنی طبع سلیم پر بھروسا کر کے مشقِ سخن جاری رکھی اور وہ مہارت حاصل کی کہ مختصر عرصے ہی میں استاد کا مقام حاصل کرلیا۔ اس حقیقت کا اظہار انھوں نے بڑے لطیف انداز میں کیا ہے:

فروغِ طبع خدا داد اگرچہ تھا وحشتؔ
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لیے

مشاعروں سے دلچسپی

مشاعرہ ایسی بزمِ سخن کا نام ہے جہاں شعرا اور اہلِ فن کو اپنے جواہر کے مظاہرے کا موقع ملتا ہے۔ مشاعرے کی ادبی حیثیت اپنی جگہ آج بھی مسلم ہے اور اساتذہ کے عہد میں تو لوگ زبان و تہذیب سیکھنے کی غرض سے مشاعرے میں شرکت کرتے تھے۔ چند استاد شعرا کو چھوڑ کر باقی سبھوں نے مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میرؔ و غالبؔ ہوں یا مومنؔ و شیفتہؔ، امیرؔ و داغؔ ہوں یا اقبالؔ و جگرؔ، تقریباً سبھی شاعروں نے مشاعروں کو زینت بخشی ہے۔ عہدِ وحشتؔ میں بھی پوری آن و بان

کے ساتھ پابندی سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ بڑی تعداد میں شعرا اور اہلِ ذوق شرکت کیا کرتے تھے۔ چاہے وہ مشاعروں کے ذریعے ہو یا دوسری انجمنوں کے ذریعے، وحشتؔ نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اسی لیے وہ چھوٹے سے چھوٹے مشاعرے کی صدارت اور چھوٹی سے چھوٹی ادبی نشست میں بھی شریک ہونے میں تامل نہ کرتے۔ انھوں نے کلکتے میں مشاعروں کے ذریعے ایسا ماحول بنایا تھا جس میں لوگوں میں ادب سے وابستگی کا رجحان سرعت سے بڑھ رہا تھا اور اردو تیزی سے پھل پھول رہی تھی۔ جب تک ان کی صحت برقرار رہی، مشاعروں، ادبی نشستوں اور مجلسِ احباب میں پابندی سے شریک ہوتے رہے، لیکن جب صحت گر گئی تو شرکت سے معذور ہوگئے۔

۱۹۲۶ء میں جب اسلامیہ کالج قائم ہوا تو بحیثیت پروفیسر وحشتؔ منتخب ہوئے۔ انھوں نے وہاں سالانہ مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ کلکتے میں اس سے قبل بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے لیکن کالج کے مشاعرے نے کلکتے کی ادبی فضا میں انقلاب برپا کردیا۔ مہینوں پہلے سے لوگ مشاعرے کے منتظر رہا کرتے۔ مشاعرہ ٹھیک نو بجے شب کو شروع ہوتا اور آٹھ، نو یا دس بجے صبح کو ختم ہوتا۔ خصوصاً بنگال میں اردو کی ترویج و اشاعت کا، یہ مشاعرہ بھی بڑا ذریعہ بنا اور نومشقوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ مشاعرہ گاہ میں لوگوں کی اتنی بھیڑ اکٹھا ہوتی کہ جو جہاں بیٹھ گیا، بیٹھ گیا۔ مشاعرہ کیا ہوتا تھا، یوں سمجھیے کہ میلا لگتا تھا۔ کالج کے احاطے میں چائے اور پان کی دکانیں لگتی تھیں۔ مشاعرے کے اراکین کے دباؤ کی وجہ سے وحشتؔ ہی اس کی صدارت فرماتے۔ مشاعرہ طرحی ہوا کرتا۔ مشاعرے کے لیے عام طور پر وحشتؔ دو غزلیں کہتے تھے۔ ایک افتتاحی اور دوسری طرحی۔ افتتاحی غزل سے مشاعرے کا آغاز ہوتا اور طرحی غزل پر خاتمہ۔ پڑھنے کا انداز انوکھا/مرعوب کن ہوتا۔ ان کے جلالی انداز بیان پر لوگ واہ واہ کرنے پر مجبور ہو جایا کرتے۔ ان کے پڑھنے کے اسی انداز کی وجہ سے انھیں 'طوطیِ بنگالہ' اور 'ساحرِ بنگالہ' کا لقب دیا گیا۔

کلکتے میں وحشتؔ کی صدارت میں بڑے بڑے مشاعرے منعقد ہوئے جن میں ہندوستان بھر کے نامور شعرا نے شرکت کی۔ اسی طرح کے آل انڈیا مشاعرے کا ذکر ہمیں وفاؔ راشدی کی

کتاب 'میرے بزرگ میرے ہمعصر' میں ملتا ہے۔ ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے۔ وحشتؔ کی صدارت میں اسلامیہ کالج کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ جگرؔ مرادآبادی اور ساغرؔ نظامی بھی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے کلکتے آئے ہوئے تھے۔ رات کے تین بجے ساغرؔ نظامی نشے میں چور جھومتے جھامتے مشاعرہ ہال پہنچے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ان کا تازہ مجموعۂ کلام 'بادۂ مشرق' تھا۔ اسی مجموعے سے انھوں نے نظم چھیڑی:

''جوانی کو دیکھا، جوانی کو پوجا، جوانی لٹا دی''

سردی کی رات تھی۔ ساغرؔ بھورے رنگ کی شیروانی میں تھے۔ گلے پر مفلر پڑا تھا۔ وہ اپنے مخصوص مسحور کن ترنم میں پڑھ رہے تھے۔ مے و لے کے امتزاج نے ان پر عجیب کیفیت طاری کر دی تھی۔ مدہوشی کا یہ عالم تھا کہ مفلر کو کبھی داہنے ہاتھ سے اور کبھی بائیں ہاتھ سے کھینچتے اور مصرعے دہراتے جاتے۔ سامعین ان کے کلام سے زیادہ ترنم اور ترنم سے زیادہ ایکٹنگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ مشاعرے پر چھا گئے۔ پیہم فرمائشوں پر مسلسل چند نظمیں 'پجارن، بھکارن' وغیرہ سنائیں۔

(وفا راشدی، میرے بزرگ میرے ہم عصر، ص:۸۸)

وحشتؔ پابندیِ وقت کا بڑا خیال رکھتے۔ انھیں جو وقت دیا جاتا، ٹھیک اسی وقت پہنچتے۔ مشاعرے اکثر اپنے وقت سے تھوڑی دیر میں شروع ہوا کرتے تھے، لیکن وحشتؔ تھے کہ اپنے وقت پر حاضر، جس سے اراکینِ مشاعرہ کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان کی پابندیِ وقت کا ایک واقعہ سنیے۔ ایک دفعہ ہگلی محسن کالج میں وحشتؔ کی صدارت میں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ ہگلی، کلکتے سے تھوڑی دوری پر واقع ہے۔ کلکتے سے بذریعہ ٹرین لوگ وہاں جاتے تھے۔ وحشتؔ اور کلکتے کے دوسرے شعرا کو ٹھیک شام سات بجے کی ٹرین سے جانا تھا۔ تمام شعرا شام سات بجے سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گئے۔ مگر وقتِ مقررہ پر وحشتؔ نہ پہنچ پائے۔ سارے لوگ حیران و پریشان تھے کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ اتنے میں ٹرین بھی چل پڑی۔ ٹرین کے چلتے ہی وحشتؔ بڑی تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیے اور اتفاق دیکھیے کہ ٹرین کسی وجہ سے رک بھی گئی۔ وحشتؔ سوار ہوئے۔ کسی نے کہا کہ مولانا گاڑی تو چل پڑی تھی، لیکن ایسا لگتا ہے کہ صرف آپ کے لیے رک

گئی۔ انھوں نے جو جواب دیا وہ سننے کے لائق ہے۔ انھوں نے برجستہ کہا کہ میں نے ہمیشہ وقت کا لحاظ رکھا ہے، کیا وقت ایک دن میرا لحاظ نہ رکھتا۔

(اظہر قادری، رضا علی وحشتؔ، ص:۱۲/ علامہ وحشتؔ، مضمون از: نظیر صدیقی، مطبوعہ نگار لکھنؤ ۱۹۵۷ء)

وحشتؔ اپنی پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ اسلامیہ کالج کے مشاعرے میں پندرہ منٹ دیر سے پہنچے۔ تاخیر کا سبب ایک سنگین حادثہ تھا۔ اس سنگین حادثے کے باوجود مشاعرے میں شریک ہونا اور تمام رات صدارت کے فرائض انجام دینا وحشتؔ کی فرض شناسی اور صبر و تحمل کا بین ثبوت ہے۔ وہ بڑی سے بڑی مصیبت اور سخت سے سخت پریشانی میں بھی بے چینی کا اظہار یا تقدیر کا گلہ نہیں کرتے تھے، بلکہ جو بھی مصیبت پڑتی، اسے اس طرح پی جاتے، جیسے ان پر کوئی مصیبت پڑی ہی نہیں۔ اسلامیہ کالج کلکتے کا مشاعرہ تقسیمِ ہند سے پہلے ہمیشہ نو بجے شب کو پابندیِ وقت کے ساتھ ان کی صدارت میں شروع ہو جایا کرتا تھا۔ ایک سال کا واقعہ ہے کہ وہ سوا نو بجے تک نہ پہنچے۔ بیخودؔ اور سارے منتظمین مشاعرہ گھبرا گئے کہ خدا جانے کیا ہوا، ورنہ وحشتؔ اور وقت پر نہ پہنچیں ناممکن بات ہے۔ ضرور کسی پریشانی میں گھر گئے ہوں گے۔ اتنے میں وہ پہنچ ہی گئے۔ پابندیِ وقت کی فکر اس طرح دامن گیر تھی کہ آتے ہی حسب معمول پر جلال اور ساحرانہ انداز میں اپنی غزل سے مشاعرے کا افتتاح کیا۔ وحشتؔ جب اپنی غزل سنا چکے اور دوسرے شعرا اپنا کلام سنانے لگے تو بیخودؔ صاحب کو تاخیر کی وجہ پوچھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے فرمایا کہ میرا لڑکا علی اشرف کوٹھے سے گر گیا تھا۔ اسے اسپتال میں داخل کرا کے فوراً آ رہا ہوں۔ ان کی فرض شناسی اور ضبط کی انتہا دیکھیے، اتنا کہہ کر شعرا کا کلام سننے اور داد دینے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور صبح تک اسی طرح بیٹھے رہے۔

(واقعہ بہ زبانِ رضاؔ مظہری، مشمولہ: نساخ سے وحشت تک، ص ص:۱۵۸-۱۵۹)

مشاعرہ وحشتؔ کا ذریعۂ معاش نہیں بلکہ شوق تھا۔ وہ اردو کی خدمت کے لیے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ دولت و ناموری کے بھوکے نہ تھے۔ دور دراز علاقوں سے مشاعروں میں صدارت کے لیے دعوتیں آتیں، مگر قبول نہ ہوتیں۔ شملہ کے ایک دعوت نامے میں یہاں تک رقم تھا کہ آپ آیئے، لوگ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن وحشتؔ نہ گئے ہندوستان کے تمام آل

انڈیا مشاعروں میں شرکت کے لیے درخواستیں کی گئیں۔ یہاں تک کہ صدارتیں بھی پیش کی گئیں لیکن عدیم الفرصتی کا سبب بہانہ بن گیا۔ ایک سال دہلی ریڈیو اسٹیشن سے کل ہند مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ پرانے اساتذہ بلائے گئے، پر وحشتؔ نہ گئے۔ پھر بھی ان کی شرکت اتنی ضروری سمجھی گئی کہ کلکتہ ریڈیو والوں نے ان کی غزل ریکارڈ کر کے بھیجی جو دہلی سے نشر ہوئی۔

(واقعہ بہ زبانِ عباس علی خاں بیخود، مشمولہ: نساخ سے وحشت تک، ص:۱۵۶)

۲۷ر مئی ۱۹۵۰ء میں چٹگانگ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ ایک ذی اقتدار افسر نے ایک خط دعوت نامے کے ہمراہ بھیجا جس میں شرکت کی خواہش ظاہر کی گئی اور چار سو روپے کی رقم بھی پیش کی گئی۔ مگر انھیں نہ جانا تھا نہ گئے۔ (مکاتیب وحشت، ص:۷) ٹھیک اسی طرح ۱۹۳۸ء میں ملک کے معروف ترین شعرا کو باری باری ہز ہائی نس نواب رام پور نے اپنے یہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے بلایا اور سبھوں کے ساتھ عمدہ سلوک بھی کیا۔ وحشتؔ کے پاس بھی دعوت نامہ آیا۔ مگر انھوں نے قبول نہ کیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دعوتیں آتی رہیں اور مسترد ہوتی رہیں۔ آخر کار دربار سے کلکتہ کے رام پور اسٹیٹ کی جائداد کی دیکھ بھال کرنے والے سکریٹری کو فرمان آیا کہ حضرت وحشتؔ کو ہر قیمت پر رام پور تشریف لانے پر آمادہ کیا جائے۔ سکریٹری نے بہت کوشش کی، لیکن وحشتؔ نے پھر وہی عدیم الفرصتی کی وجہ بتا کر جانے سے معذوری ظاہر کر دی۔

(محمود طرزی کے مضمون، مطبوعہ آزاد ہند کلکتہ ۱۹۵۶ء سے ماخوذ، مشمولہ: نساخ سے وحشت تک، ص:۱۵۴)

خان بہادر کا خطاب

وحشتؔ سے بہت پہلے اردو بنگال میں اپنا مقام بنا چکی تھی۔ ضلع ہگلی کے قاضی محمد صادق اخترؔ ملک الشعرا قرار دیے جا چکے تھے۔ نساخؔ کے سامنے اہلِ دہلی و لکھنؤ کی دال نہیں گلتی تھی۔ عصمت اللہ انسخ بھی اپنے فن کا لوہا منوا چکے تھے۔ ابوالقاسم شمسؔ کلکتوی (شاگردِ داغؔ دہلوی) کی شاعری دھوم مچا رہی تھی کہ بنگال کی ادبی فضا میں وحشتؔ نمودار ہوئے اور سب پر سبقت لے گئے۔

وحشتؔ نے بنگال میں شعری و نثری ادب کا چراغ شان و شوکت کے ساتھ جلائے رکھا۔ جس کی روشنی دور دور تک پہنچی اور اس میں اتنی کشش تھی کہ حالیؔ و اقبالؔ کھچے چلے آئے۔ وحشتؔ

صرف شاعر ہی نہ تھے، بلکہ کامیاب استاد بھی تھے۔ ان کے یہاں علم کا دریا بہتا تھا جس سے نہ جانے کتنوں نے فیض پایا۔ انھوں نے مشاعروں، رسالوں اور ادبی اداروں کی سرپرستی کی۔ بحیثیت انسان لوگوں کو اپنے اخلاق سے قائل کیا۔ انسانیت کا پیکر اور سچائی کا زندہ مجسمہ تھے۔ عظیم انسان بھی تھے اور بڑے شاعر بھی۔ انھوں نے جو ادبی اور علمی خدمات انجام دیں، حکومتِ برطانیہ نے انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی خدمات کے صلے میں انھیں ۱۹۲۵ء میں خان صاحب اور ۱۹۳۱ء میں خان بہادر کے ذی قدر خطاب سے نوازا۔

انجمن انیس الاسلام

وحشتؔ نے چند طلبہ کی مدد سے ۱۹۰۱ء میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، جس کا نام 'انجمن انیس الاسلام' رکھا گیا۔ اُس انجمن کے قیام کا مقصد بطورِ خاص طلبہ میں پوشیدہ تحریری و تقریری صلاحیتوں کو ابھارنا تھا۔ انجمن نے بڑی شہرت پائی۔ اُس نے بڑا اثر ڈالا، جس کی افادیت کا جلد ہی لوگوں کو قائل ہونا پڑا۔ اسی انجمن نے بڑی بڑی شخصیتوں کی تربیت کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی اسی انجمن کے تربیت یافتہ تھے۔ اس سلسلے میں خود مولانا ہی کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

> ''۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء کا جلسہ ہوا اور حداثت سن علما سے دو بدو گفتگو کرنے میں مانع نہ ہوئی۔ لیکن تقریر کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ تقریباً اسی زمانے کی بات ہے کہ مولوی رضا علی وحشتؔ اور کچھ نوجوان جن سے شاعری کی وجہ سے کچھ رسم و راہ تھی انھوں نے کڑایا میں ایک انجمن، انیس الاسلام کے نام سے قائم کی۔ مقصود اس سے تقریر و تحریر کے ذوق کی ترویج و ترقی تھا۔ سب سے پہلے باقاعدہ لکچر کی صورت میں مجھے تقریر کرنے کا وہیں اتفاق ہوا۔ ان لوگوں نے مجھ سے شرکت کی درخواست کی اور ایک دن میں پہنچ گیا۔ پہلے سے نہ تو کوئی موضوع خاص معلوم تھا اور نہ تقریر کرنے کا ارادہ تھا۔ محض شرکت مقصود تھی لیکن وہاں لوگوں نے اصرار کیا اور جس موضوع پر ایک دو مقرروں نے تحریر پڑھی تھی میں نے اسی موضوع پر ایک مختصر تقریر کر دی۔ تقریر کا مجمع پر غیر معمولی اثر پڑا۔ اور

لوگوں نے اصرار کیا کہ انجمن کا ایک خاص جلسہ صرف میری تقریر کے استماع کے لیے منعقد ہو۔ چنانچہ ہفتے بھر کے بعد وہ جلسہ منعقد ہوا۔ میں نے مذہب کی ضرورت پر ڈیڑھ گھنٹے تک تقریر کی اور لوگ بے انتہا متاثر ہوئے۔ اس کے بعد مجھے خود بھی زیادہ دلچسپی ہوگئی۔ اس انجمن کے دائرے میں توسیع کرائی اور نسبتاً بڑے بڑے جلسے ہونے لگے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ شہر کے جلسوں میں تقریر کرنے لگا۔ لیکن جو شوق تقریر کا پیدا ہو گیا تھا اس کے لیے یہ میدان کافی نہ تھا۔ طبیعت چاہتی تھی کہ ملک کی مشہور کانفرنسوں اور پلیٹ فارموں پر کھڑا نظر آؤں۔ لہذا کوشش کر کے پہلی مرتبہ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے جلسہ میں جس کے صدر مولانا نذیر احمد تھے شریک ہوا اور لکچر دیا اور لوگوں پر ویسا ہی اثر ہوا جیسا متوقع تھا۔''

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، مولفہ: عبدالرزاق ملیح آبادی، ص ص: ۳۰۵-۳۰۶)

دلکشا انسٹی ٹیوٹ

۱۹۲۰ء میں عابد علی، مولوی خلیل، حسن علی اور عاشق علی جیسے پارک سرکس کے چند نوجوانوں نے ایک ذاتی اسکول کا آغاز اس مقام پر کیا جو آج کل ۸۰- جھاؤتلہ روڈ ہے۔ انھوں نے اس بات کا بھی فیصلہ کیا کہ وہ لوگ اس ادارے سے منسلک لائبریری کا قیام بھی عمل میں لائیں گے۔ اس کارِ خیر میں عابد علی نے نمایاں کردار ادا کیا۔ وحشتؔ جو اس مقام سے بالکل قریب رہا کرتے تھے اس ادارے کی طرف متوجہ ہوئے اور بہت جلد اس کے کاموں میں سرگرم رہنے لگے۔ جلد ہی لائبریری اور اسکول کی شہرت ہمہ گیر ہوئی اور اب منتظمین ادارہ کو جگہ کی قلت کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادارہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ لائبریری کو بمقام ۱۳- دلکشا اسٹریٹ منتقل کر دیا گیا، جبکہ اس اسکول کو جواب تک ترقی یافتہ نائٹ اسکول کی شکل اختیار کر چکا تھا، دوسرے قریبی علاقے ۲۱- دلکشا اسٹریٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ وحشتؔ نے اس لائبریری کا نام دلکشا انسٹی ٹیوٹ رکھا اور سب نے بخوشی اسے قبول کیا۔

۱۹۳۰ء کی ابتدا میں کلکتہ کارپوریشن کے کاؤنسلر ایم - ایم حق کی پرخلوص قیادت میں دلکشا انسٹی ٹیوٹ کی ایک عمارت تعمیر کروانے کے لیے زمین حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایم - ایم حق کی کوششیں رنگ لائیں اور کارپوریشن دس کٹھا زمین بمقام ۱۶- برش گوہا اسٹریٹ پر ادارے کے نام الاٹ کرنے پر راضی ہوگئی۔ یہ وہی زمین ہے جہاں آج کل دلکشا انسٹی ٹیوٹ واقع ہے۔ مختصر مدت ہی میں عمارت کھڑی کی گئی اور اس طرح انسٹی ٹیوٹ اپنے تمام شعبے کے ساتھ ۱۹۳۴ء میں اس نئی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ اس وقت وحشتؔ نے انسٹی ٹیوٹ کے لیے بحیثیت نائب صدر اپنی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۳ء میں دلکشا انسٹی ٹیوٹ کے موجودہ دستور کو ترتیب دیا گیا اور اسی سال اپریل کے مہینے کے آخری ایام میں وحشتؔ کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں انتظامیہ کمیٹی نے اسے منظوری دے دی۔ پہلی مئی ۱۹۳۳ء میں اس ادارے کی رجسٹری کرائی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں وحشتؔ نے اپنی تمام نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ دلکشا انسٹی ٹیوٹ کو عطا کر دیا۔ دلکشا انسٹی ٹیوٹ جسے آج ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ کے نام سے جانا جاتا ہے، جب تک قائم ہے وحشتؔ کی بے لوث ادبی و سماجی/ رفاہی خدمات کی یاد دلاتا رہے گا۔

بزمِ احباب

کسی زمانے میں کلکتے میں خود غرضی کا بڑا زور تھا اور کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہوتا تھا۔ جون ۱۹۰۲ء کی شام کو ایک المناک واقعہ رونما ہوا کہ ایک پردیسی کی چھوٹی سی معصوم بچی الیٹ روڈ میں انتقال کر گئی، مگر اس کے جنازے میں جانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ کسی نے خبر بھی نہ لی، اور نہ ہی جھوٹی ہمدردی ظاہر کی۔ مجبور ہو کر اس پردیسی کا جنازہ ایک گاڑی میں رکھ کر قبرستان لے جانا پڑا۔ سید محبّ الرب رضوی پر اس سانحے کا شدید اثر پڑا اور وہ اسی پریشانی کے عالم میں مسلم ینگ ایسوسی ایشن تشریف لائے اور تمام واقعہ من و عن بیان کیا، سامعین نے متاثر ہو کر ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، جس کا مقصد اس طرح کے واقعات پر بلا تفریقِ مذہب و ملت ایک دوسرے کی مدد کرنا ہوا۔ اس انجمن کا نام 'انجمنِ احباب' رکھا گیا۔ نواب زادہ اے - ایف - ایم عبدالحفیظ حافظ، خلف نواب عبداللطیف انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ گیارہ مزید

ارا کین کا بھی انتخاب کیا گیا۔

اس طرح اس انجمن کی میٹنگ بلا ناغہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے مکان میں ہوا کرتی تھی۔ تمام احباب رات کے بارہ بجے تک لطیفہ گوئی، غزل گوئی اور شعر و شاعری کیا کرتے تھے۔ جون ۱۹۲۰ء سے ستمبر ۱۹۳۳ء تک انجمن کے جلسے ہوتے رہے اور اراکین کی تعداد میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ مگر ۸/ ستمبر ۱۹۳۳ء کے جلسے میں انجمن کی پالیسی بدلی اور پھر اراکین کی تعداد میں اضافہ کیا گیا جن میں نصیرالدین خندکار بھی چودھویں نمبر پر تھے۔ حافظ مرحوم کی موت انجمن کی محفل میں غزل سناتے سناتے ہوئی تھی۔ فاتحہ خوانی کے بعد دوسرے جلسے میں سید محمد صادق کا انتخاب نئے صدر کی حیثیت سے ہوا اور انھوں نے ہی اس انجمن کا نام 'انجمنِ احباب' کی جگہ 'بزمِ احباب' رکھا اور باضابطہ سراج بلڈنگ کے ایک کمرے میں اس کا دفتر قائم ہوا، مگر اس دور میں انھوں نے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۶ء تک صدارت بھی کی۔ پھر ۱۹۴۱ء تک دوبارہ صدر ہوئے اور بزم کا دفتر ۳۹ بنیا پوکھر لین میں نصیرالدین خندکار کے مکان پر قائم ہوا۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ کہتے ہیں:

"بزمِ احباب کلکتہ کو اس بات پر بجا طور پر فخر ہے کہ رضا علی وحشت ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۶ء اس بزم کے صدر رہے اور انھوں نے اپنی کئی غزلیں 'بزمِ احباب' کے مختلف جلسوں میں سنائی ہیں:

ثمرِ آرزوے وحشت و ناطق تھی یہ بزم
ایک گلدستۂ یارانِ موافق تھی یہ بزم"

(یادگار وحشت، کلکتہ، مرتبہ: اسحاق راشد، ص: ۶۶)

وحشت اور کلکتہ

کلکتہ نہ صرف مغربی بنگال کا سب سے بڑا شہر ہے بلکہ اس کا شمار دنیا کے عظیم شہروں میں ہوتا ہے۔ یہ شہر صنعتی اور تجارتی اعتبار سے ہندوستان بھر میں اپنی مثال آپ ہے۔ صنعتی اور تجارتی منڈی ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ آکر یہاں بس گئے، بلکہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کے باشندے کلکتے میں موجود نہ ہوں۔ کلکتہ انگریزی حکومت کی ابتدا سے غالباً

۱۹۱۲ء تک ہندوستان کا پایۂ تخت رہا۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر اس شہر کے دامن میں ہندوستان کے کونے کونے سے لاکھوں اردو داں بھی چلے آئے۔ اس طرح فورٹ ولیم کالج کے وقت سے کلکتہ بھی اردو ادب کا ایک مرکز بن گیا۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان کے کسی شہر کو جدید ہندوستان کا تاریخی شہر قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ کلکتہ ہے۔ یہی وہ شہر ہے جو ہندوستان میں انگریزوں کا اول پایۂ تخت بنا اور جہاں سے یورپی/ سائنسی علوم، تہذیب و تمدن، سماجی اور سیاسی تحریکیں نمودار ہوئیں اور پورے ہندوستان پر چھا گئیں۔ یہ شہر واقعی جدید ہندوستان کا معمار ہے۔ یہ وہی پرکشش شہر ہے جس کی طرف بے شمار شعرا و ادبا کھچے چلے آئے۔ یہ وہی کلکتہ ہے جس کا ذکر آتے ہی مرزا غالب ہائے ہائے کیا کرتے تھے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

منّی بائی حجاب جو کلکتے کی طوائف اور اچھی شاعرہ بھی تھی، اور جس سے داغ دہلوی کے عمیق مراسم بھی تھے، جب وہ رامپور سے داغ سے رخصت ہونے لگی تو اپنے شہر سے متعلق اظہار خیال جن الفاظ میں کیا، انھیں داغ نے عمدگی سے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ وہ صرف الفاظ نہیں تھے، بلکہ دعوتِ نظارۂ کلکتہ تھے:

زر سے معمور ہے ہمارا شہر — کون سا دوسرا ہے ایسا شہر
ہے حکومت کی شان کلکتہ — سلطنت کا نشان کلکتہ
انتخابِ زماں ہے کلکتہ — فخرِ ہندوستاں ہے کلکتہ

(مثنوی فریادِ داغ، حیدرآباد، ۱۹۵۶ء، ص: ۱۰۷)

داغ نے حجاب کی دعوت قبول کی۔ حجاب کی جدائی اور کلکتے کی کشش نے انھیں بے قابو کر دیا۔ انھوں نے کلکتے کا قصد کیا اور اپنی آمد کے تعلق سے فرمایا:

سوئے کلکتہ میں روانہ ہوا — دور تک ساتھ اک زمانہ ہوا
شوق بے اختیار لے ہی گیا — یہ دلِ بے قرار لے ہی گیا

آئی ایسی ہوا ئے کلکتہ — دل پکارا کہ ہائے کلکتہ
شہر میں دھوم تھی کہ داغؔ آیا — داغؔ آیا تو باغ باغ آیا

(مثنوی فریاد داغ، حیدر آباد، ۱۹۵۶ء، ص:۱۳۴)

خدا جانے اس شہر میں کیا بات ہے کہ جو بھی یہاں آیا، یہیں کا ہو کر رہ گیا، یا پھر اُسے دل پر پتّھر رکھ کر لوٹنا پڑا۔ یہاں کی مٹی میں مسلمانوں کے تہذیبی رشتے پیوست ہیں۔ یہ عروس البلاد، محلوں اور جلوسوں کے شہر کے علاوہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔ علم و دانش کا یہ شہر اپنی تہذیب اور تمدن کے حوالے سے پورے ایشیا میں منفرد وقار رکھتا ہے۔ کلکتے کی تاریخی حیثیت سے قطع نظر اس کی تہذیبی اور ادبی حیثیت کا اگر ہم جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ شاعرِ اعظم فخرِ ہندوستان رابندر ناتھ ٹیگور یہیں پیدا ہوئے تھے اور یہی ان کا وطن تھا۔ شاعرِ بغاوت و انقلاب قاضی نذر الاسلام کا تعلق بھی اسی دیار سے تھا۔ ان کے علاوہ عظیم فنکاروں اور قلم کاروں کی ایک ٹولی یہاں بستی ہے۔ اُنہی میں طوطیِ بنگالہ علامہ رضا علی وحشتؔ جیسا بلند مرتبہ شاعر بھی شامل ہے۔ اردو کے معروف شاعر حرمت الاکرام فرماتے ہیں:

ٹیگور کا دیار یہ وحشتؔ کی سرزمیں
یہ نذرل اور شوباس کی عظمت کی سرزمیں
یہ علم و فن کی، دانش و حکمت کی سرزمیں
یہ گیسوؤں کا شہر، ملاحت کی سرزمیں
وہ شہر جس نے شاہِ اودھ کو پناہ دی
اپنا بنا کے وضعِ مروت نباہ دی

(کلکتہ اک رباب، مرزاپور، ۱۹۶۶ء، ص ص:۴۲-۴۳)

حرمت الاکرام نے کلکتے کو جس طرح دیکھا، من و عن پیش کر دیا۔ آگے کہتے ہیں:

اک خوش گوار کرب میں کھویا ہوا یہ شہر
جاگا ہوا کبھی، کبھی سویا ہوا یہ شہر
قاتل لطافتوں میں ڈبویا ہوا یہ شہر

ہنگاموں کی لڑی میں پرویا ہوا یہ شہر
یہ شہر ایک آئینہ خانہ حیات کا
کہتا ہے روز تازہ فسانہ حیات کا

(ایضاً، ص:۶۴)

کلکتے کی شعری فضا میں آج بھی نساخ، ٹیگور، نذرل، وحشت، ناطق، آرزو، قمر، جرم، بیخود، آصف، واصف، شاکر، جمیل مظہری، پرویز شاہدی وغیرہ کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ فضائے بنگالہ آج بھی وحشتؔ کی غزلوں سے سرشار ہے۔ وحشتؔ کلکتے میں پیدا ہوئے۔ یہیں ان کی پرورش ہوئی۔ یہیں انھوں نے تعلیم پائی۔ یہیں وہ جوان ہوئے۔ یہیں بحیثیت شاعر انھوں نے اپنی شناخت بنائی اور یہیں ۱۹۱۰ء میں ستارۂ ہند پریس سے 'دیوانِ وحشتؔ' کی اشاعت بھی ہوئی۔ وحشتؔ نے اس شہر کے گلی کوچوں میں کھیلا تھا۔ وہ اس شہر کی سڑکوں پر چلے تھے۔ وہ کسی دہلی اور لکھنؤ کے نہیں بلکہ اسی شہر دل نواز کی زلفوں کے اسیر تھے۔ آخری چند ایام کو چھوڑ کر انھوں نے اپنی ساری زندگی کلکتے ہی میں گزاری۔ کل بھی کلکتہ وحشتؔ کا دیار تھا، آج بھی کلکتہ وحشتؔ کا شہر ہے۔ مشاعرے ہوں یا ادبی نشستیں یا پھر احباب کے جلسے، وہ ہر رنگ سے ان میں شریک رہا کرتے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ کلکتے سے انھیں عشقِ صادق تھا۔ وہ کلکتے کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

عزیز ہے مجھے کلکتہ اور اس کا سواد
بہل ہی جاتا ہے جس میں مرا دلِ ناشاد
یہ وہ قفس ہے کہ جس پر ہو آشیاں قرباں
خوشی سے اس میں گرفتار ہوتے ہیں آزاد

(ترانۂ وحشتؔ، لاہور، ۱۹۵۳ء، ص:۱۵۳)

وحشتؔ اپنے شاگرد ظفر ہاشمی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''آپ مجھے پنجاب بلانے کا خیال رکھتے ہیں! عزیزی یہ ایک خیال ہے اور خیالِ خام۔ میں کہ اپنے شہر کے مشاعروں سے اور شعرا کی صحبت سے بھاگتا ہوں پنجاب کا قصد کروں!'' (مکاتیب وحشتؔ — ص:۷۷)

کلکتے سے انھیں اتنی محبت تھی کہ پورے ہندوستان سے مشاعروں میں شرکت کی درخواستیں آتیں، مگر وہ انکار کر دیتے۔ وہ کسی حال میں کلکتہ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ صرف ایک بار ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ آل انڈیا مشاعرے میں صدارت کرنے کی غرض سے کلکتے سے باہر تشریف لے گئے۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد پھر کبھی وہ بنگال سے باہر نہیں گئے، لیکن تقسیم وطن کے بعد حالات سے مجبور ہو کر انھیں ہجرت کرنی پڑی اور وہ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وطن کا چھوٹنا ان کے لیے قیامت ہو گیا اور انھیں کہنا پڑا:

وطن اور وہ بھی کلکتہ غضب تھا چھوڑ نا اس کا
قیامت ہو گئی وحشتؔ سے وحشتؔ کا وطن چھوٹا

ہجرت

۱۹۴۶ء سے ملک میں فسادات نے سر اٹھانا شروع کیے۔ باغیانہ میلانات تیزی سے بڑھنے لگے۔ انگریزوں کے خلاف سخت محاذ آرائیاں شروع ہوئیں۔ عدمِ تشدد اور تشدد کے امتزاج سے ایسے ماحول کی تشکیل ہوئی جس میں آزادی کے جذبے پروان چڑھنے لگے۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں۔ لوگوں نے سنہرے ہندوستان کا خواب دیکھا، لیکن نتیجہ برعکس نکلا اور سنہرے ہندوستان کا خواب پارہ پارہ ہو گیا۔ بظاہر ہندوستان کو آزادی تو مل گئی، مگر وہ سکون نہ ملا جس کی توقع لوگوں نے کی تھی۔ ملک تقسیم ہو گیا اور یہ صرف زمینوں کی تقسیم نہیں تھی، بلکہ لاکھوں دلوں کی تقسیم تھی۔ کبھی نہ ختم ہونے والے رشتوں کی تقسیم تھی۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہندوستان کو آزادی راس نہ آئی۔ آزادی، باہمی نفرت میں بدل گئی۔ تقسیم وطن کے اس عظیم سانحے نے ہزاروں دلوں کو دہلا کر رکھ دیا، انسانیت لرز اٹھی اور صدیوں کے اتحاد کا شیرازہ پل بھر میں بکھر گیا۔ نانک اور چشتی کی سرزمین خون سے سرخ ہو گئی۔ لوگ صدیوں تک کندھے سے کندھا ملا کر حب الوطنی کے گیت گاتے رہے، لیکن تقسیم کے المیے کے بعد ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ مذہب کی اساس پر آگ اور خون کے رقص کا وہ مظاہرہ کیا گیا جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فسادات کی تباہ کاریوں سے ملک کمزور ہو گیا۔ فرقہ پرستی کی لرزہ خیز آندھی نے ایک

ملک کے نہیں ایک تہذیب کے پرخچے اڑا ڈالے۔

اب لوگ ہجرت کر کے پاکستان جا رہے تھے۔ وحشتؔ نے بھی ان حالات کا غیر معمولی اثر قبول کیا۔ ان کے ساتھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ انھیں بھی ہجرت کرنی پڑی۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے اس شہر کو خدا حافظ کہا جہاں ان کی نہ صرف ولادت ہوئی تھی بلکہ ساری زندگی گزری تھی۔ اب وہ ضعیف ہو چکے تھے۔ ضعیفی اور ناتوانی کے عالم میں انھوں نے اس دیار کو چھوڑا۔ ان کے جانے کے بعد مجلسیں اور انجمنیں ویران ہو گئیں۔ وہ کلکتے کی جدائی برداشت نہ کر سکے۔ مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ پہنچتے ہی بیمار پڑ گئے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''وہ خلوص جو مجھے کلکتے کے محبانِ عزیز میں ملتا تھا ان کا یہاں فقدان ہے۔ تکلف کی ملاقاتیں دل کو راحت نہیں پہنچاتیں۔ کلکتہ کی بات کلکتہ کے ساتھ رہ گئی۔''

(مکاتیب وحشتؔ — ص:۱۲)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''کلکتہ کے مشاعروں کا ذکر سن کر ایک حسرت آمیز خیال دل میں آیا۔ کلکتہ میں باہر کے شعرا آ کر شریک ہوں اور وحشتؔ وہاں موجود نہ ہو!''

(مکاتیب وحشتؔ — ص:۱۳)

شاگردوں کی محبتیں، عقیدت مندوں کی ملاقاتیں اور احباب کی صحبتیں ڈھاکے میں کہاں تھیں۔ ہجرت انھیں راس نہ آئی۔ کلکتے کا چھوٹنا ان کے لیے قیامت ہو گیا:

زمینِ ڈھاکہ نے کی قلب پر افسردگی طاری
ہوا خلوت نشیں میں اور شوقِ انجمن چھوٹا
وطن اور وہ بھی کلکتہ غضب تھا چھوڑنا اس کا
قیامت ہو گئی وحشتؔ سے وحشتؔ کا وطن چھوٹا

قیامِ ڈھاکہ

وحشتؔ نے غالباً ۱۳؍اپریل ۱۹۴۹ء اور ۱۰؍جنوری ۱۹۵۰ء کے درمیان ہجرت کر کے مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس وقت ان کی عمر کم وبیش ستّر (۷۰) برس کی ہو چکی تھی۔ پاکستان جانے سے پہلے ہی ان کا جسم کمزور ہو چلا تھا۔ پاکستان جانے کے بعد ان کی صحت تیزی سے گری۔ پھر بھی جب تک وہ آنے جانے سے معذور نہ ہوئے تھے، مشاعروں، ادبی نشستوں اور دوستوں کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ پروفیسر بیخودؔ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں الحمدللہ باوجود ناتوانی جو کام آپڑتا ہے کر لیتا ہوں۔ چنانچہ یومِ اقبال کے عظیم الشان مشاعرے کی صدارت بھی کی۔ اس سے پہلے ایک مشاعرہ بخاری کے اعزاز میں شادانی کی طرف سے ہوا تھا اس کی بھی صدارت کی اور دونوں مشاعرے طولانی تھے۔'' (مکاتیب وحشتؔ — ص ص:۱۲-۱۳)

قیامِ ڈھاکہ کے دوران یومِ پاکستان کے موقعے پر ایک زبردست مشاعرہ ہوا۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ ہاؤس میں بھی ایک مشاعرہ ہوا۔ دونوں مشاعرے انھیں کی زیرِ صدارت ہوئے جن میں جگرؔ مرادآبادی بھی شریک تھے۔ آئے دن مختصر صحبتیں ہوتی رہتی تھیں اور انھیں شریک ہونا پڑتا تھا۔ جب دائرۂ ادب ڈھاکہ کا شاندار مشاعرہ ہوا تو اس کی صدارت بھی وحشتؔ ہی کو کرنا پڑی۔ ڈاکٹر شادانی بھی شریک ہوئے اور مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ اس صحبتِ خاص سے متاثر ہو کر ڈاکٹر شادانی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس سے بہتر صحبت (مخصوص لوگوں کی) اس سے پہلے ڈھاکے میں نہیں ہوئی تھی۔ ایک دفعہ مولانا تمنا عمادی نے علامہ چڑیا کوٹی اور وحشتؔ کی دعوت بھی کی جس میں خوب خوب شعر خوانی ہوئی۔ اسی طرح کی ایک محفل کا ذکر ۳۰؍جنوری ۱۹۵۱ء کے اپنے مکتوب میں وہ کرتے ہیں:

''جی ہاں میں اخترؔ پشاوری کے مکان پر جہاں دائرۂ ادب ڈھاکہ کا مشاعرہ ہوا تھا شریکِ محفل تھا۔ درد ہاتھ میں اپنی جگہ پر تھا لیکن صحبتیں ہوتی ہیں اور شرکت لازمی ہو جاتی ہے چنانچہ اسی مشاعرہ ہی کے دن فضلیؔ صاحب کے مکان میں ڈنر

میں شامل ہونا پڑا۔ اور پھر وہاں بھی کچھ شعر وشاعری ہوئی۔ ڈنر سائنس کانفرنس کے چند ممبروں کے اعزاز میں ہوا تھا۔'' (مکاتیب وحشتؔ — ص ص:۱۰-۱۱)

پھر چاٹگام میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا۔ انھیں لے جانے کی بہت کوشش کی گئی جو ناکام ثابت ہوئی۔ اس مشاعرے کے سلسلے میں جگرؔ بھی آئے ہوئے تھے۔ مشاعرے کے بعد جگرؔ سیدھے وحشتؔ کے دولت کدے پر حاضر ہوئے اور ایک تازہ غزل بھی سنائی۔

ڈھاکے میں لاکھ صحبتیں ہوتی رہیں، لیکن کلکتے کو وہ بھلا نہ سکے۔ کلکتہ ان کے ذہن ودل کے نہاں خانے میں ہمیشہ محفوظ رہا۔ کلکتے سے ان کی ذہنی اور جذباتی وابستگی کا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد لکھے جانے والے اکثر مکاتیب ہجرت کے دلی کرب کے غماز ہیں۔ ڈھاکے میں ان کی طبیعت اتنی اکتائی ہوئی رہتی تھی کہ لوگوں سے ملنے جلنے میں بھی پریشانی محسوس کرتے تھے۔ بیخودؔ صاحب کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''رمضان کا مہینہ مبارک ہے کہ اس میں مشاعرے نہیں ہوتے۔ مجھے آرام ملتا ہے۔ یہاں اس مہینے میں کم لوگ دوست احباب سے ملنے کو نکلتے ہیں اور یہ بھی میرے لیے راحت کا سبب ہے کیوں کہ ان رسمی ملاقاتوں میں مجھے مزا نہیں آتا جن سے ملنا میری دلی مسرت کا باعث ہوتا ہے انھیں تو میں کلکتہ میں چھوڑ آیا۔''

(مکاتیب وحشتؔ — ص ص:۲۵-۲۶)

اپنے قیامِ ڈھاکہ سے متعلق ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''جہاں میں رہتا ہوں وہاں سڑکیں اچھی ہیں اور دور دور تک چلی گئی ہیں۔ میں صبح سویرے سیر کو نکل جاتا ہوں۔ منظر خوش نما پیشِ نظر ہوتا ہے۔ کوئی آدھ گھنٹہ آہستہ آہستہ چلتا ہوں۔ دن بھر بستر پر پڑا رہتا ہوں۔ ملنے والے اکثر شام کو آجاتے ہیں۔ قمرؔ صاحب مکرر آتے رہتے ہیں۔ طرزیؔ صاحب دو بار آئے۔ اشکؔ صاحب دو بار آئے۔ ڈاکٹر شادانی ایک بار آئے۔ فضلیؔ صاحب دو بار آئے۔ آغا طاہر شمس العلماء محمد حسین آزادؔ کے پوتے جو ڈھاکہ آئے ہوئے ہیں، ڈاکٹر شادانی کے ساتھ آکر ملے۔ میں خود گھر سے کم نکلتا ہوں نقل وحرکت

سے گھبراتا ہوں۔'' (مکاتیب وحشت — ص ص:۶-۷)

وطن کے چھوٹنے کا غم انھیں مسلسل کھائے جاتا تھا۔ ہجرت کے بعد کے اپنے مکاتیب میں انھوں نے اکثر اپنی ضعیفی، آنکھوں کی کمزوری، ناتوانی و لاغری، ذیابطیس کے مرض اور دوسری بیماریوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ایک طرف پاگل بیٹے کی موت، اور دوسری طرف وطن سے ہجرت کی وہ تاب نہ لا سکے۔ احباب بھی داغِ مفارقت دیتے جا رہے تھے اور خود ان کی صحت بھی جواب دے رہی تھی۔ ان کی آخری عمر کی کہانی خود انہی کی زبانی سنیے:

''میری ناتوانی اب زوروں پر ہے۔ اعصاب اپنے کام انجام نہیں دیتے اور دماغ بھی بے دماغی کرنے لگا ہے۔'' ——— ''مجھے ضعف و ناتوانی نے بہت عاجز کر رکھا ہے۔'' ——— ''.........کنٹرولر کلکتہ کی جگہ کنٹرولر ڈھاکہ جو میں نے لکھ دیا تھا اس سے وحشت کی وحشت مسلم ہوگئی! میں الحمدللہ اچھا ہوں۔ خط کے اختصار کا باعث یہ ہے کہ لکھنا کچھ مشکل سا ہو گیا ہے۔ داہنے بازو میں کئی دن سے درد ہے۔ دوا کی مالش کی جا رہی ہے اور امید ہے کہ ایک آدھ ہفتے میں زائل ہو جائے۔'' ——— ''نعمانی کی موت نے میری افسردہ طبیعت کو اور بھی افسردہ کر دیا ہے۔ دن بھر بستر پر پڑا رہتا ہوں۔'' ———

''بہت افسردہ ہو کر وحشت آزردہ جاں رویا

ایک بجلی سی دل پر گری ہے۔ طاقت نہیں ہے کہ کچھ لکھ سکوں۔ 'مورننگ نیوز' کی خبر بجنسہ روانہ کر دیتا ہوں۔ خوب سر پیٹیے اور ماتم کیجیے۔'' ——— ''میری صحت بہت اطمینان بخش نہیں ہے لیکن باعث تشویش بھی نہیں ہے۔ چہرے پر جھریاں نہیں ہیں لیکن پیری اپنا کام کیے جا رہی ہے۔ ٹانگیں بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ زیادہ تر بستر پر پڑا رہتا ہوں۔'' ——— ''میں اب صرف زندہ ہوں۔ نقل و حرکت بدقت ہی ممکن ہے۔ رکشا تک کی سواری بمشکل ہوتی ہے۔ ہوائی جہاز کے سفر کا کیا ذکر۔ اب ایک ہی سفر رہ گیا ہے جس کے لیے زادِراہ بھی ساتھ نہیں ہے!'' ——— ''میں اب مشاعروں کی شرکت کے لیے اپنے میں

طاقت بالکل نہیں پاتا۔ اگر کالج کے مشاعرے کی صدارت کے لیے نامزد نہ کیا جاؤں تو بہتر ہے۔ یہ میں اپنے دل پر جبر کر کے لکھتا ہوں۔'' ——— ''اب چند سطور بھی لکھنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ پنشن کے لیے کیونکر کلکتہ جا سکوں گا۔ ضعف حد سے بڑھ گیا ہے۔'' ——— ''میرے غیر معمولی اضمحلال کے لیے آپ نے باقاعدہ معالجہ تجویز کیا ہے۔ اور آپ کی رائے سے مجھے اتفاق ہے۔ میں تو پیٹنٹ دواؤں کا سہارا لیے تھا۔ لیکن علی حسن سلمہ نے ڈھاکہ کے ایک نامی ڈاکٹر کو بلایا۔ مرض ذیابطیس ہے جس کا علاج مکرر انجکشنوں سے کیا جاتا ہے۔ اگرچہ فائدہ عارضی ہوتا ہے۔ میں نے انجکشن لینے سے انکار کیا جس کا اثر صرف یہی ہوتا ہے کہ شکر کا پیشاب کے ساتھ آنا عارضی طور پر بند ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے میرے لیے ایک دوا تجویز کی جس کا میں نے ایک مہینے تک استعمال کیا اور کھانے میں ایسی سخت پرہیز کی قید لگائی کہ ضعف حد سے بڑھ گیا۔ بدن دبلا ہو گیا۔ رہی سہی طاقت جاتی رہی۔ اب علی حسن نے علاج بند کرا دیا ہے۔ اور کل سے کبیراجی علاج شروع ہوا ہے۔ دیکھیے کہاں تک فائدہ ہوتا ہے۔'' ——— ''ذیابطیس کے مرض میں کبیراجی علاج سے کچھ فائدہ ہوا ہے۔ مگر یہ مرض ایسا موذی ہے کہ طاقت گھٹاتا رہتا ہے۔ مقوی دواؤں کا استعمال بہت جاری ہے۔'' ——— ''آپ ڈھاکہ آئے تھے۔ اس کی مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔ ہوتی کس طرح اب میں خود عزلت گزیں ہوں اور احباب اس اندیشہ سے کہ ان کی تشریف آوری میری عزلت میں خلل افگن ہوگی دور رہنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ ع نہ تم ملنے پہ آمادہ نہ میں ملنے کے قابل ہوں۔'' ———

''خط لکھنا بھی مشکل ہو گیا ہے کیوں کہ ہاتھ کانپتا ہے اور جو لکھتا ہوں صاف دکھائی نہیں دیتا۔'' ——— ''میرا ضعف اب حد سے بڑھ گیا ہے۔ پنشن لینے کو کلکتہ نہ جا سکا۔ جس سے اپنے کو تکلیف میں ڈالا ہے۔'' ——— ''فرنچ دوا کے استعمال سے مرض ذیابطیس میں بہت فائدہ ہوا ہے۔ لیکن کمزوری بدستور باقی ہے۔ نقل و حرکت مشکل نوشت و خواند مشکل غرض مشکل ہی مشکل کا سامنا رہتا ہے۔'' ——— ''بستر سے اٹھنے میں تین چار منٹ کی کوشش ضرور

ہوتی ہے۔ بیٹھتا ہوں تو بے سہارے کے اٹھ نہیں سکتا۔ ضعف بصارت سے نوشت و خواند بمشکل ہی ممکن ہے۔ بس زندہ ہوں۔'' (مکاتیب وحشت، ص ص: ۱۲۷—۲—۵—۶—۵—۱۳—۳۰—۳۸—۴۰—۴۱—۴۳—۱۲۶، ۱۲۷—۶۶— ۶۶—۶۸—۱۱۲)

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں وحشت کی شکل میں ایسا انسان نظر آتا ہے جس کی زندگی خوشیوں کے ساتھ غم والم کے طویل سلسلے پر مشتمل ہے۔ ان جملوں میں وحشت نے بار بار اپنے بڑھاپے اور شدید کمزوریوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک طرف انھیں کلکتے کے چھوٹنے کا غم اندر ہی اندر کھا رہا تھا دوسری طرف پیری نے کہیں کا نہ رکھا۔ مکرر اس طرح کے جملے کہتے نظر آتے ہیں کہ ''مشکل ہی مشکل کا سامنا رہتا ہے۔'' ''بس زندہ ہوں۔'' ''دن بھر بستر پر پڑا رہتا ہوں۔'' ''میں اب صرف زندہ ہوں۔'' ''اب ایک ہی سفر رہ گیا ہے جس کے لیے زادِ راہ بھی ساتھ نہیں ہے!'' انھیں ہر طرف سے امراض نے گھیر رکھا تھا۔ ملنا جلنا موقوف ہوا اور دواؤں پر زندہ تھے۔ ہجرت کے بعد بھی وہ کئی دفعہ کلکتے آئے۔ آخری بار وہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں کلکتے تشریف لائے۔

وفات

وحشت نے پچھتّر سال کی عمر پائی۔ وہ جب تک زندہ رہے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ عمر کے آخری ایام میں ذیابطیس جیسے موذی مرض کا شکار ہوئے۔ یہ مرض کبھی کم ہو جاتا اور کبھی شدت اختیار کر لیتا۔ آخر کار یہی بیماری ان کی موت کا سبب ہوئی۔ انھوں نے ۲۰؍ جولائی ۱۹۵۶ء بمطابق ۱۱؍ ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ بروز جمعہ گیارہ بجے شب داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ہر شعبے اور طبقے کے لوگ کثیر تعداد میں جنازے میں شریک ہوئے۔ عقیدت/محبت رکھنے والوں کے لیے ان کی تدفین کا منظر بڑا ہی دل خراش تھا۔ جنازے کی نماز مولانا تمنا عمادی پھلواری نے پڑھائی اور مرحوم کو ڈھاکے کے عظیم پورہ قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ برسات کے موسم میں عظیم پورہ قبرستان کا ایک تہائی حصہ غرقاب ہو جاتا ہے اور ساری زمین اس درجہ نم ہو جاتی ہے کہ دو ہاتھ کھود نے سے پانی نکل آتا ہے۔ وحشت کی قبر کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اگر چہ ان کے جنازے

کو پانی میں رکھنے کے بجائے کیلے کے تنوں پر رکھا گیا لیکن اس سے پہلے کہ قبر بند کی جاتی، کیلے کے تنے اور جنازے کا نچلا حصہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ (نساخ سے وحشت تک، ص: ۱۶۵) وحشت اردو زبان و ادب کے روشن چراغ تھے جو ۲۰؍ جولائی ۱۹۵۶ء کو ہمیشہ کے لیے بجھ گیا:

مل گئی وحشتِ دیوانہ کو تھوڑی سی زمیں
اب وہ ہنگامہ سرِ کوچۂ جاناں نہ رہا!

قطعاتِ تاریخِ وفات:

امیر الاسلام شرقی تلمیذ ارشد وحشت نے یہ قطعۂ تاریخ کہا جو مرحوم کے لوحِ مزار پر کندہ ہے:

شاہِ تغزل، پیکرِ شفقت — بود فرشتۂ خصلت وحشت
شرقی، سالِ وصالش ہاتف! — گفت، بہار جنت و حشت
۱۳۷۵ھ

امیر الاسلام شرقی کے علاوہ بھی بہت سے نامور شعرا نے قطعاتِ تاریخِ وفات کہے۔ شاکر کلکتوی اور حفیظ ہوشیار پوری کے قطعات پیش کیے جاتے ہیں:

قطعۂ تاریخ وفات

از: شاکر کلکتوی

وہ جن کو خسروئے اقلیم شعر کہتے تھے — وہ جن کا میں ہوں اک ادنیٰ غلام بے قیمت
وہ جن کی ذات پہ تھا فخر اہل عالم کو — ہوئی وہ ذاتِ گرامی جہان سے رخصت
دل ان کا صدق و صفا کا تھا ایک آئینہ — وہ اپنے جوہرِ ذاتی سے تھے فرشتہ صفت
زمانہ ایک زمانے تک ان کو روئے گا — دلوں سے محو نہ ہوگا ابھی غم فرقت
یہ مجھ سے دل نے کہا سال عیسوی شاکر — لکھو جدا ہوئے آقا رضا علی وحشت
۱۹۵۶ء

از: حفیظ ہوشیار پوری

شیریں کلام وحشتؔ، تاریخ زندگانی
تاریخِ مرگِ وحشتؔ، شیریں کلام وحشتؔ
۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء

وحشتؔ کی وفات پر متعدد مرثیے بھی لکھے گئے۔ ان کی وفات پر سالکؔ لکھنوی نے مرثیہ لکھا تھا۔ سالکؔ صاحب وحشتؔ کے قریب رہے تھے۔ اسی لیے ان کی موت سے انھیں زیادہ رنج ہوا۔ میں نے سالکؔ صاحب سے اپنی ایک خصوصی ملاقات میں وحشتؔ کا ذکر چھیڑا تھا۔ میرے اکسانے پر فرمانے لگے کہ وحشتؔ واقعی بڑے نیک انسان تھے مگر ان کے شاگردوں نے ان کی قدر نہیں کی۔ یہاں تک کہ ان کی وفات پر کسی نے مرثیہ تک نہیں لکھا۔ یہ کہہ کر اپنا مجموعۂ کلام 'کلام' کھول کر دکھانے لگے اور اس کے بعد کا بیان خود ان ہی کے الفاظ میں:

''جب وحشتؔ کا انتقال ہوا تو ان کے کسی شاگرد نے ان کا مرثیہ نہیں لکھا لیکن میں نے لکھا اور جب میرا مرثیہ روزنامہ 'آزاد ہند' کلکتہ کے پہلے صفحے پر شائع ہوا تو جمیلؔ مظہری نے یہاں تک کہہ دیا کہ سالکؔ صاحب کے بعد اب اور کوئی کیا لکھے گا۔''

مگر سالکؔ صاحب کا بیان لاعلمی یا حافظے کی کمزوری پر مبنی ہے۔ ان کے علاوہ بھی مرثیے لکھے گئے۔ یہاں سالکؔ صاحب کا مرثیہ نقل کیا جاتا ہے جو ان کے شعری مجموعہ 'کلام' میں شامل ہے:

ماتمِ وحشتؔ

بات کیا ہے کہ ہے جہاں خاموش
گل فسردہ ہیں گلستاں خاموش
آج خاموش سازِ غالبؔ ہے
آج مومنؔ سا نکتہ داں خاموش
بیدلؔ و صائبؔ و حزیںؔ چپ ہیں
آج عرفیؔ کی ہے فغاں خاموش
آج سکتہ میں ہے زبانِ امیرؔ

شوخیِ داغؔ گل فشاں خاموش
آج بیخودؔ کی بیخودی گم ہے
آج طرزیؔ کی ہے زباں خاموش
ہوشؔ کو آج اپنا ہوش نہیں
آصفؔ از مرگِ مہرباں خاموش

آج گلشن سے رخصتِ گل ہے
غم ہے اتنا، خموش بُلبُل ہے

آج سکتے میں ہیں رضاؔ و جمیلؔ
بجھ گئی آج عشق کی قندیل
آج خاور سے پھر ملی ہے کرن
پا گئی صورتِ وفا تکمیل
زندگی انتظارِ وصل میں تھی
موت حاسد تھی کر گئی تعجیل
اور دنیائے حسن و الفت میں
پھنک گیا جیسے صورِ اسرافیل
منتظر اہلِ کارواں تھے یہاں
دور سے آئی ہے صدائے رحیل
راہیں منزل کی بہکی جاتی ہیں
سالکِؔ کارواں ہے بے قندیل

عقل کو آرزوئے وحشتؔ ہے
راہ کو جستجوئے وحشتؔ ہے

بزم ہستی میں اب نہیں وحشتؔ
آج سُونی خرد کی محفل ہے
کارواں شوق کا ہے بے رہبر

دور کتنی پھر آج منزل ہے
کشتی ٹکرا رہی ہے موجوں سے
ناخدا باریابِ ساحل ہے
دل کو ٹھہرا نا اس کی یادوں سے
کتنا آساں ہے کتنا مشکل ہے
تارو سوزن کا اہتمام کرو
پھر وہی شکل پیشِ محفل ہے
ہے کسے ہوش جیب و دامن کا
بے جنوں آج بھی کوئی دل ہے؟

فیضِ وحشتؔ سے دل ہیں دیوانے
کتنے آباد ہیں یہ ویرانے

وحشتؔ خوش نظر کا ماتم ہے
دہر میں دیدہ ور کا ماتم ہے
ہائے کس وقت اس کو پہچانا
اپنی اپنی نظر کا ماتم ہے
موجِ شعر و ادب ہے نوحہ کناں
ایک فن کار گر کا ماتم ہے
ہے نظر پھر اسیرِ تاریکی
ذوقِ نورِ سحر کا ماتم ہے
جیب و دامن کا اعتبار نہیں
نگہِ بخیہ گر کا ماتم ہے
حرفِ شیریں تھا غم ربا جس کا
ایسے پیغام بر کا ماتم ہے

ایک شیریں سخن کی رخصت ہے

ہائے اک انجمن کی رخصت ہے

مانا فن کار کو فنا ہے نصیب
فن مگر اس کا جاودانی ہے
زندہ فن کار اپنے فن میں ہے
جسم خاکی اگرچہ فانی ہے
زندگی جاوداں اسی کی ہے
جس کی باتوں میں زندگانی ہے
باغ مہکا ہوا ہے وحشتؔ کا
باغ مالی کی زندگانی ہے
ابھی کھلنے کو سینکڑوں گل ہیں
اس چمن پر سدا جوانی ہے
کیسے کہدوں کہ مرگیا وحشتؔ
حسنِ اردو تو جاودانی ہے

ہم اسے کھو کے کھو نہیں سکتے
اس سے مایوس ہو نہیں سکتے

بزم سے اٹھ گیا ہے نغمہ سرا
ہے فضا میں مگر وہی جھنکار
آج خاموش ہے خطیبِ سخن
لیک پھیلی ہے لذتِ گفتار
ہم سے مایوس ہو گیا وحشتؔ
اس سے مایوس ہم نہیں زنہار
اس کے نغموں سے زندگی لے کر
ہم کو کرنا ہے ظلم سے پیکار
اس کے شعلوں سے روشنی لے کر

ہم کو پانا ہے کوچۂ دل دار
اس کے مہکے ہوئے خیاباں سے
دل میں زندہ ہے آرزوئے بہار
آرزوئے بہار ہیں ہم لوگ
اس کے دل کی پکار ہیں ہم لوگ!

(۱۹۵۶ء)

جانشینِ وحشتؔ، شاکرؔ کلکتوی نے بھی وحشتؔ کی رحلت پر مرثیہ لکھا تھا، جو ان کے مجموعۂ کلام 'ریحانۂ الفت' میں موجود ہے۔ مرثیہ پیش کیا جاتا ہے:

نوحہ ہائے غم

(نوحہ بر انتقال پر ملال استاذی حضرت علامہ رضا علی وحشتؔ)

پوچھتا ہے وجہِ گریہ مجھ سے کیا اے ہم نشیں
چل بسا وحشتؔ جہاں سے کیا خبر تجھ کو نہیں
وہ سخن دانِ گرامی شاعروں کا پیشوا
فیض کا خرمن تھا وہ اور سب تھے اس کے خوشہ چیں
مہربانی اس کی عادت، لطف تھا اس کا شعار
آدمیت جس پہ نازاں تھی وہ وحشتؔ اب نہیں
عیب جوئی تھی سراسر اس کے مسلک میں گناہ
تھا اگرچہ نکتہ داں لیکن نہ تھا وہ نکتہ چیں
کون اپنا نغمۂ رنگیں سنائے اب ہمیں
سو رہا ہے شاعرِ رنگیں نوا زیرِ زمیں
اک چمن تھا بلبلِ بنگالہ اپنی ذات سے
خون کے آنسو بہائیں کیوں نہ اس کے ہم نشیں
مٹ گئی افسوس اس کے ساتھ عرفیؔ کی روش

لے گیا وہ ساتھ اپنے قبر میں طرزِ حزیںؔ
فلسفہ غالبؔ کا جس سے زندہ تھا وہ مرگیا
جس میں تھی روحِ نظیریؔ آہ وہ وحشتؔ نہیں
کس سے ہو گی اب عروسِ شعر کی مشاطگی
خدمتِ فن جس سے وابستہ تھی وہ شاعر نہیں
لٹ گیا ہے شاید اردوئے معلّٰی کا سہاگ
بے سبب قصرِ ادب میں آج خاموشی نہیں
خاک میں اس کو ملا یا گردشِ افلاک نے
ہائے جس کی ذات ناموسِ سخن کی تھی امیں
اب قدم بوسی تو اس کی ہو نہیں سکتی نصیب
ہاں ہم اس کی قبر پر جا کر جھکائیں گے جبیں

جمیلؔ مظہری، وحشتؔ کے لائق شاگردوں میں تھے۔ جب انھیں وحشتؔ کی موت کی خبر ملی تو انھیں گہرا رنج ہوا، اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے:

ہم پر اک سایۂ دامان پدر تھے وحشتؔ

زندگی آج کرے صبر و رضا کا ماتم
فن کرے اپنے اسالیب و ادا کا ماتم
کیوں نہ ہو ساتھ دلِ اہلِ صفا کا ماتم
کہ یہ اخلاص کا ماتم ہے، وفا کا ماتم
ایک اس موت سے مردہ ہوئیں رسمیں کتنی
ایک اس صبر کے پہلو میں ہیں قبریں کتنی
ہم پر اک سایۂ دامان پدر تھے وحشتؔ
جس پہ آنچ آئے کوئی سینہ سپر تھے وحشتؔ
خنکی کو جو بھلا دے وہ شجر تھے وحشتؔ

بس کہ اک نخلِ سرِ راہ گزر تھے وحشتؔ
جس میں راحت تجھے اے بے وطنی ملتی تھی
ہر مسافر کو جہاں چھاؤں گھنی ملتی تھی

آج ڈھونڈے سرِ تسلیم کا یہ خم کس کو
ہو گا بیچارگیِ عزم ترا غم کس کو
سونپے گا اپنے گہردیدۂ پرنم کس کو
زخم دکھلائے گا اپنا غمِ مرہم کس کو
دوستی وقت پہ کھینچے گی گریباں کس کا
دھجیاں دے گا گل وخار کو داماں کس کا

اب بجز اشک کے کیا دیں گی حیا کی آنکھیں
اپنا سر مایہ لٹادیں گی وفا کی آنکھیں
ڈبڈبائی ہیں کئی دن سے فضا کی آنکھیں
سخت دل روئیں گی ساون میں گھٹا کی آنکھیں
شامِ کلکتہ بآوازِ حزیں روئے گی
تھی جو وحشتؔ کے قدم سے وہ زمیں روئے گی

یہ مرثیہ طویل ہے۔صرف منتخب اشعار پیش کیے گئے ہیں۔مرثیے کا اصل عنوان 'شمعِ شبستانِ سخن' ہے۔

قتیلؔ رضوی داناپوری نے وحشتؔ کی وفات پر اپنے افسوس کا اظہار یوں کیا:

پھلی پھولی اسی کی ذات سے بنگال میں اردو
عوض کاغذ کے موجِ دل پہ ہو گا نام وحشتؔ کا
یہ عالم گیر غم ہے کیا تعجب ہے جو اے ہمدم
قتیلِ غم زدہ کی بزم میں ماتم ہے وحشتؔ کا

سید لطیف الرحمٰن نے وحشتؔ کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا تھا اس کے چند اشعار پیش کیے

جاتے ہیں:

فشارِ غم سے کہاں تاب ہے سخن کے لیے
دلوں کا حال برا ہے امامِ فن کے لیے
اجڑ کے ڈھیر ہوا بوستانِ بنگالہ
چمن چمن نہ رہا ایک نغمہ زن کے لیے
اڑا جو طوطیِ بنگال باغ جنت کو
جہاں میں کون رہا بوستانِ فن کے لیے
سخنوری کو ضرورت تھی آج وحشتؔ کی
جہاں میں اس کا نہ رہنا، ہے موت فن کے لیے
اصولِ فن سے کیا آشنا زمانے کو
بہار آئی تھی آرائشِ چمن کے لیے
نیازؔ و حالیؔ و اقبالؔ اور شبلیؔ سے
خراج اس نے لیا ''غالبانہ'' فن کے لیے
لطیفؔ ماہ محرم ہے ماہ ذی الحجہ
بڑے ستم کا مہینہ ہے یہ سخن کے لیے

وحشتؔ کی وفات پر پرویزؔ شاہدی نے فارسی میں مرثیہ لکھا تھا جس کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

ماتمِ وحشتؔ

دشتِ پیمائے محبت زیرِ تربت محوِ خواب
گیسوئے اردو پریشانست و وحشتؔ محوِ خواب
تشنگیِ بادہ نوشاں رنجِ بیداری برد
ساقیِ محفل درونِ کنج خلوت محوِ خواب
از جدائی خارِ غم در دیدہ و دل می خلد
گلستاں در ماتم و آں روحِ نکہت محوِ خواب

خون می گریم کہ دَور خندۂ قلقل گزشت
درصراحی بادۂ تندِ محبت محوِ خواب
خون می گریم کہ امیدِ شفا از دست رفت
زندگی بیمار و آں نبّاضِ فطرت محوِ خواب
خون میگریم کہ نوشِ شاعری ہم تلخ شد
تلخیِ احساس بیدار و حلاوت محوِ خواب
ماتمیِ قوتِ نظمست، عجز کلکِ فکر
ہم بلاغت محوِ خواب و ہم فصاحت محوِ خواب
گوشِ مشتاقم کجا شنو و حدیثِ آگہی
برلبِ خاموش حرفِ علم وحکمت محوِ خواب
دل عزا دارِ نشاطِ رفتۂ بزمِ سخن
میرِ محفل محو خواب ولطفِ صحبت محوِ خواب
من زعرفانِ غمم پرویزؔ بینم بہ بزم!
روحِ وحشتؔ نغمہ بارو جسمِ وحشتؔ محوِ خواب

فطرتؔ واسطی نے وحشتؔ کی رحلت پر جو مرثیہ لکھا تھا، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نجمِ سحر

وحشتؔ کی طرف نجمِ سحر کا تھا اشارہ
ورنہ وہ کہاں اور کہاں صبح کا تارا
وحشتؔ کہ تھا اس دَور کا اک شاعرِ کامل
جس کا نہ مخالف، نہ کوئی مدِّ مقابل
اسلوبِ وادا میں وہ کشش تھی کہ غضب تھی
رفعت تھی تخیل میں، نظر موجِ طرب تھی
استاد تھا بے مثل، نظر فن پہ تھی ہردم
لغزش اسے چھو جاتی، یہ لغزش میں کہاں دم

ماہر تھا معانی و بیاں کا وہ سخن ور
تھا اس کی فصاحت میں بلاغت کا بھی جوہر
اب ایسی زباں ایسا ہنر مل نہ سکے گا!
مرجھا یا ہوا پھول کبھی کھِل نہ سکے گا!

’ماتمِ فخرِ روزگار ہے آج‘ جانشینِ وحشتؔ، آصفؔ بنارسی کا طویل مرثیہ ہے۔ پورا مرثیہ نو بندوں پر مشتمل ہے۔ آخری بند ملاحظہ ہو:

ماتم فخرروزگار ہے آج

بے سبب چشم اشک بار نہ تھی — دیکھتے دیکھتے بہار نہ تھی
اس کو بخشی تھی زندگی تو نے — یہ کوئی جنس مستعار نہ تھی
سختیِ موت کا سبب یارب؟ — روح محوِ نشاط کار نہ تھی
جاودانی سکوں ملا کیوں کر — مطمئن چشمِ انتظار نہ تھی
غم ہوا جانستاں نہ مانوں گا — کہ یہ مئے اس کو ناگوار نہ تھی
لے گئی کیوں اجل اٹھا کے اسے — اس کی ہستی کسی پہ بار نہ تھی
کیوں نہ روتے ہم آٹھ آٹھ آنسو — آستیں اپنی تار تار نہ تھی
یوں ہی آصفؔ کیا کریں گے ہم
وحشتِؔ ذی وقار کا ماتم

شاگردِ وحشتؔ سلیم اللہ فہمیؔ وفاتِ وحشتؔ پر بے ساختہ کہہ اٹھے:

بہارِ گل میں رعایت سرور کی نہ رہی
کہ میرے غنچۂ دل ہی میں تازگی نہ رہی
جنابِ حضرتِ وحشتؔ کی زندگی نہ رہی
وہ جس سے شعر کے قالب میں روح تھی نہ رہی

کہاں محرکِ جذبات پیر میخانے
عجب ہی کیا ہے اگر رسمِ مے کشی نہ رہی
ہے آسمانِ ادب پر سحابِ غم طاری
اداس چاند ہے تاروں میں روشنی نہ رہی
غزل میں نکلیں گی کیا اب نئی نئی راہیں
وہ خضرِ راہ کی بے لوث رہبری نہ رہی
وہ جس سے نظم کی دنیا میں اک اجالا تھا
اب اس چراغ کی موجود روشنی نہ رہی
نگاہیں حضرتِ آصف کی سمت اٹھتی ہیں
سلیم شکر ہے محفل میں ابتری نہ رہی

احسان دربھنگوی جمیل مظہری کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ وحشت سے دلی ارادت تھی۔ ان کی وفات پر انھوں نے جو مرثیہ لکھا وہ چار بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلا بند ملاحظہ ہو:

اٹھا یہ کون گلستاں سے کس کا ماتم ہے
کہ انتشار میں سنبل کی زلف پرخم ہے
عروس صبح کے گالوں پہ اشک شبنم ہے
چمن کے حال پہ غنچوں کی آنکھ بھی نم ہے
ہوا کی طرح پریشاں ہے زلف بنگالہ
فضا میں گونج رہا ہے بہار بنگالہ

(جولائی ۱۹۵۶ء)

۲۶؍ جولائی ۱۹۵۷ء کو انجمن ترقیِ اردو مشرقی پاکستان کے زیر اہتمام انجمن ہی کے دفتر میں وحشت کی پہلی برسی منائی گئی۔ عندلیب شادانی نے صدارت کی۔ اس جلسے میں مرحوم کی شخصیت پر نظیر صدیقی نے اپنا مضمون پڑھا۔ ان کی شاعری پر شوکت سبزواری نے تقریر کی۔ عندلیب شادانی نے ان کی یاد اس طرح تازہ کی اور فرمایا کہ ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ تارو زِ جزا نہیں

بھر سکتا:

اہلِ حکمت کا یہ کہنا ہے خلا ممکن نہیں
میں یہ کہتا ہوں خدا چاہے تو کیا ممکن نہیں
مرگِ وحشت سے ادب میں وہ خلا پیدا ہوا
جس کا بھرنا اب سے تاروزِ جزا ممکن نہیں

ریڈیو سے تعلق

لوگ وحشت کو نہ صرف مشاعرے میں سنتے تھے بلکہ اکثر ان کی تخلیقات ریڈیو سے بھی نشر کی جاتی تھیں۔ گویا انھوں نے ریڈیو سے بھی اپنا تعلق بنائے رکھا تھا۔ وہ جب تک کلکتے میں رہے آل انڈیا ریڈیو، کلکتہ سے ان کی تقریریں، نظمیں اور غزلیں برابر نشر ہوتی رہتی تھیں۔ جنگِ آزادی اور تقسیمِ وطن کی صعوبتوں سے بیزار ہو کر جب انھوں نے مشرقی پاکستان ہجرت کی تو کچھ دنوں کے لیے ان کا رشتہ ریڈیو سے بھی منقطع ہو گیا۔ ہجرت کے بعد مشرقی پاکستان میں انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ لیکن ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کے بے حد اصرار پر انھوں نے دوبارہ ریڈیو سے اپنا رشتہ جوڑا۔ مشرقی پاکستان میں ان کا پہلا پروگرام ۱۱؍ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو نشر ہوا، جس میں انھوں نے واقعۂ کربلا سے متعلق ایک نہایت موثر مرثیہ پڑھا۔

وحشت نے نہ کبھی ریڈیو کے عملے یا آرٹسٹوں کی شکایت کی اور نہ کبھی ریڈیو پروگرام یا اس کی پالیسی سے اختلاف کیا۔ کلیم اللہ صاحب (ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان) کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دبی زبان سے وحشت نے کہا تھا کہ اپنے گانے والوں سے کہہ دیجیے گا کہ میری غزلیں گائیں تو ذرا تلفظ کا خیال رکھیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن قصہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے زیادہ تر موسیقار اردو سے نا آشنا ہیں۔ آپ کی غزلیں وہ بنگالی رسم الخط میں لکھ لیتے ہیں۔ پھر ان کی ریہرسل ہوتی ہے۔ تلفظ بتائے جاتے ہیں۔ ادائیگی میں بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ مولانا نے فرمایا— ''صاحب! یہ تو کمال ہے پھر تو مجھے شکایت نہ کرنی چاہیے۔''

(وفا راشدی، حیات وحشت، ص:۵۳)

۱۹۵۴ء کے اواخر میں وحشت کی صحت زیادہ خراب رہنے لگی۔ یہاں تک کہ لکھنے پڑھنے اور

کہیں آنے جانے کے بھی قابل نہ رہے۔ پھر بھی ۲۵/ مارچ ۱۹۵۵ء کے یادگار ریڈیائی مشاعرے میں ان کی شرکت لازمی سمجھی گئی۔ اربابِ ریڈیو ان کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ وحشتؔ نے بستر پر پڑے پڑے اپنا کلام پڑھا۔ ریڈیو مشاعرے کا یہ واقعہ اس اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ نہ صرف ریڈیو سے ان کا آخری تعلق تھا بلکہ یہ ان کی زندگی کا آخری مشاعرہ تھا۔ (ایضاً)

وحشتؔ اور ترقی پسند ادبی تحریک

اردو میں ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تحریک علی گڑھ تحریک کے ردعمل میں وجود میں آئی۔ علی گڑھ تحریک نے ادب میں معقولیت اور مقصدیت پر زور دیا جبکہ ترقی پسند تحریک نے ادب کا رشتہ عوام سے جوڑا۔ ترقی پسند تحریک ایک خاص مقصد کے تحت کام کر رہی تھی۔ علی گڑھ تحریک ادب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی تھی۔ ہماری داستانوں اور مثنویوں میں عموماً جن، دیو اور پریوں جیسے مافوق الفطرت مخلوقات کا بیان ملتا تھا۔ مگر علی گڑھ تحریک نے اس طلسم کو توڑا، اور خواب وخیال کی دنیا سے نکال کر عقلی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ قدیم داستانوں اور قصے کہانیوں سے بیزاری پیدا کی۔

ترقی پسند تحریک نے ادب میں نئے رجحانات پیدا کیے۔ اس تحریک نے مجروح احساسات اور کچلے ہوئے جذبات کی ترجمانی کی۔ مزدوروں کی حمایت اور سرمایہ داروں کی مخالفت کی۔ اس نے حسن کا معیار بدلا۔ اس نے ہمارے ادب میں حرارت پیدا کی۔ ہمیں چونکایا اور بیدار کیا۔ اس نے ہمیں محلوں اور عالیشان عمارتوں سے نکال کر ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں، کھیتوں اور کھلیانوں کی سیر کرائی۔ 'ادب برائے زندگی' کا نعرہ بلند کیا۔ اس کے بے شمار فائدے سامنے آئے، لیکن ساتھ ہی کچھ نقصاندہ اثرات بھی ظاہر ہوئے۔ مثلاً ادب کا دائرہ محدود ہو گیا۔ موضوع اور مواد ہی کو اہمیت دی جانے لگی۔ مخصوص فرقے کی ترجمانی ہونے لگی۔ مخصوص خیال کا پرچار کیا جانے لگا۔ ہندوستانی ادیب ہندوستان میں رہ کر روسی نغمے گانے اور اس پر وجد کرنے لگے۔ مارکس کے فلسفے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا۔ قتل، غارت گری، خون، لہو، طوفان، طلاطم، شورش، یورش، کشتی، دریا، انگارے، شعلے، آگ، چنگاری، شرارے، بغاوت، انقلاب وغیرہ جیسے الفاظ کا کثرت سے

استعمال ہونے لگا۔ کمیونزم کی تشہیر زور و شور سے ہونے لگی۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر لوگ اس تحریک سے بیزار ہو گئے اور ۱۹۵۶ء تک تو کچھ لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس کا کام اب پورا ہو چکا اور اب یہ تحریک ختم ہو جانی چاہیے۔

شاعروں اور ادیبوں کی بڑی تعداد اس تحریک میں شامل ہوئی۔ مثلاً پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، مجنوںؔ گورکھپوری، سید احتشام حسین، سجاد ظہیر، مجروحؔ سلطان پوری، معین احسن جذبیؔ، اسرارالحق مجازؔ، جاں نثار اخترؔ، سردار جعفری، ساحرؔ لدھیانوی وغیرہ۔ لیکن وحشتؔ اس تحریک میں شامل نہ ہوئے۔ وہ اس تحریک کے ہم خیال نہ تھے۔ اس کی خرابیوں پر ان کی نظر گہری تھی۔ وہ تو قدیم طرزِ سخن کے دلدادہ تھے۔ معتقدِ قدیم تھے اور کلاسیکیت پر ان کا ایقان تھا۔ وہ خود کہتے ہیں:

"میں تو پرانی لکیر کا فقیر ہوں اور قدیم طرز سخن کا دلدادہ ہوں۔"

(مکاتیب وحشتؔ — ص:۱۲۴)

وحشتؔ ادب میں کلاسکی میلانات کے حامل تھے۔ وہ بے جا جدت پسندی کے خلاف تھے۔ جدت کے نام پر فن کا خون وہ ہرگز برداشت نہ کر سکتے تھے۔ وہ موضوع اور مواد کے ساتھ فن کے قائل تھے۔ فنی باریکیوں پر ان کی نظر کڑی تھی۔ فصاحت، بلاغت اور معنی آفرینی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے غزل کی مخالفت کی اور نظموں کے لکھنے کا رواج قائم کیا۔ وحشتؔ نے نظمیں بھی لکھی ہیں، لیکن ان کا اصل میدان غزل گوئی ہے اور وہ غزل کے بہت بڑے رسیا ہیں۔ وحشتؔ لکھتے ہیں:

"عموماً آج کل نظموں کے لکھنے کا رواج ہے اور وہ لوگ جنھوں نے فن شعر کو باقاعدہ حاصل نہیں کیا ہے طبع آزمائی کرتے ہیں اور مہمل بکتے ہیں۔ نظمیں بے سروپا ہوتی ہیں۔ الفاظ کو معنی سے تعلق نہیں ہوتا۔" (مکاتیب وحشتؔ — ص:۸۰)

وحشتؔ کے آخری دور میں ترقی پسند تحریک پورے شباب پر تھی۔ غزلیں کم کہی جاتی تھیں۔ نظموں کا رواج زیادہ تھا۔ شاعری کے نام پر خطابت کو فروغ دیا جا رہا تھا۔ ان کو یہ چیزیں ناگوار

گزرتی تھیں، اور وہ ان کی کھل کر مخالفت کرتے تھے۔

وحشت ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھے، لیکن وہ ترقی پسندوں کی قابلِ ستائش چیزوں کی ستائش کرتے تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد، مداح اور احباب اس تحریک سے وابستہ تھے اور وہ ان کی اچھی تخلیقات کو سراہتے تھے۔ پرویز شاہدی، ناظر الحسینی، ابراہیم ہوش اور ایسے ہی اکثر شعرا و ادبا کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ جوش، جگر اور نئے لکھنے والوں میں فیض، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری وغیرہ کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔

وحشت کے معاصرین

خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، پنڈت برج نرائن چکبست، نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، علامہ اقبال، شاد عظیم آبادی، منشی نوبت رائے نظر، ریاض خیر آبادی، عزیز لکھنوی، شوق قدوائی، وفا رام پوری، ظہیر دہلوی، مولانا ظفر علی خان، محشر لکھنوی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جلیل مانکپوری، صفی لکھنوی، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی، ناطق لکھنوی، سیماب اکبر آبادی، یگانہ چنگیزی، نیاز فتح پوری، تلوک چند محروم، اثر لکھنوی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، عندلیب شادانی وغیرہ کی قطار میں امام الشعراء، طوطیِ بنگالہ، غالبِ دوراں، علامہ رضا علی وحشت کلکتوی بھی جلوہ افروز ہیں۔

وہ زمانہ بھی گزرا ہے جب یہ خیال عام تھا کہ اردو زبان صرف اہلِ دہلی و لکھنؤ کی جاگیر ہے۔ یہاں تک کہ اقبال کی بھی زبان کا مذاق اڑایا گیا، کیوں کہ ان کا تعلق مذکورہ دبستانوں سے نہ تھا۔ دوسرے کئی شعرا پر پھبتیاں کسی گئیں، لیکن حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اُسی دور میں وحشت کا شمار انہی شعرا میں ہوتا تھا، جو متذکرہ دبستانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وجہ محض ان کی زبان دانی اور فن تھی۔ یہاں ان کے معاصر عندلیب شادانی کا یہ خیال نقل کرنا درست معلوم ہوتا ہے:

''اس وقت کے شعرا میں جو لوگ سرِ فہرست آتے تھے ان میں حضرت وحشت کلکتوی کا بھی شمار تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ بنگال نژاد اردو کے مرکزوں سے ہزاروں کوس دور رہ کر اردو کا نامور شاعر کیوں کر ہو سکتا ہے مگر اس حقیقت سے

انکار ناممکن نہ تھا۔ اس زمانے میں بھی جب اہلِ زبان کسی بیرونی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے ساحرِ بنگالہ وحشت اپنی زبان دانی اور سخن سنجی کا لوہا منوا چکا تھا اور اس کی شہرت حدودِ بنگال سے نکل کر بہار، یوپی کو تسخیر کرتی ہوئی لکھنؤ اور دہلی سے نکل کر لاہور پہنچی۔''

(مہر نیم روز، کراچی، وحشت نمبر، ۱۹۵۷ء)

۱۹۱۰ء میں جب 'دیوانِ وحشت' کی اشاعت ہوئی تو ہر طرف سے مبارک بادیاں آئیں اور ان کے معاصرین نے انھیں جی کھول کر دادِ تحسین سے نوازا۔ مولانا الطاف حسین حالی، وحشت کے بزرگ معاصر ہیں۔ دیوان کی اشاعت پر انھوں نے طویل تبصرہ لکھا۔ دورانِ تبصرہ انھوں نے کہا:

''مولانا اگر انصاف سے دیکھئے تو مرزا (مرزا غالب) کا تتبع کرنا درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا مگر آپ نے ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا۔''

(۲۹ مئی ۱۹۱۰ء، مشمولہ دیوان وحشت)

علامہ شبلی نعمانی نے بھی ان کے فن کا لوہا مانا:

''آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالب اور مومن کی ترکیبیں اور طرزِ ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہیں۔''

(مکتوب بنام وحشت، مشمولہ دیوان وحشت ۱۹۱۰ء)

عبدالحلیم شرر نے بھی ان کے فن کے استادانہ رنگ کا اعتراف کیا:

''حضرت وحشت کی طبیعت شاعری کے لیے بہت مناسب واقع ہوئی ہے۔ کلام میں خاص رنگ اور خاص لطف ہے۔ پرانے مذاق کے نباہنے کے ساتھ جدید رنگ کی شوخیاں اور دلچسپیاں بھی پیدا کرنا حضرت وحشت کا خاص رنگ ہے۔''

(ماخوذ از ریویو مطبوعہ رسالہ دلگداز لکھنؤ، بابت اپریل ۱۹۱۰ء)

نیاز فتح پوری کا یہ تبصرہ دیکھیے:

''جنابِ وحشت کلکتوی اس دورِ شاعری کی ایک یادگار ہیں جب سخن سنجی و سخن فہمی کا تعلق زیادہ تر تغزل ہی سے تھا اور عشق و محبت کی دنیا 'این و آں' سے بیگانہ

تھی۔.........میں نے ہمیشہ ان کی غزلوں کا مطالعہ محبت کی 'گرانمائیگی' ہی کو سامنے رکھ کر کیا اور اسی خصوصیت نے مجھے ان کا گرویدہ بنایا۔ جذبات و خیالات میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر رسالہ تجلی میں ان کی ایک غزل میری نگاہ سے نہ گزرتی تو شاید میں وحشتؔ کی شاعری کے متعلق اسی خیال پر قائم رہتا کہ ان کا جو رنگ اب سے پچاس سال قبل تھا وہی اب بھی ہے، ....ان کی جوانی کی شاعری کے سامنے تو لوگوں کا صرف سر جھکتا تھا لیکن اب ان کے اس رنگ کے سامنے روح دوزانو ہوتی ہے۔''

(ماخوذ از تبصرہ مطبوعہ نگار، بابت جون ۱۹۴۶ء)

ظہیرؔ دہلوی، وحشتؔ کے معاصر اور ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ وہ ان کی فنّی بصیرت کے قائل تھے اور بہ بانگ دہل ان کے غالبؔ ثانی ہونے کا اقرار کرتے تھے:

''آپ کا کلام بلاغت نظام دیکھ کر بخدائے لایزال کسی شاعر کا کلام نظر میں نہیں جچتا۔ غالبؔ ثانی ہونے میں آپ کے کوئی کلام نہیں۔ خدا کی قدرت ہے ایسے ایسے باکمال ہندوستان میں چھپے بیٹھے ہیں۔''

(ماخوذ از مکتوب بنام وحشتؔ مشمولہ دیوان وحشتؔ، ۱۹۱۰ء)

مولانا احمد علی شوقؔ قدوائی کہتے ہیں:

''.........دیوان وحشتؔ میں کیا اثر ہے جس کے سبب سے وہ وحشت جو مجھے غزلوں کو دیکھ کر ہوا کرتی تھی رغبت سے بدل گئی۔'' (ایضاً)

وحشتؔ اور حکیم ابوالعلا ناطقؔ لکھنوی اکثر مشاعروں اور ادبی نشستوں میں ایک ساتھ نظر آتے اور ایک دوسرے کے کمالات کا دل کھول کر اعتراف کرتے۔ اپنی محبت و عقیدت کا اظہار بھی فرماتے۔ ایسی ہی ایک محفل میں وحشتؔ نے کہا تھا:

وحشتؔ اس جلسے میں ہیں حضرت ناطق جو شریک
خوب موقع ہے پئے عرضِ عقیدت مجھ کو

ناطقؔ لکھنوی نے بھی وحشتؔ کو خراج تحسین پیش کیا:

اِس شمع کے قربان ہو اے پروانو!
یہ جو ہرِ قابل ہے اِسے پہچانو!
اِس طرح کے سرمست نہ پاؤ گے کہیں
وحشتؔ کی کرو قدر ارے دیوانو!

آرزوؔ لکھنوی، وحشتؔ کے معاصرین میں تھے۔ کئی برس انھوں نے کلکتے میں گزارے۔ وفاؔ راشدی نے اپنی کتاب 'میرے بزرگ میرے ہم عصر' میں ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وحشتؔ، آرزوؔ لکھنوی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں سے ان کی شرافت اور کمالِ فن کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ احسنؔ گنوری نے آرزوؔ لکھنوی کے کلام پر کچھ اعتراض لکھ کر ماہنامہ 'شمس' کلکتہ (یہ رسالہ وحشتؔ کے استاد شمسؔ کلکتوی کی یاد میں نکلتا تھا) میں چھپوا دیے۔ اس وقت 'شمس' کے ناشر اور ایڈیٹر وحشتؔ کے شاگردِ رشید طاہر علی شاکرؔ کلکتوی ہوا کرتے تھے جو بعد میں جانشین وحشتؔ بھی ہوئے۔ انھوں نے مغربی اور مشرقی بنگال میں وسیع حلقۂ تلامذہ کی فنی تربیت کی تھی۔ وحشتؔ نے شاکرؔ صاحب کو بلوایا اور نہایت خفگی سے فرمایا:

''حضرت آرزوؔ مسلم الثبوت استاد ہیں۔ میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ ان کے شاگرد مجھ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ آپ نے ان کے خلاف یہ مضمون چھاپ کر ہم سب کی توہین کی ہے۔ آپ فوراً معافی نامہ لکھ کر اپنے رسالے میں چھپوا دیجیے۔'' (میرے بزرگ میرے ہم عصر: ص:۵۵)

وحشتؔ اپنے معاصرین کا احترام کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سے ان کی چشمک نہ تھی۔ انہی کی زبانی سنیے:

نہیں اہلِ فن میں وحشتؔ مجھے ایک سے بھی چشمک
کہ ہے قدر میرے دل میں شعرائے نکتہ داں کی

مجید الحسن ضیاؔ عظیم آبادی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حکیم ابوالعلا ناطقؔ لکھنوی اور وحشتؔ ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک رسالہ رکھا ہوا تھا۔ ناطقؔ صاحب رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگے۔

اس میں آرزو لکھنوی کی غزل چھپی تھی۔ ناطق لکھنوی نے منہ بنا کر وہ غزل وحشت کو دکھائی۔ ناطق لکھنوی کہتے جاتے تھے کہ ''اس غزل میں ہے کیا؟'' اور وحشت کہتے جاتے تھے کہ آرزو صاحب اچھا کہتے ہیں۔

وحشت سے متعلق عزیز لکھنوی نے ایک طویل نظم لکھی ہے۔ صرف ایک شعر دیکھیے:

قائل قوتِ اعجاز بیانی ہے عزیز
آپ ہیں اکمل افراد بہ فرمانِ یقین

اردو شاعری کی تاریخ میں لسان القوم صفی لکھنوی کی خدمات نمایاں ہے۔ ہماری روایتی شاعری طرح طرح کے معائب میں گرفتار تھی۔ مصنوعی اظہار عشق، عریاں نگاری، لفاظی، رعایتِ لفظی، مبالغہ آرائی جیسے عیب اس زمانے کی شاعری میں عام طور پر نظر آتے ہیں۔ صفی کی شاعری بڑی حد تک ان عیوب سے پاک ہے۔ انھوں نے دبستان لکھنؤ کا نام روشن کیا۔ وہ وحشت کے معاصر تھے اور ان سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اپنی ایک نظم میں وہ کلکتے کا ذکر کرتے ہیں اور کلکتے کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ وہاں اردو کے مسلم الثبوت استاد شاعر، وحشت قیام فرماتے ہیں:

کون کلکتہ جہاں ہے وحشت معجز بیاں
شاعرِ کامل سخن سنج و ادیب نکتہ داں

وحشت نے بھی دیگر روایتی شعرا کی طرح اردو کے علاوہ فارسی میں طبع آزمائی کی۔ ان کی فارسی شاعری پر اقبال بھی فدا تھے۔ ان کی فارسی گوئی کے تعلق سے صفی لکھنوی کا یہ بیان بھی ملاحظہ کیجیے:

بروشِ غالب و میر آمدہ شاعرِ بے مثل و نظیر آمدہ
ازاثر طبع سخن گوئے او فارسیش غازۂ اردوئے او

علامہ اقبال کو وحشت سے جو عقیدت تھی اس کا اظہار اقبال نے ایک خط میں کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں ایک عرصہ سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں اور آپ کا غائبانہ

مداح ہوں۔ دیوان قریباً سب کے سب پڑھا اور خوب لطف اٹھایا۔ ماشاء اللہ آپ کی طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص طور پر قابل داد ہے۔ فارسی کلام بھی آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے کے دل پر چھوڑ جائے تو یہ بات آپ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔''

(مکتوب بنام وحشت، مورخہ ۳۰/مئی ۱۹۱۰ء، مشمولہ دیوان وحشت ۱۹۱۰ء)

جب اقبال کی وفات ہوئی تو وحشت کو شدید صدمہ پہنچا۔ انھیں احساس ہوا کہ ان کا ایک سچا مداح داغِ مفارقت دے گیا جس کا اظہار انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے:

اب زبانِ خامہ پر پڑ ہی گئی مہرِ سکوت
وحشتِ رنگیں نوا کا قدرداں جاتا رہا

حسرت موہانی زبان و فن کے معاملے میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے، مگر وہ بھی وحشت کی سخن وری کے قائل ہیں، فرماتے ہیں:

''مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ زمانہ موجودہ کے ان چند برگزیدہ شعرا میں سے ہیں جن کے حسنِ کلام پر اردو شاعری کو فخر کرنا چاہیے۔''

(ماخوذ از ریویو مطبوعہ اردوئے معلیٰ، بابت اپریل ۱۹۱۰ء، مشمولہ: دیوان وحشت)

حسرت، وحشت کے عزیز ترین معاصر تھے۔ جیل میں چکّی پیسنے کے ساتھ وہ مشق سخن بھی کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک غزل کہی اور اس کے مقطعے میں بڑے فخر کے ساتھ وحشت کا نام اپنے معزّز معاصرین میں لیا۔ بیگم حسرت نے بطور خاص وہ غزل نقل کر کے وحشت کی خدمت میں بھیجی تھی۔ مقطع یہ ہے:

ہیں شاد و صفی شاعر یا شوق و وفا حسرت
پھر ضامن و محشر ہیں، اقبال بھی وحشت بھی

(کلیات حسرت موہانی، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ص: ۱۷۸)

وحشت کے متعلق حسرت کا یہ شعر بھی دیکھیے:

خوبیِ اشعارِ وحشت کا نہ پوچھو کچھ مزا
میر و مرزا کا زمانِ شاعری یاد آ گیا

۱۹۱۷ء میں مولانا حسرت نے ایک قطعہ لکھا جس میں اپنے معاصرین موجودہ و گذشتہ کو یاد کیا۔ اس میں ۷۷ اشعرا کا ذکر ہے۔ پھر علی الترتیب اساتذہ مشاق، مستعد، کم مشق اور مرحوم شعرائے کرام کے اسمائے گرامی لکھے ہیں۔ اس قطعے میں حسرت نے وحشت کا ذکر اساتذہ کی صف میں کیا ہے:

معاصر ہوں رشید و اکبر و اقبال کا حسرت
جلیل و نظم و بیباک و دلیر و نوح وحشت کا
ریاض و مضطر و شوق و صفی، شاد و اثر، مائل
عزیز و ثاقب و بیخود، نظر، چکبست و ندرت کا

حسرت نے اپنے دیوان میں 'ہدیۂ شوق و عقیدت بہ دوستانِ صادق' کے زیرِ عنوان وحشت کا نام بھی محبت سے لیا ہے۔ حسرت، وحشت سے عمر میں صرف چھ سال بڑے تھے، مگر ان کے دوستانہ تعلقات اور معاصرانہ اخلاق کی مثال کم ہی ملے گی۔ حسرت جب بھی کسی سیاسی جلسے یا مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے کلکتے آتے تو وحشت کے رحمت کدے پر ان سے ضرور ملاقات کرتے۔

حسرت کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، شیر بنگال مولوی فضل الحق، حسین سہروردی جیسے زعمائے ملت بھی وحشت کے دولت کدے پر تشریف لایا کرتے تھے۔ حفیظ جالندھری، احسان دانش، جوش ملیح آبادی اور جگر مرادآبادی بھی وحشت سے ملنے آیا کرتے تھے۔

وحشت کی زبان اتنی مستند تھی کہ عبدالرحمٰن بجنوری جیسے بالغ نظر نقاد نے اپنے صاحب زادے کو خط میں لکھا تھا کہ 'زبان سیکھنی ہو تو دیوانِ وحشت پڑھو۔'

(وفا راشدی، حیات وحشت، ص: ۳۶)

رئیس امروہوی رقم طراز ہیں:

''کیسا عجیب اتفاق ہے کہ نشاط ثانیہ کے اس بے مثال عہد میں متحدہ ہندوستان کے دوسروں پر دو عظیم الشان شاعر پیدا ہوئے۔ کلکتے میں وحشت اور لاہور میں اقبال۔''

(ماخوذ از پیش لفظ، حیاتِ وحشت، از: وفا راشدی، ص: ۱۶)

مدیرِ 'شاعر' سیماب اکبرآبادی سے بھی وحشت کے گہرے مراسم تھے۔ اس دور کے دوسرے ممتاز شعرا کے ساتھ وحشت کا کلام بھی رسالہ 'شاعر' کی زینت بنتا تھا۔ وحشت نے اپنے شاگرد ظفر ہاشمی کو ایک مکتوب میں لکھا ہے:

''خوش ہوں کہ میری دو غزلیں جو شاعر کے خاص نمبر میں نکلی ہیں آپ کی نظر سے گزریں اور آپ ان سے لطف اندوز ہوئے۔ مجھے اب شعر کہنے کا اتفاق شاذ و نادر ہوتا ہے لیکن مدیرِ 'شاعر' سال میں ایک مرتبہ مجھ سے کچھ لکھوا ہی لیتے ہیں۔ ان کا اصرار اتنا زبردست ہوتا ہے کہ میں مجبور ہو جاتا ہوں۔''

(بہ نام ظفر ہاشمی/ مکاتیب وحشت، ص: ۱۱۰)

ایک دفعہ کچھ لوگوں نے سیماب اکبرآبادی کے خلاف محاذ قائم کیا اور یہ کہہ کر وحشت کو بھی ورغلانا چاہا کہ سیماب کے ماہنامہ 'شاعر' میں آپ کی غزل بعد میں چھپی ہے۔ یہ آپ کی بے عزتی ہے۔ آپ ان کے خلاف کچھ لکھیے۔ وحشت نے کچھ لکھا تو یہ لکھا ''حضرت سیماب کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھ سکتا کہ وہ مجھ سے اچھا کہتے ہیں۔'' (ناسخ سے وحشت تک، ص: ۱۶۳)

سیماب جب بھی کلکتے تشریف لاتے، وحشت سے ضرور ملتے اور وحشت بھی ان کے استقبال میں مشاعرے اور ادبی نشستیں ضرور منعقد کرواتے۔ سیماب نے 'شاعر' کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت انجام دی۔ پھر ان کے صاحب زادے اعجاز صدیقی نے 'شاعر' کی ادارت سنبھالی۔ وحشت کا کلام رسالہ مذکورہ میں برابر شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے سیماب اور اعجاز دونوں کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا ہے:

بہر فن شعر وحشت کر دیا شاعر کو وقف!
ملک پر احسان ہیں سیماب کے اعجاز کے

جگر مرادآبادی سے بھی وحشتؔ کے گہرے روابط تھے۔ جس کا اشارہ انھی کی زبانی ان کے ایک خط میں ملتا ہے۔ متعدد دفعہ جگر سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔ جگر، وحشتؔ کے گھر پر بھی حاضر ہوتے تھے۔ شاکر کلکتوی کے نام وحشتؔ کے خط کا یہ اقتباس بھی دیکھتے چلیے:

''حضرت جگر اب تک کلکتے میں ہیں اور آپ سے ان کی ملاقات ہو جائے تو میرا سلام پہنچا دیجیے اور کہہ دیجیے کہ ان کی بتائی ہوئی دوا پر میں نے عمل شروع کر دیا ہے۔'' (مکاتیب وحشتؔ — ص:۵۹)

محشر لکھنوی، وحشتؔ کی شاعری سے کافی متاثر تھے۔ کلامِ وحشتؔ پر انھوں نے یوں اپنے تاثرات پیش کیے ہیں:

''آپ کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب وحشتؔ کو سرمایۂ شاعری من جانب اللہ عطا ہوا ہے۔ اکتسابی کوشش کا ذرا لگاؤ نہیں۔ آپ کے سینے میں باا ثر دل حقیقی جذبات کا مخزن ہے۔'' (مشمولہ: دیوان وحشتؔ — ۱۹۱۰ء)

مولوی ظفر علی خاں بھی وحشتؔ کی شاعری کے مداحوں میں تھے۔ ان کا یہ خیال قابلِ نقل ہے:

''.........مولوی رضا علی صاحب وحشتؔ گنتی کے ان سخنوروں میں سے ہیں جن کا کلام اپنی رنگینی و رعنائی کے باعث قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ آپ کی نازک خیالی اور معنی آفرینیاں ذوقِ سلیم سے خراجِ تحسین وصول کرتی ہیں اور ملک کے سر برآوردہ اردو رسائل اپنے حصۂ نظم کو آپ کی غزلیات سے زینت دینا داخلِ فیشن سمجھتے ہیں۔'' (ایضاً)

مولانا حیدر علی نظم طباطبائی کلامِ وحشتؔ کی داد یوں دیتے ہیں:

''آپ کے کلام کی داد نہ دینا سخن ناشناسی کی دلیل ہے''

(نقوش و آثار — ص ص: ۹۶-۹۷)

نظم طباطبائی نے اپنے ایک شعر میں وحشتؔ کی تعریف اس طرح کی ہے:

عیاں ہر شعر برجستہ سے بے چینی طبیعت کی
کہ بلبل ہے چمن زار اور ذوق پر فشانی ہے

امداد امام اثر وحشتؔ کے بارے میں یہ رائے قائم کرتے ہیں:

''میری دانست میں بالیقین آپ مجتہد فن ہیں۔ بلاشبہ آپ کا وجود منبع فضل و فیض ہے۔'' (مشمولہ: نقوش و آثار، ڈھاکہ، ۱۹۵۷ء، ص: ۹۷)

اکبر الٰہ آبادی کو وحشتؔ سے خاص ارادت تھی۔ فرماتے ہیں:

دیوان سے وحشتؔ کے ہے ہر طبع کو اک انس
دل کھل گئے ہیں رنگِ معانی کے چمن سے

اکبر الٰہ آبادی کی وفات پر وحشتؔ نے یہ کہا:

رہے گا تیرہ سو چالیس ہجری یاد عالم کو
کہ وحشتؔ یہ شہنشاہِ سخن کا سالِ ماتم ہے

ڈاکٹر وفا راشدی نے وحشت سے متعلق بہت مناسب رائے قائم کی ہے:

''وحشتؔ نے حالیؔ کا دماغ اور غالبؔ کا دل پایا تھا۔'' (مشمولہ: حیاتِ وحشتؔ)

وفا راشدی نے اپنی کتاب 'حیاتِ وحشت' میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جس کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ ستمبر ۱۹۶۳ء کی ۲۹ر تاریخ تھی۔ ترقی اردو بورڈ کراچی کے دفتر میں وفا راشدی کو جوش ملیح آبادی سے شعرائے بنگال کے تعلق سے گفتگو کا موقع ملا۔ اس وقت شان الحق حقی (سکریٹری بورڈ)، شوکت سبزواری اور نسیم امروہوی بھی موجود تھے۔ ہر شخص نے وحشتؔ کا تذکرہ عقیدت و احترام سے کیا۔ جوش ملیح آبادی نے کلکتے میں وحشتؔ سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر فرمایا اور ان کی تعریف کرتے ہوئے بار باران کا یہ خوبصورت شعر دہرایا اور وجد کیا:

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

(وفا راشدی، حیات وحشت، ص: ۴۴)

جمیل مظہری کے برادر خرد رضا مظہری کلامِ وحشتؔ کو فن کا معجزہ قرار دیتے ہیں:

لبریز مئے سخن ہے جامِ وحشتؔ
اک معجزۂ فن ہے کلامِ وحشتؔ

(خاروخس — ص:۱۴۳)

اثرؔ لکھنوی، وحشتؔ کے معاصر تھے۔ غزل اور نظم دونوں میدان کے شہسوار تھے۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں، بلکہ اچھے نثر نگار، اور ناقد و محقق بھی تھے۔ انھوں نے جب وحشتؔ پر قلم اٹھایا تو وحشتؔ کی فنی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے وحشتؔ کو بالغ نظر ماہرِ فن کا درجہ دیا:

''حضرت علامہ خان بہادر رضا علی وحشتؔ مرحوم سے مجھے ذاتی تعارف کا شرف حاصل نہیں تھا، مگر ان کا دلکش کلام برابر پڑھا کرتا تھا اور مکیف ہوتا تھا۔ وہ ایک بالغ نظر ماہرِ فن سخن تھے، رنگ غالبؔ کو اتنی خوبی اور کامیابی سے برتنے والا اس دور میں ان کے سوا اور کوئی نہ تھا مگر خود ان کا بھی ایک خاص رنگ تھا...... کورانہ تقلید یا محض لفاظی سے کوسوں دور۔''
(مہر نیم روز، کراچی، وحشتؔ نمبر — ص:۵)

ثاقبؔ کانپوری، وحشتؔ کو 'اردو غزل کا مسیحا' قرار دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کے معترف اور ان کے فن کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں:

''میں نے جب ہوش سنبھالا اور رسائل و اخبارات کا مطالعہ شروع کیا تو ہندوستان میں طوطیِ بنگالہ وحشتؔ کے ترانے گونج رہے تھے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ وحشتؔ کا پہلا دیوان ۱۹۱۰ء میں شائع ہو چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب داغؔ، امیر اور جلالؔ بزم شعر کے مسند نشین تھے اور دوسری طرف حالیؔ کی آواز آہستہ آہستہ دلوں پر اثر کر رہی تھی۔ داغؔ اور امیرؔ خود تو بڑے شاعر تھے لیکن ان کی تقلید نے غزل کو محدود اور اس کی ذہنی سطح کو پست کر دیا۔ ان حالات میں چند مسیحا نفس نغمہ سراؤں نے غزل کو تہذیبِ حیات و شاعری کا معیار بنانے کی کوشش کی۔ حسرتؔ موہانی مرحوم کو بجا طور پر 'اردو غزل کا مسیحا' کہا جاتا ہے مگر افسوس یہ کہ غزل کی حیاتِ نو میں جن دوسرے بزرگوں کا حصہ ہے ان کے مرتبہ اور عظمت کا خاطر خواہ اعتراف نہ کیا گیا۔ شادؔ عظیم آبادی، رضا علی وحشتؔ اور عزیزؔ لکھنوی انھیں مسیحا نفسوں میں سے ہیں، عزیزؔ نے لکھنؤ میں اور وحشتؔ نے بنگالہ

میں غالبؔ کو اپنا خضرِ راہ بنایا، مگر ان دونوں نے اندھی تقلید نہ کی۔ ان کی تقلید خلاقانہ تھی اور ان کی شاعری میں ان کی انفرادیت بھی نظر آتی ہے۔''
(مہر نیم روز، کراچی، وحشتؔ نمبر — ص:۵)

ڈاکٹر ابوللیث صدیقی نے وحشتؔ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے قدر شناسی کی دلیل دی ہے:

''جب علامہ رضا علی وحشتؔ نے غزل گوئی شروع کی تھی تو دورِ جدید میں اردو غزل کے سب سے پہلے سخت گیر نقاد مولانا حالیؔ زندہ تھے اور وحشتؔ نے انھیں سے خراج تحسین حاصل کیا، ویسے یہ بات محض رسمی بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن وحشتؔ نے اپنے کلام سے آخر دم تک خود کو اس تحسین و آفرین کا مستحق ثابت کیا جسے ادا کرنے والوں میں شبلیؔ، شررؔ، اقبالؔ، آرزوؔ، صفیؔ، حسرتؔ موہانی سب شامل ہیں۔''
(مہر نیم روز، کراچی، وحشتؔ نمبر — ص:۶)

پروفیسر آل احمد سرور کا یہ خیال بھی دیکھیے:

''وحشتؔ استادِ فن ہیں۔ فن کے لحاظ سے وحشتؔ کا درجہ بلند ہے۔''
(بحوالہ: دبستان وحشتؔ کا تنقیدی مطالعہ، از: ڈاکٹر راز عظیم — ص:۱۹۴)

قاضی نذرالاسلام کی سالگرہ کے موقع پر وحشتؔ سے استدعا کی گئی تھی کہ نذرالاسلام سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں۔ نذرالاسلام پر اپنے ریڈیائی انٹرویو کے دوران انھوں نے نذرالاسلام کی زندگی اور ان کے کردار کا ایسا پہلو روشن کر دیا جو اب تک تاریکی میں تھا۔ انٹرویو کے دوران انھوں نے جو کچھ کہا تھا اسے انھی کے الفاظ میں من و عن پیش کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

''مجھے جناب نذرالاسلام کی ملاقات کا شرف کلکتے میں حاصل ہوا تھا۔ کوئی آٹھ نو سال کا ذکر ہے کہ ایک فلم کمپنی نے جن کا اسٹوڈیو ٹالی گنج میں تھا، ارادہ کیا کہ ایک فلم بنائیں، جس میں عالمِ ارواح کا ایک مشاعرہ دکھایا جائے۔ شعرا میں جہاں تک مجھے یاد ہے، مشاعرہ کی شرکت کرنے والے میرؔ، غالبؔ، مومنؔ اور داغؔ قرار پائے اور ایسا انتظام ہوا کہ میرؔ کا پارٹ نذرالاسلام صاحب کو دیا جائے،

غالبؔ کا اس حقیر کو، مومنؔ کا ساغرؔ نظامی کو اور داغؔ کا جگرؔ مرادآبادی کو۔ غرض ہم
سب اسٹوڈیو میں موجود ہوئے اور میک اپ کے مراحل طے کیے گئے۔ شاعر
نذرالاسلام کی شخصیت کو میں نے بہت جاذب پایا۔ میرا خیال تھا کہ اردو میں
مکالمہ اور میرؔ کے اشعار کا پراثر طریقے سے پڑھنا، نذرالاسلام کے لیے مشکل
ہی ہوگا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ان کو اپنا پارٹ ادا
کرتے ہوئے دیکھا۔ میرؔ کے اشعار جذبات کی تصویریں ہیں۔ ان کی اداکاری
کے لیے نذرالاسلام ہی جیسا شخص چاہیے جس کو قدرت نے بلا کا حساس دل دیا
ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اردو آپ نے کب سیکھی۔ انھوں نے ایسا
جواب دیا کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ کہا کہ ''میرا ہم وطن وحشتؔ اردو کا مشہور شاعر
ہے، اس کا کلام پڑھنے کے لیے میں نے اردو سیکھی۔'' اپنی بے بضاعتی پر مجھے
خاص طور پر خجالت ہوئی کہ میں یہ نہیں کہہ سکا کہ میں نے آپ کا کلام پڑھنے کو
بنگلہ سیکھی ہے۔ مجھے نذرالاسلام سے مل کر میرؔ کا یہ شعر یاد آیا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی''

(مضامین وحشتؔ۔ ص ص: ۲۳۱-۲۳۰)

وحشتؔ کے مکتوب سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو، جو مولانا الطاف حسین حالیؔ سے ان کے عمیق مراسم کا بین ثبوت ہے:

''...........میں نے ایک مضمون لکھا تھا (شاید 'مخزن' میں) جس میں، میں نے
حالیؔ کی قدیم غزلوں سے بحث کی تھی۔ منجملہ اس کے اشعار کے ایک شعر میں،
میں نے خاص طور پر ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ اردو زبان کے بہترین اشعار میں اس
کا شمار ہوگا۔ وہ شعر یہ ہے:

سخت مشکل میں ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

مولانا حالیؔ کی نظر سے یہ مضمون گزرا تھا اور انھوں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ تم
ہی ایک شخص ہو جس نے میری شاعری کو شاعرانہ نقطۂ نظر سے دیکھا ہے ورنہ
میں تو قوم کا ایک مرثیہ گو سمجھا گیا ہوں۔'' (مکاتیب وحشتؔ۔۔۔ ص ص: ۱۳۱-۱۳۰)

مولانا ابوالکلام آزاد، وحشتؔ سے سات سال چھوٹے تھے، مگر علمی و ادبی حلقوں میں یکساں مقبول تھے۔ ۱۹۱۱ء میں مولانا محمد علی جوہرؔ نے کلکتے سے ہفت روزہ 'کامریڈ' کا اجرا کیا۔ نواب نصیر حسین خیال، محمد علی جوہر، اکبرالہ آبادی، نواب امداد امام اثر، نظم طباطبائی، مرزا محمد عسکری، قاضی عبدالحمید، مولانا ابوالکلام آزاد اور رضا علی وحشت جیسے اکابر ادب روزانہ شام کو 'کامریڈ' کے دفتر میں جمع ہوا کرتے اور خوب دلچسپ صحبتیں رہتیں۔ مولانا آزاد اور وحشت کے روابط پر روشنی ڈالتے ہوئے وفا راشدی اپنی خودنوشت سوانح حیات 'داستان وفا' میں رقم طراز ہیں:

''آزاد اور وحشتؔ کا آخری دور تھا۔ راقم نے ابھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا
تھا۔ اس ناچیز نے ان کے دوستانہ تعلقات کا منظر دیکھا۔ ان کی آنکھیں
دیکھیں۔ ان کی جوتیاں سیدھی کیں۔ دونوں کی مجلسوں سے فیض یاب ہونے کا
شرف حاصل کیا۔ وحشتؔ کو آزادؔ کے بالی گنج والے مکان میں اور آزاد کو وحشتؔ
کی ویلسلی اسٹریٹ پر واقع کوٹھی میں آتے جاتے دیکھا۔ یہاں تک کہ اس عاجز
وفقیر کو ان بزرگوں کے آستانوں میں سموسے اور چائے سے لذت یاب ہونے
کی سعادت حاصل رہی۔'' (داستانِ وفا۔۔۔ ص: ۶۵)

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ جب مولانا آزادؔ اور مولانا وحشتؔ کی ملاقات کو کئی دن گزر جاتے تو نظموں کے ذریعہ اظہارِ محبت اور جذبات کی ترجمانی کی جاتی۔ ایسے ہی ایک موقع پر علامہ وحشتؔ نے مولانا آزادؔ سے مخاطب ہو کر فارسی زبان میں ایک نظم 'تجدیدِ ملاقات' لکھی تھی۔ ملاحظہ ہو:

باز با آزادؔ تجدیدِ محبت کردہ ام
آنچہ دل از مدّتے میخواست وحشتؔ کردہ ام
بردہ ام تا آستانِ او جبینِ شوق را
از وفورِ آرزو سامانِ راحت کردہ ام

گوشِ دل را از پیامش دادہ ام ذوقِ نشاط
کام جاں را از کلامش غرق لذت کردہ ام
گرلقائش دیدہ ام آئینۂ حق دیدہ ام
در ثنا ئش کردہ ام عرضِ حقیقت کردہ ام
مصرعِ خود می برد وحشت مرا از خویشتن
باز با آزاد تجدیدِ محبت کر دہ ام

(ترانۂ وحشت —— ص ص:۱۵۴-۱۵۲)

حفیظ جالندھری سے بھی وحشت کے پرانے مراسم تھے۔ وفا راشدی کا بیان ہے......''میں میٹرک کے ایام طالب علمی میں حفیظ جالندھری کے گیت اور نظمیں دوستوں کے ساتھ لہک لہک کر پڑھا کرتا تھا۔ حفیظ صاحب سے کئی بار اسلامیہ کالج کلکتہ کے سالانہ آل انڈیا مشاعروں اور علامہ وحشت کے آستانے میں ملاقاتیں ہوچکی تھیں۔'' (میرے بزرگ میرے ہم عصر، ص: ۱۲۲)
عندلیب شادانی اردو کے شاعر اور ناقد کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں وحشت جب ڈھاکے چلے گئے تو وہاں بھی لوگ ان کے آگے پیچھے لگے رہے۔ اکثر مشاعروں میں بلائے جاتے۔ عندلیب شادانی، تمنا عمادی، نظیر صدیقی، کیفی چڑیا کوٹی وغیرہ کے ساتھ دلچسپ صحبتیں رہتیں۔ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو جناب افضل چھپراوی کے یہاں رات کے آٹھ بجے ایک نشست ہوئی۔ نظیر صدیقی کو جیپ پر وحشت اور عندلیب شادانی کو لانے بھیجا گیا۔ نظیر صدیقی وحشت کو لے کر شادانی صاحب کے یہاں پہنچے، اور وحشت سے کہا کہ آپ جیپ ہی میں تشریف رکھیں۔ میں شادانی صاحب کو لے آتا ہوں۔ شادانی صاحب جیپ کے پاس آئے تو دیکھا کہ اس میں وحشت بیٹھے ہیں۔ علیک سلیک کے بعد شادانی صاحب نے کہا۔ آخر لوگوں نے آپ کو بھی گھسیٹ ہی لیا۔ وحشت نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ جی ہاں۔ دیکھئے شاعر بننے کا مزہ۔ اس دوران نظیر صدیقی اور شادانی صاحب جیپ میں بیٹھ چکے تھے۔ بیٹھتے ہی شادانی صاحب نے وحشت کو یہ شعر سنایا:

گھسٹنا پڑ رہا ہے یوں شب و روز
خداوندا میں شاعر کیوں ہوا تھا

وحشت بہت محظوظ ہوئے (یہ شعر عندلیب شادانی نے فی البدیہہ کہا تھا۔ وہ اپنی بدیہہ گوئی کی وجہ سے بہت مشہور تھے) اور انھوں نے 'کیوں ہوا تھا' والے ٹکڑے کی خصوصیت کے ساتھ تعریف کی۔ اس پر شادانی صاحب نے کہا۔ اس کی داد دینا آپ ہی کا حصہ ہے۔ زبان کے لطیف گوشوں کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ (ڈاکٹر عندلیب شادانی - ایک مطالعہ، از: نظیر صدیقی - ص: ۷۷)
وحشت کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا۔ وہ احباب کی مجلسوں میں شریک ہوکر اپنی محبتوں کا ثبوت دیتے تھے۔ احباب بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ وحشت خود کہتے ہیں:

''میں ایک امر میں اپنے کو بہت خوش قسمت پاتا ہوں وہ یہ کہ میں اپنے عزیزوں کا ہمیشہ محبوب بنا رہا۔ خط وکتابت سب سے نہیں ہے لیکن سب کے دلوں میں میری یاد ہے اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے جتنی کہ میرے دل میں ان کی ہے۔'' (مکاتیب وحشت - ص: ۲۳)

وحشت کا شیوہ نکتہ چینی کبھی نہیں رہا۔ وہ کبھی کسی کے کلام پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:

فرصت کہاں مذمتِ دشمن جو میں کروں
وحشت مری زباں تو ہے وقفِ ثنائے دوست

حاصلِ کلام یہ ہے کہ وہ واقعی اپنے معاصرین میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ کہا تھا، تو غلط نہیں کہا تھا کہ:

پیچھے پیچھے تیرے ہو گا اہلِ فن کا قافلہ
وحشت اک دن تو ہی میرِ کارواں ہوجائے گا

یہ وہی شاعر ہے، جس نے علامہ جمیل مظہری، مولانا شاکر کلکتوی اور دیگر نامور شعرا کی تربیت اور ان کے فن کی آبیاری کی۔ ان کی شاگردی کے قافلے میں شعرا کی طویل فہرست ہے، لیکن افسوس

کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ناقدین اور محققین نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

تلامذۂ وحشتؔ

وحشتؔ نے اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک قافلہ چھوڑا ہے۔ جن شاگردوں نے ان سے اکتسابِ فن کیا اور وہ بھی جو صرف ان کی صحبت میں رہے، آج مطلعِ ادب پر روشن ستاروں کی مانند چمک رہے ہیں۔ وہ تلامذہ کے کلام کی اصلاح بھی کیا کرتے تھے اور ان کی کردار سازی بھی۔ بعض شاگردوں کے ساتھ دوستانہ روابط بھی تھے۔ اصلاح دینے سے وہ ہمیشہ بچتے رہے۔ کوئی ان کی شاگردی اختیار کرنا چاہتا تو اول تو وہ راضی نہ ہوتے مگر اصرار جب بہت زیادہ ہوتا تو مجبور ہو کر صرف اس لیے اصلاح دینا قبول کرتے کہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔ پروفیسر ارشدؔ کاکوی، ان کی شاگردی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ ضعیف ہو چلے تھے اور انھیں مختلف بیماریوں نے گھیر رکھا تھا۔ انھوں نے ارشدؔ کاکوی کو ڈھاکے سے ۲ نومبر ۱۹۵۱ء میں خط لکھا جس کا اقتباس یہ ہے:

> ''.......اصلاح کا لینا تو آج کل ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ میں تو پرانی لکیر کا فقیر ہوں اور قدیم طرزِ سخن کا دل دادہ ہوں۔ جدید طرزِ شعر کی غزلوں اور نظموں پر اصلاح دینے کی قابلیت اپنے میں ہرگز نہیں پاتا اور اب کہ ضعفِ پیری نے اعصاب اور دماغ کو معطل سا کر رکھا ہے۔ میں اس خدمت سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ ہرگز یہ نہ سمجھیے کہ میں ٹالتا ہوں۔ میں صدقِ دل سے یہ رائے دیتا ہوں کہ اگر اصلاح لینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو ڈاکٹر عندلیب شادانی سے استفادہ کیجیے۔ ان سے بہتر استاد کوئی آپ کو نہیں ملے گا۔ میرے دل میں ان کا بڑا احترام ہے۔''
> (مکاتیبِ وحشتؔ۔ ص ص: ۱۲۴-۱۲۵)

اس اقتباس سے شاگردی اور استادی سے متعلق وحشتؔ کے مزاج کا علم ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ ممکن نہ تھا کہ ہر کوئی ان سے شرفِ تلمذ حاصل کر لے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں کہ وہ بہت مغرور تھے۔ وہ نہایت فراخ دل انسان تھے۔ انسانیت نوازی ان کے خمیر میں پڑی ہوئی تھی، مگر کسی کو

شاگرد بنانے میں محتاط رہتے تھے، لیکن جو ان کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہو جاتا، اسے اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ وحشتؔ کے اس رویّے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت مختصر رہی ہوگی، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ وفاؔ راشدی اور اظہرؔ قادری کے مطابق وحشتؔ کے تلامذہ کثیر تعداد میں برصغیر ہند و پاک کے طول و عرض کے علاوہ برما، سیلون، افریقہ اور انڈونیشیا کی وادیوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں صاحب دیوان بھی تھے، صاحب تصانیف بھی اور کثیر التلامذہ بھی۔

وحشت نیک صفت انسان تھے۔ انھوں نے ہمیشہ لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کیے۔ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب عام اور اجنبی لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ رحمدلانہ تھا تو پھر اپنے تلامذہ کی خیر خواہی کے لیے وہ کیا نہ کرتے ہوں گے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد برسرِ روزگار نہیں ہے تو اسے اپنی طرف سے اس وقت تک جیب خرچ دیتے، جب تک اسے کہیں ملازمت نہ مل جاتی۔ صرف شاگرد ہی نہیں، بلکہ شاگردوں کے اقرباء کے لیے بھی ان کی شفقتوں کا وہی انداز ہوتا تھا۔ اس بیان کی دلیل میں پرویزؔ شاہدی اور رضاؔ مظہری کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ پرویزؔ شاہدی ان کے شاگرد نہ تھے، لیکن انھوں نے ان کی بے روزگاری دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ انھیں مختلف جگہوں پر لے گئے اور ان کی صلاحیتوں کا ذکر اس انداز سے کیا کہ پرویزؔ شاہدی کو یہ احساس ہوا کہ وحشتؔ کی زبان سے خود ان کے باپ کا دل بول رہا ہے۔ (نساخ سے وحشت تک، ص: ۱۶۱) ٹھیک اسی طرح رضاؔ مظہری جو علامہ جمیلؔ مظہری کے برادرِ خرد ہیں، بی-اے پاس کرنے کے بعد بے کار بیٹھے تھے۔ جمیلؔ مظہری نے اپنے چھوٹے بھائی کی بے روزگاری کا وحشتؔ سے تذکرہ کیا تو ان کو بڑی فکر ہوئی کہ کسی طرح ان کی بے روزگاری دور کر دی جائے۔ انھوں نے دوسرے ہی روز اپنے ایک مشفق نواب زادہ عبدالعلی صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ اب وحشتؔ کی زبان تھی، بھلا انکار کیسے ہوتا۔ ان کی تقرری بحیثیت مترجم کرا کے انھیں تار بھیج کر بلایا اور اس طرح رضاؔ مظہری کی بے روزگاری دور ہو گئی۔ بقول رضاؔ مظہری:

> ''میں بی-اے پاس کر کے وطن پر تلاشِ معاش میں سرگرداں تھا کہ دفعتاً بھیّا

(جمیلؔ مظہری) کا تار ملا کہ فوراً آؤ ملازمت مل رہی ہے۔ آیا تو معلوم ہوا بھیّا نے کبھی وحشتؔ صاحب سے میری بے کاری کا ذکر کیا تھا۔ وہ اس دن سے فکر میں تھے آخر اپنے محبِ محترم اے، اف، ام عبدالعلی صاحب کیپر آف امپریل ریکارڈس کے دفتر میں مجھے فارسی دستاویزات کے ترجمہ کے لیے منشی مقرر کرا دیا۔ نہ کوئی انٹرویو ہوا نہ میری علمی لیاقت کی کوئی جانچ کرائی گئی اس لیے کہ میرے ضامن حضرت وحشتؔ تھے۔'' (وحشت وتلامذۂ وحشت، مشمولہ 'سوغات' ۱۹۸۱ء، کلکتہ، ص: ۲۲۹)

حالاں کہ رضاؔ مظہری، وحشتؔ کے شاگرد نہ تھے۔ سوچیے کہ شاگرد کے چھوٹے بھائی کے لیے ان کے دل میں اتنی جگہ تھی تو پھر اپنے شاگردوں کے لیے ان کے دل میں کتنی جگہ رہی ہوگی۔ شاگرد بھی ایسے کہ مت پوچھیے، استاد پر جان نچھاور کرتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ وہ اپنے شاگردوں کے استاد بھی تھے اور دوست بھی۔ تلامذہ بھی اپنے استاد کا لحاظ/ خیال رکھا کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے انھیں شاگرد بھی ایسے میسر آئے، جوان ہی کی طرح اخلاق مند تھے۔ ان کے آپس کا خلوص دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ سب جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ ان کے درمیان کبھی کوئی رنجش تو کیا، شکر رنجی تک کا شائبہ نہ ہوتا تھا۔ ان میں رقابت نام کو بھی نہ تھی۔ یہ ہم آہنگی اور محبت شفیق استاد کے زیرِ اثر پروان چڑھی تھی۔ وحشتؔ کو اپنے تلامذہ کی بہبود کا خیال ٹھیک اسی طرح رہتا تھا جس طرح ایک شفیق باپ کو ہوتا ہے۔ وہ ان کی شادیوں میں شریک ہوتے اور سہرا بھی پڑھتے۔ وہ نہ صرف ان کے کلام کی اصلاح کیا کرتے تھے، بلکہ ان کی بھی اصلاح کیا کرتے تھے۔ ان کے کردار بھی سنوارا کرتے تھے اور ان کے اخلاق بھی درست فرماتے تھے۔ بے شک اچھا استاد دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ہے! وحشتؔ بڑے شاعر ہونے کے ساتھ بڑے انسان بھی تھے۔ وحشتؔ کے ہم عصر مولوی عبدالحق نے کہا تھا:

''محبت ہم ان سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت، خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے، جو چودھویں رات کی چاند۔ ان کے پاس جو گیا، کچھ بن کر آیا۔'' — ''بڑے لوگوں کی صحبت بھی اکسیر کی خاصیت رکھتی ہے۔ جوان سے چھوا، کندن بن گیا۔'' (عبدالحق، از: مختارالدین احمد، ص ص: ۱۱۴—۱۱۵)

مندرجہ بالا اقوال وحشتؔ کی ذات پر صادق آتے ہیں۔ وحشتؔ بھی انہی لوگوں میں سے تھے جن کی پاک سیرت، خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کو موہ لیتی ہے۔ جوان کے پاس گیا، کچھ بن کر آیا۔ جوان سے چھوا، کندن بن گیا۔ جن لوگوں نے وحشتؔ سے اصلاح لی آج وہ دنیائے ادب میں عزّت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ چند نام دیکھیے:

علاّمہ جمیل مظہری، شوق سندیلوی، عباس علی خاں بیخود، محمود اسرائیلی، وحید النبی وحید، بیدل عظیم آبادی، ابوجعفر کشفی، قربان علی عصری، آصف بنارسی، واصف بنارسی، قمر صدیقی، شاکر کلکتوی، محمود طرزی، ظفر ہاشمی، واقف بہاری، ناظر الحسینی، تاباں القادری، حافظ محمد حنیف اسلم، امیر الاسلام مشرقی، حسرت نعمانی، ابواللیث نصرت، اظہر قادری، سلیم اللہ فہمی، عابد داناپوری، وفا راشدی، اختر امام، عبدالکریم نشتر چھپروی، کوکب مرادآبادی، منشی مسیح الدین تمنّا، اقبال اعظمی، اثر صدیقی، حسن زہرہ وغیرہ۔

زیادہ تر شاگرد، ان سے برابر اصلاح لیتے رہے۔ کچھ نے تو تاعمر اصلاح لی۔ صرف کچھ شاگردوں نے ان سے چند غزلوں پر اصلاح لی۔ شوقؔ سندیلوی کا شمار بھی انہی تلامذہ میں ہوتا ہے۔ ابراہیم ہوشؔ نے بھی اپنی غزل پر وحشتؔ سے اصلاح لی تھی۔ حالانکہ وہ ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل نہیں تھے۔ ابراہیم ہوشؔ لکھتے ہیں:

''میں نے مشاعرے کے لیے غزل کہہ لی ہے اور اب اس کی اصلاح کا مسئلہ درپیش ہے۔ شاعری تو میں نے اسکول ہی کے زمانے سے شروع کردی تھی، لیکن اب تک باقاعدہ طور پر کسی کے آگے زانوے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی میں کوئی غزل کہتا اس کی اصلاح کے لیے کسی کہنہ مشق اور استاد قسم کے شاعر سے رجوع کرتا اور اس سے اصلاح کرا لیتا، چنانچہ اس وقت تک میں حضرت واصفؔ، حضرت آصفؔ اور حضرت بیخودؔ وغیرہ سے اصلاح لے چکا تھا۔ لیکن یہ مشاعرہ چونکہ عام مشاعروں سے الگ تھا، اور کلکتہ میں اپنی قسم کا سب سے بڑا اور سب سے اہم بھی۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ اس مشاعرہ کے لیے میں نے جو غزل کہی ہے، اس کی اصلاح کسی بڑے شاعر سے کراؤں اور یہ بڑا

شاعر میری نظر میں حضرت وحشتؔ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔''

(وحشت اپنے کردار کے آئینے میں، مشمولہ 'سوغات' ۱۹۸۱ء، کلکتہ، ص: ۲۵۱)

ہوشؔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

''حضرت وحشتؔ نے دس منٹ کے اندر میری غزل دیکھ لی اور دو ایک مصرعوں میں ترمیم کر کے اسے اچھی خاصی معیاری غزل میں تبدیل کر دیا۔''

(ایضاً، ص: ۲۵۵)

آسام کے گورنر سر اکبر حیدری بھی اپنا کلام ان کے پاس بغرض اصلاح بھیجا کرتے تھے۔ ایک دفعہ سر اکبر حیدری نے ان کے پاس اپنی نظم اصلاح کی غرض سے بھیجی۔ جب لفافہ ان کے ہاتھ میں پہنچا تو ان کے کچھ تلامذہ ان کی خدمت میں حاضر تھے۔ لفافے کی رنگینی اور تکلف سے فطری طور پر انھیں شوق پیدا ہوا کہ خط بھیجنے والے کا نام معلوم کریں۔ سب نے الگ الگ اصرار کیا۔ لیکن وحشتؔ نے لفافہ جیب میں رکھ لیا اور ٹال گئے۔ کچھ دنوں کے بعد کسی طرح حقیقت کھلی، مگر وحشتؔ کو نہ قبولنا تھا نہ قبولے۔ (سید اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص: ۱۷۹) اس معاملے میں وہ بہت محتاط رہتے تھے۔ شاگردوں کا نام تک نہیں لیتے تھے۔ نہ جانے کتنوں کی خفیہ طور پر اصلاح کی۔ یہ ادا بھی ان کی اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔ ایسی ہی کسی نشست میں پتا چلا کہ ناطقؔ لکھنوی کے بھانجے فطرتؔ واسطی بھی ان سے بذریعہ خط اصلاح لیتے ہیں۔ وہ گورکھپور میں ملازم تھے۔ تقسیمِ وطن کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے اور کسی کالج میں لکچرر ہو گئے۔

(وحشت و تلامذۂ وحشت، مشمولہ 'سوغات' ۱۹۸۱ء، کلکتہ، ص: ۲۳۳)

محمد اسحاق راشد نے 'یادگارِ وحشتؔ' کے عنوان سے ۱۹۸۱ء میں جو مجلّہ چھپوا کر وحشتؔ صدی کے اولین جلسے میں مفت تقسیم کیا تھا اس میں شانتی رنجن بھٹّا چاریہ نے اپنے مضمون 'میر کارواں —— وحشت' میں وحشتؔ کے تلامذہ کی جو فہرست دی ہے اس میں ان سے بعض غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جو عدم واقفیت کے باعث ہی وجود میں آئی ہیں۔ اس امر کی طرف رضاؔ مظہری نے بھی توجہ مبذول کرائی ہے۔ مثلاً شانتی رنجن بھٹّا چاریہ نے پروفیسر محمد طاہرؔ رضوی کو وحشتؔ کا شاگرد لکھا ہے، مگر طاہرؔ رضوی ان کے شاگرد ہرگز نہ تھے۔ اس لیے کہ وہ سرے سے شاعر ہی نہیں تھے۔ ہاں

یہ ضرور ہے کہ وہ وحشتؔ کے ارادتمندوں اور ان کے شاگردوں کے بے تکلف دوست تھے۔ دوسری غلطی شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے یہ کی کہ احسن احمد اشکؔ کو بھی وحشتؔ کے تلامذہ کی فہرست میں شامل کر لیا۔ اشکؔ چند مہینے کالج میں وحشتؔ کے درسی شاگرد رہے تھے۔ انھوں نے وحشتؔ سے اصلاح نہیں لی۔ وہ تو شروع ہی سے جمیلؔ مظہری کے شاگرد رشید تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کچھ دنوں تک اپنے کو جمیلی بھی لکھا، مگر بعد میں جمیلی لکھنا ترک کر دیا۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کو بھی تلامذہ کی فہرست میں رکھا ہے جبکہ وہ شمسؔ کلکتوی کے شاگرد تھے اور وحشتؔ کے استاد بھائی تھے۔ اس بیان میں رازؔ عظیم نے بھی ٹھوکر کھائی ہے اور شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی اندھی تقلید کی ہے۔ بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کی وفات پر علامہ جمیل مظہری نے ایک شعر کہا تھا جس میں جمیلؔ مظہری نے بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کو شمسؔ کا شاگرد بتایا ہے:

جناب شمسؔ راشاگرد ذیجاہ وگرامی بود
بگیتی مولوی بدرالزمانش نام نامی بود

شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے یہاں بھی غلطی کی ہے کہ وحیدالنبی وحیدؔ کو وحیدالٰہی بتایا ہے۔ اس ضمن میں رازؔ عظیم، شانتی رنجن بھٹا چاریہ کے مقلد ہیں اور وحیدالنبی وحیدؔ کو وحیدالٰہی وحیدؔ بتاتے ہیں۔ وحشتؔ کے غیر مقامی شاگردوں میں ایک نام شوقؔ سندیلوی کا بھی ہے۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے غیر مقامی تلامذہ میں شوقؔ سندیلوی کا نام سرے سے غائب کر دیا ہے۔ رازؔ عظیم نے بھی تلامذۂ وحشتؔ میں شوقؔ سندیلوی کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ وہ وحشتؔ کے شاگرد تھے۔ 'مکاتیب وحشتؔ' میں کئی خطوط ان کے نام موجود ہیں۔ عبدالعلی شوقؔ سندیلوی کے نام وحشتؔ کے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو، جو کلکتے سے ۱۴/ مارچ ۱۹۲۳ء میں لکھا گیا تھا:

''آج مدت کے بعد کرم فرماؤں کی غزلیں دیکھنے بیٹھا تو آپ کی بھی ایک غزل پر نظر پڑی۔ ندامت ہوئی کہ اتنے عرصے تک طاق نسیاں پر دھری رہ گئی۔''

(مکاتیب وحشتؔ —— ص: ۱۷)

وحشتؔ کے ایسے شاگرد تو بڑی تعداد میں تھے جنھوں نے وحشتؔ کے سوا کسی دوسرے استاد

سے اصلاح نہیں لی، بلکہ صرف وحشتؔ ہی سے اصلاح سخن کرتے رہے، لیکن ایسے تلامذہ کے علاوہ ان کے کچھ دوست بھی ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ ان کے چند استاد بھائیوں نے بھی ان سے اصلاح لی۔ مثلاً اکملؔ حسین اکملؔ، مرزا مقبولؔ اور عبدالکریم نشترؔ چھپروی نے شمسؔ کلکتوی سے بھی اصلاح لی اور وحشتؔ سے بھی مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ڈاکٹر جاوید نہال لکھتے ہیں:

"علامہ وحشتؔ کے مشہور شاگرد علامہ جمیلؔ مظہری، پرویزؔ شاہدی، شاکر کلکتوی، آصفؔ بنارسی، بیخودؔ کلکتوی، رضاؔ مظہری، محمد صدیقی کی شاعری کو اسی دبستان نے جلا بخشی۔" (متاعِ ادب — ص:۳۲)

حیرت ہوتی ہے کہ جاوید نہال سے اتنی بڑی غلطی کیسے سرزد ہوئی کہ انھوں نے پرویزؔ شاہدی اور رضاؔ مظہری کو وحشتؔ کا شاگرد لکھ دیا۔ حالانکہ یہ دونوں وحشتؔ کے شاگرد ہرگز نہ تھے۔ صحبت میں رہنا الگ بات ہے اور کلام پر باقاعدہ اصلاح لینا الگ۔ ہاں جمیلؔ مظہری، وحشتؔ کے شاگرد ضرور تھے۔ مگر پرویزؔ شاہدی اور رضاؔ مظہری نہ تھے۔ رضاؔ مظہری تو ہمیشہ اپنے برادر معظم جمیلؔ مظہری کو کلام دکھاتے تھے۔

وحشتؔ کے شاگردوں میں کچھ نے تو اتنی مقبولیت حاصل کی کہ بغیر ان کی شمولیت کے ادبِ اردو کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ انہی میں ایک نام جمیلؔ مظہری کا بھی ہے۔ جمیلؔ مظہری، وحشتؔ کے وہ شاگرد رشید ہیں جو مطلعِ ادب پر روشن ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں جب کلکتے میں اسلامیہ کالج قائم ہوا تو وحشتؔ اس میں اردو کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ جمیلؔ مظہری نے بھی اتفاق سے اسی کالج میں داخلہ لیا تھا۔ اس وقت کلکتے میں وحشتؔ کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ حالیؔ اور اقبالؔ ان کے فن کی عظمت کا اعتراف بھی کر چکے تھے۔ یہی وہ حالات تھے جن سے متاثر ہو کر جمیلؔ مظہری نے وحشتؔ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ دورانِ تعلیم انھوں نے ان کی خدمت میں ایک قطعہ لکھ کر پیش کیا۔ قطعہ یہ ہے:

پیچیدہ رسم و راہِ سخن دیکھ کر جمیل
مدّت سے آرزو تھی کوئی راہ بر ملے

وحشتؔ بھی ہیں طریقۂ غالبؔ پہ گامزن
یعنی جنابِ خضر مجھے ہم سفر ملے

(مونوگراف 'جمیل مظہری'، از: مظہر امام، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ص:۱۳)

قطعہ دیکھ کر وحشتؔ کا دل باغ باغ ہوگیا اور انھوں نے ان کو اپنے حلقۂ تلامذہ میں شامل کر لیا۔

جمیلؔ مظہری کو بھی اپنے استاد سے دلی ارادت تھی۔ وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ استاد کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں:

جمیلؔ اپنی غزل میں ہوش کی باتیں کریں کیوں کر
رفاقت ان کو بیخودؔ کی، تلمذ ان کو وحشتؔ سے

پیروے وحشتؔ ہے تو تقلید غالبؔ میں جمیلؔ
حال دل کوئی نہ سمجھے اس طرح فریاد کر

مطرب خلد سے سنی وحشتؔ خستہ کی غزل
آ گیا کچھ مزا جمیلؔ زمزمۂ حجاز کا

۱۹۶۸ء میں جب 'فکرِ جمیلؔ' شائع ہوا تو جمیلؔ مظہری نے اس کا انتساب وحشتؔ کے نام کر کے اپنی عقیدت کا ثبوت دیا۔ انتساب ملاحظہ ہو:

"انتساب
اپنے استاد محترم حضرت رضا علی وحشتؔ رَحمۃ اللہ علیہ
کے نام پر
بغیر ان کی اجازت کے، جس کا اب موقع نہ رہا
ان کا
جمیلؔ مظہری"

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سب ہی لوگ دانا و بینا تھے اور تخلیق و تنقید یا دونوں کی قوی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ ان اکابر اولین میں کوئی شاعر نہیں تھا، انہی دنوں میں تین نئے شاعروں کے چرچے ہونے لگے جو کسی نہ کسی خاص گروہ سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں بہر حال شاعری میں پیش قدم تھے۔ اقبال سہیل، فراق گورکھپوری اور جمیل مظہری، جمیل مظہری شاعر کی حیثیت سے ۳۵-۱۹۳۴ میں ابھرے۔ ان کی شاعری میں خستگی میر کی ہے، روانی انیس کی ہے لیکن تفکر اور بیان کی بلاغت کے ساتھ ندرت غالب کا فیض ہے اور یہ ہونا تھا اس لیے کہ وہ وحشت کلکتوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔''

(میرے بزرگ میرے ہم عصر — از وفا راشدی، ص:۱۵۴)

جب وحشت نے داعیِ اجل کو لبیک کہا تو دنیائے شاعری میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہر طرف کے شعرا نے مرثیے لکھے۔ ان کی وفات پر جمیل مظہری نے بھی اظہارِ افسوس کیا اور مرثیہ لکھ کر حقِ شاگردی ادا کیا، جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے استاد کے لیے ان کے دل میں کتنی عقیدت اور محبت تھی۔ جمیل مظہری کی غزلوں کا مجموعہ 'فکرِ جمیل' (۱۹۵۸ء) اور نظموں کا مجموعہ 'نقشِ جمیل' (۱۹۵۳ء) شائع ہو چکے ہیں۔ جبکہ مراثی، قصائد اور سلام کا مجموعہ 'عرفانِ جمیل' (لاہور ۱۹۶۹ء) کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے مراثی اور ملی نظموں کا ایک مجموعہ 'وجدانِ جمیل' (لاہور ۱۹۷۸ء) کے نام سے طبع ہوا۔ ایک مثنوی 'آب و سراب' ۱۹۶۳ء میں چھپی۔ طویل افسانہ 'فرض کی قربان گاہ پر/شکست و فتح' ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آیا۔

سید طاہر علی شاکر کلکتوی، وحشت کے ان شاگردوں میں تھے، جنھوں نے ان سے آخری عمر تک اصلاح لی۔ انھیں وحشت سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ سلسلۂ بنگالہ کے پانچویں مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان کی مادری زبان بنگلہ تھی، مگر ذریعۂ تعلیم اردو تھی۔ انھیں اردو اور فارسی پر مہارت حاصل تھی۔ پندرہ سال کی عمر سے شاعری شروع کی اور ایک غیر معروف شاعر مولانا شاطر سے مشورۂ سخن کیا۔ پھر انہی کی تحریک پر اکمل حسین اکمل کلکتوی کو اپنا کلام دکھایا۔ اکمل صاحب نے

ان کا ذوقِ شاعری، عبورِ زبان اور جوہرِ قابل دیکھ کر انھیں وحشت کے سپرد کر دیا۔ اس وقت سے لے کر آخر تک وہ دبستانِ وحشت سے جڑے رہے۔

شاکر کلکتوی کی پیدائش ۱۹۱۴ء میں اور وفات ۱۹۶۸ء میں ہوئی۔ وحشت ہی کی طرح ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ شعر و سخن سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ کلام میں رنگ وحشت صاف جھلکتا ہے۔ وحشت کے بہت قریبی شاگردوں میں تھے۔ وحشت نے بھی ان کے فن کا اعتراف کیا ہے۔ کہتے ہیں:

نہیں ہے شعر میں وحشت کا ہم نوا کوئی
بس ایک شاکرِ خوش فکر ہے خدا رکھے

شاکر صاحب کے نام اپنے مکاتیب میں وحشت رقم طراز ہیں:

''آپ کے کلام سے بوئے آشنا آتی ہے اور میں مست ہو جاتا ہوں۔''

(مکاتیب وحشت — ص:۴۹)

''جزاک اللہ۔ بے مثل غزل کہی ہے۔ پوری کی پوری غزل روح تغزل ہے۔''

(ایضاً — ص:۴۸)

''آپ کی غزلیں مستغنی عن الاصلاح ہیں۔ ان کی کیفیت اہلِ دل اور اربابِ فن ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اور یہ اب ڈھونڈے نہیں ملتے۔ خدا آپ کو خوش و خرم رکھے۔''

(ایضاً — ص:۴۹)

شاکر نہ صرف اردو کے شاعر تھے، بلکہ اردو زبان و ادب کے بے لوث خادم بھی تھے۔ انھوں نے اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک بزم بنام 'بزمِ شاکری' کی بنیاد ڈالی، جس کے متعلق وحشت نے یہ رائے قائم کی تھی:

خوب ہے بزمِ شاکری وحشت
جس کو بافیض باثر دیکھا

'بزمِ شاکری' آج بھی پارک سرکس کے گھاس بگان میں موجود ہے، جو کچھ نہ کچھ اردو زبان

کی ترقی کے لیے کرتی رہتی ہے۔ اس بزم نے متعدد کتابیں شائع کیں۔ اسی بزم نے 'مکاتیبِ وحشتؔ' شائع کیا۔ اسی بزم کے تحت شاکرؔ کلکتوی نے رسالہ 'شمس'، شمسؔ کلکتوی کی یاد میں نکالا، جو ہر ماہ نکلتا رہا، لیکن بعد میں مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ 'پریخانۂ الفت' شاکر صاحب کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو ان کی حیات ہی میں شائع ہو گیا تھا۔ شاعری کے متعلق شاکرؔ صاحب کا ذاتی نظریہ، یہ تھا:

میں سمجھتا ہوں کہ شاکرؔ از پئے لطفِ سخن
شعر میں وحشتؔ کا کچھ انداز ہونا چاہیے

قمرؔ صدیقی، وحشتؔ کے ہر دلعزیز شاگردوں میں تھے۔ بڑے خوش مزاج اور ملنسار شخص تھے۔ جب ملک تقسیم ہوا تو مشرقی پاکستان چلے گئے اور وہیں ۱۹۵۰ء میں حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ انھیں شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ماحول نے انھیں مکمل شاعر بنا دیا۔ انھوں نے وحشتؔ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ وحشتؔ انھیں اپنے بیٹوں کی طرح مانتے تھے۔ قمرؔ صاحب بھی وحشتؔ پر جان نچھاور کرتے تھے۔ ایک شعر میں وحشتؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

کمالِ نکتہ فہمی سے قمرؔ اپنا یہ دعویٰ ہے
کوئی وحشتؔ کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

یہ تو لائق شاگرد کا اپنے فائق استاد کے لیے عقیدت کا اظہار تھا۔ اب فائق استاد اپنے لائق شاگرد کے بارے میں کیا کہتا ہے، یہ بھی ملاحظہ ہو:

قمرؔ کے آنے سے محفل کو چار چاند لگے
سخن قمرؔ کے لیے ہے قمرؔ سخن کے لیے

قمرؔ صدیقی اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ اپنے اندازِ تغزل اور معنی آفرینی کی وجہ سے الگ شناخت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کا لطیف بیان ملتا ہے۔ ان کے کلام میں رنگِ وحشتؔ صاف عیاں ہے۔ ندرتِ خیال اور تشبیہات و استعارات کی دلکشی دلوں کو موہ لیتی ہے۔ جمیلؔ مظہری فرماتے ہیں کہ قمر صاحب کی تقلید شاید مشکل ہی نہیں ناممکن ہے:

بڑھا کر ہاتھ تارے آسماں سے کون توڑے گا
جمیلؔ اک کارِ ناممکن ہے تقلیدِ قمرؔ کرنا

قمرؔ صدیقی کی وفات پر وحشتؔ مچل اٹھے۔ اس لیے کہ وہ انھیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ وحشتؔ ان کی وفات سے متعلق امیر رضاؔ کاظمی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مومنؔ کے مرنے پر غالبؔ نے کہا تھا۔

کافر باشم اگر بمرگ مومنؔ　　چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

میں بھی اس موقع پر غالبؔ کے شعر کو اپنے حسبِ حال پاتا ہوں۔''

(مکاتیب وحشتؔ — ص:۱۳۳)

شاکرؔ کلکتوی کے نام خط میں ان کی موت کا ماتم کرتے ہیں:

''صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ اگرچہ صبر مشکل ہی سے آئے گا۔

دل سے کسی طرح نہ مٹے گا قمرؔ کا داغ
باقی رہے گا میرے جگر میں جگر کا داغ''

(ایضاً — ص:۵۲)

قمرؔ صدیقی کا مجموعۂ کلام 'تجلیاتِ قمرؔ' کے نام سے منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

پروفیسر عباس علی خاں بیخودؔ، وحشتؔ کے قریبی شاگردوں میں تھے۔ ۱۹۰۶ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے، لیکن بچپن سے لے کر آخر عمر تک کلکتے ہی میں مقیم رہے۔ کلکتے میں وفات ہوئی۔ کلکتے میں ان کے دم سے شعر و شاعری کی محفلیں آباد تھیں۔ انھیں شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ان کا ایک مختصر سا شعری مجموعہ بنام 'جامِ بیخودی' شائع ہوا جس کا دیباچہ وحشتؔ نے لکھا۔ وہ بزمِ احبابِ کلکتہ کے صدر اپنی موت کے وقت تک رہے۔ شہر کے مشاعروں کی صدارت بھی برابر کیا کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کے لیے بہت نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو دنیائے ادب میں بہت نمایاں ہو کر ابھرتے، لیکن انھوں نے شہرت اور ناموری حاصل کرنے کے ہتھکنڈے کبھی استعمال کرنے کی کوشش نہ کی۔ ان کے کلام کا ایک خاص رنگ ہے۔ مگر کہیں کہیں

استاد کا رنگ بھی جھلکتا ہے:

بیخودی سرحدِ ادراک و جنوں ہے بیخودؔ
اک قدم اور کہ طے عالمِ امکاں ہو جائے

———

جورِ خزاں کی یاد دلائی بہار نے
جب گل کوئی کھلا مرا چہرہ اتر گیا

———

غزل سرائی کی لذت ہے دیر پا بیخودؔ
مگر یہ دور نہیں بادۂ کہن کے لیے

بیخود اچھے نثر نگار بھی تھے۔ وحشتؔ پر جو مضامین اور کتابوں پر جو تقریظیں انھوں نے لکھی ہیں ان سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ نثر نگاری اور تنقید نگاری کو اپنا میدان بناتے تو ممتاز نقاد اور نثّار ہوتے۔ 'جامِ بیخودی' کی تقریظ میں وحشتؔ ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''پروفیسر عباس علی خاں بیخودؔ صاحب کی علمی استعداد مسلم ہے اور علمی استعداد کی ضرورت جیسی نثر نگاری میں ہے ویسی ہی شاعری میں بھی ہے۔ ماہرینِ فن ایک سرسری نظر میں اس بات کو مان لیں گے کہ بیخودؔ فنی نکات سے بخوبی واقف ہیں، اہل دل فوراً سمجھ لیں گے کہ اس میں جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔''

(جام بیخودی، کلکتہ، ۱۹۴۵ء، ص: ج)

۶ راگست ۱۹۶۹ء میں انھوں نے وفات پائی اور کلکتے ہی میں سپرد خاک کیے گئے۔

محمود طرزیؔ کا شمار بھی شاگردانِ وحشتؔ میں ہوتا ہے، مگر محمود طرزیؔ نے وحشتؔ کے علاوہ جمیلؔ مظہری سے بھی اصلاح لی۔ وہ کم گو تھے، لیکن بہ حیثیت شاعر مشاعروں میں بہت مقبول۔ مشاعروں میں کھڑے ہو کر گرجدار آواز میں اپنا کلام سناتے تھے۔ کلام سنانے کا ان کا ایک خاص انداز تھا۔ اسلامیہ کالج کے مشاعروں میں برابر شریک ہوتے تھے۔ چونکہ اسلامیہ کالج کے مشاعرے طرحی ہوا کرتے تھے اس لیے ایک مشاعرے میں وحشتؔ کی معروف غزل ''تمام رات

جلی شمع انجمن کے لیے'' پر طرح دی گئی تھی۔ انھوں نے وہ معرکہ آرا نظم پڑھی جس کا مطلع تھا:

ہے دل بتوں کے لیے اور دماغ فن کے لیے
خطا معاف ہو کیا رہ گیا وطن کے لیے

اور جب یہ شعر پڑھا:

بس انتہا ہے کہ اک بدنصیب بیٹی نے
حیا کو بیچ دیا باپ کے کفن کے لیے

تو مشاعرے میں سامعین کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ 'پرانا کوٹ' اور 'بیسوا' ان کی یادگار نظمیں ہیں۔ افسوس کہ ان کا سارا سرمایہ جو خود ان کے کلام اور دوسروں کے کلام کی نقلوں پر مشتمل تھا ڈھاکہ ہی میں رہ گیا۔ ورنہ اس دور کے شعرا کے کلام کا اچھا خاصا سرمایہ مل جاتا۔ ان کا یہ شعر تو ضرب المثل ہے:

قسم ہے آپ کو مضراب ساز ہستی کی
قلم کو تیغ بنا دیجیے وطن کے لیے

پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ عظیم آبادی کا نام وحشتؔ کے پرانے شاگردوں میں لیا جاتا ہے۔ ان کا مالوف وطن عظیم آباد ہے، مگر وہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں کلکتے میں مقیم تھے۔ اپنے قیام کلکتہ کے دوران مدرسہ عالیہ کے شعبہ انگریزی و فارسی میں معلّم رہے۔ اسی زمانے میں وحشتؔ کے زمرۂ شاگرداں میں شریک ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں ان کا تقرر بحیثیت فارسی و عربی لکچرر 'نیو کالج' پٹنہ میں ہوا۔ کہنہ مشق شاعر اور تجربہ کار استاد تھے۔ ان کا کلام 'نوائے بیدل' کے عنوان سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ وحشتؔ کلام بیدلؔ پر اپنا تاثر یوں پیش کرتے ہیں:

کلامِ بیدلِ رنگیں نوا ہے دید کے قابل
کہ اس کا صفحہ صفحہ رشکِ صحنِ گلستاں ہے
دلِ درد آشنا ہی درد کی لذت سے واقف ہے
ثنا خواں ہے وہاں وحشتؔ جہاں بیدلؔ غزل خواں ہے

وحشتؔ کے غیر مقامی شاگردوں میں ایک نام محمود اسرائیلی کا بھی ہے۔ ان کا اصل نام محمود الحسن ہے، مگر ادبی دنیا میں محمودؔ اسرائیلی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی ملّی نظمیں 'زمیندار' اور 'انقلاب' لاہور کے اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔ چونکہ آدمی مذہبی تھے اس لیے قومی اور اسلامی شاعری کیا کرتے تھے۔ حالی، شبلی اور اقبال سے متاثر تھے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے 'خیاباں' اور 'فردوسِ خیال' شائع ہو چکے ہیں۔

آصفؔ بنارسی اور واصفؔ بنارسی دونوں حقیقی بھائی تھے اور دونوں ہی وحشتؔ کے شاگرد تھے۔ یہ دونوں اگرچہ بنارسی تھے، لیکن بقول رضاؔ مظہری کلکتہ ہی دو پشت سے ان کا وطن ثانی بنا ہوا تھا۔ شاکرؔ کلکتوی ہی کی طرح آصف بنارسی کے شاگردوں کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا۔ آصف بنارسی کے شاگردوں نے اپنے استاد کے نام پر ایک انجمن بنام 'بزمِ آصفی' کی بنیاد ڈالی تھی جو اردو زبان کی ترقی کے لیے کام کرتی رہی۔ آصفؔ کے معاصرین انھیں فصیح العصر کہتے تھے۔ بہت ہی مرنجاں مرنج قسم کے انسان تھے۔ ان کے بارے میں جمیلؔ مظہری فرماتے ہیں:

''حضرت وحشتؔ کی وہ کون سی صفت ایسی ہے جس کا کچھ نہ کچھ حصہ انھیں نہیں ملا۔ حق کہ ان کی طبیعت کی مسکینی کا حق دار بھی یہی ہے۔''

(رازؔ عظیم، دبستان وحشت کا تنقیدی مطالعہ، ص:۱۶۱)

آصفؔ بنارسی کی غزلیہ شاعری سے متاثر ہو کر جمیلؔ مظہری نے کہا تھا:

ہوتی تاثیر اگر چیز چرانے کی جمیلؔ
رنگ آصفؔ کا چراتی غزلیت میری

مرزا ابو جعفر کشفی کو وحشتؔ اور ناطقؔ لکھنوی، دونوں سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزلیں بھی خوب کہیں مگر ان کا اصل میدان رباعی ہے اور رباعیات ہی میں ان کے فن کا اصل جوہر کھلتا ہے۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ 'مکاشفاتِ کشفیؔ' کراچی سے شائع ہوا۔ ان کی وفات بھی وہیں ہوئی۔ 'مکاشفاتِ کشفیؔ' میں جمیلؔ مظہری کا دلچسپ تعارف اور وحشتؔ کا مختصر مقدمہ شامل ہے۔

واقفؔ بہاری، وحشتؔ کے ابتدائی شاگردوں میں تھے۔ نظم و نثر دونوں پر مہارت تھی۔ فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے۔ افسوس ان کی زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی اور وہ عین جوانی میں انتقال فرما گئے۔ واصفؔ بنارسی نے ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ 'دردِ دل' کے عنوان سے شائع کیا جو اَب نایاب ہے۔ وحید النبی وحیدؔ، حسرتؔ نعمانی اور سلیم اللہ فہمیؔ دبستانِ وحشت کے اہم نام ہیں۔ وحید النبی وحیدؔ وحشتؔ کے ہم عمر تھے۔ قادر الکلام شاعر اور جلیل القدر ادیب تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے انگریزی، فارسی اور اردو تین زبانوں میں ایم-اے کیا تھا۔ انھوں نے کئی انگریزی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ کیا۔ ان کا ایک ڈرامہ 'خیر و شر' بہت مقبول ہوا۔ حسرتؔ نعمانی کو بھی نظم و نثر دونوں پر یکساں عبور تھا۔ ماہنامہ 'نگار' میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ حسرتؔ شاعر کے علاوہ اچھے محقق اور ناقد بھی تھے۔ انھوں نے بعد میں حیرت تخلص کیا۔ سلیم اللہ فہمی بھی نامور شاعر اور ادیب تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں اول درجے سے ایم-اے کیا تھا۔ ساری زندگی اردو ادب کی خاموش طریقے سے خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے بنگالی ادب کے متعدد شہ پاروں کا اردو ترجمہ کیا۔ وحشتؔ کے دامنِ فیض سے وابستہ تھے۔

ظفرؔ ہاشمی کا بھی وحشتؔ کے اہم شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ 'مکاتیب وحشتؔ' میں ان کے نام وحشتؔ کے کئی خطوط ملتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ مقالہ نگاری بھی کی۔ ان کے تین شعری مجموعے 'حسن کلام'، 'حسن خیال' اور 'تنویر عجم' شائع ہوئے۔ شاگردانِ وحشتؔ میں ایک نام امیر الاسلام مشرقیؔ کا بھی ہے۔ ان کی مادری زبان بنگلہ تھی، مگر عربی، فارسی، انگریزی، لاطینی اور فرانسیسی سے اچھی واقفیت تھی۔ اس باکمال شاعر کو تاریخ گوئی میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ قربان علی عصریؔ، وحشتؔ کے ہم عمر تلمیذ تھے۔ اچھے غزل گو اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ حافظ محمد حنیف اسلمؔ کو بھی وحشتؔ سے شرف تلمذ تھا۔ نعت گوئی ان کا اصل میدان ہے۔ ان کا ایک نعتیہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

ذکرِ نبیؐ بجائے اناالحق زباں پہ ہے
مایوس ہیں فسانۂ دارورسن سے ہم

وحشتؔ کے فراموش شدہ تلامذہ میں ابواللیث نصرتؔ بھی تھے۔ عابدؔ داناپوری، وحشتؔ کے

اچھے تلامذہ میں تھے۔ اصل میدان غزل گوئی تھی۔ ناظرؔ الحسینی، وحشتؔ کے دورِ آخر کے تلامذہ میں تھے۔ اچھے شاعر اور معروف ادیب تھے۔ صحافی کی حیثیت سے بھی مقبول تھے۔ کئی رسائل اور اخبارات کے مدیر رہے۔ 'عصرِ جدید' اور 'امروز' کی ادارت ان کا قابلِ ذکر کارنامہ ہے۔ ان کے کلام کا مختصر مجموعہ 'نکہت و نغمہ' اگست ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا جس میں جمیلؔ مظہری، عباس علی خاں بیخودؔ اور ابوجعفر کشفی کی تقاریظ شامل ہیں۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزادؔ کی حیات پر غیر معمولی کتاب 'میر کارواں' لکھی۔

تاباںؔ القادری بھی وحشتؔ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ انھیں شعر گوئی اور ادبی خدمات انجام دینے کا ذوق حد درجہ تھا۔ 'مشامِ روح' (شعری مجموعہ) کی شاعری اس بات کا ثبوت ہے۔ حیات نے ان کے ساتھ بے وفائی کی، ورنہ آج ان کا شمار معروف شعرا میں ہوتا۔ ان کے متعلق وحشتؔ کی رائے یہ ہے:

> ''تاباںؔ کلکتہ کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ ان کو شعر و سخن سے ایک فطری مناسبت ہے۔ ان کی طبیعت کی روانی، الفاظ کے حسن و قبح کی پہچان اور تخیل کی لذت نے انھیں صفِ شعرا میں ایک ممتاز جگہ دی ہے۔''
>
> (مشامِ روح، کلکتہ، ۱۹۵۱ء، ص: ج)

ان کے علاوہ اظہرؔ قادری، وفاؔ راشدی، اخترؔ امام، کوکبؔ مرادآبادی، منشی مسیح الدین تمناؔ، اقبالؔ اعظمی اور آثرؔ صدیقی بھی وحشتؔ کے اہم شاگردوں میں ہیں۔ حسن زہرہ وحشتؔ کے حلقۂ تلامذہ میں واحد شاعرہ ہیں۔ انھوں نے احسانؔ دانش سے بھی اصلاح لی۔ جب ڈھاکہ واپس آئیں تو وحشتؔ سے اکتسابِ فن کیا۔

تصانیف

وحشتؔ کی تصانیف میں تین مجموعہ ہائے کلام کے علاوہ مکاتیب و مقالات بھی شامل ہیں۔ انھوں نے ترجمے اور تدوین و تالیف میں بھی گراں قدر خدمت انجام دی۔ ان کی تصنیفات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ شعری اور نثری۔ تالیفات کو ہم الگ زمرے میں رکھیں گے۔ آیئے

پہلے ان کی شعری تصانیف پر نظر ڈالیں۔ وحشتؔ کے شعری سرمایے میں تین مجموعہ ہائے کلام ملتے ہیں۔ (۱) دیوانِ وحشتؔ (۲) ترانۂ وحشتؔ (۳) نقوش و آثار

دیوانِ وحشتؔ

یہ وحشتؔ کا اولین دیوان ہے جو ۱۹۰۹ء میں مرتب ہوا۔ جیسا کہ وحشتؔ کے اس قطعے سے ظاہر ہے:

قطعہ در تاریخ ترتیبِ دیوان

شد مرتب دفترِ اشعارِ من — مرحبا اے طالعِ مسعودِ نظم

خواستم وحشتؔ سنِ تاریخ را — گفت ہاتف ''کعبۂ مقصودِ نظم''

۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء

یہ دیوان پہلی دفعہ ۱۹۱۰ء میں ستارۂ ہند پریس، کلکتہ سے چھپا۔ وحشتؔ کا یہ قطعہ بھی دیکھیے:

قطعہ در تاریخ چاپ شدن دیوان

اینکہ دیوانِ من است آئینۂ حالِ من است — داشتم آنچہ بدل راز نہانی گفتم

گفتۂ دورِ شباب است، کہ وحشتؔ تاریخ — 'عیش افزا سخنِ عہدِ جوانی' گفتم

۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء

وحشتؔ اپنی مختصر خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۱۰ء میں دیوان وحشتؔ شائع ہوا تھا جس کے متعلق مولانا حالیؔ، علامہ شبلیؔ، ڈاکٹر اقبالؔ اور دیگر اکابرِ عصر نے نہایت حوصلہ افزا الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔''
>
> (مضامین وحشت، ص: ۱۰)

وحشتؔ کے اس دیوان میں غزلیں، نظمیں، رباعیات اور متفرقات شامل ہیں۔ الگ سے آخر میں فارسی کلام بھی موجود ہے جو غزلیات، رباعیات، تخمیس مطلع، سہرا، قطعات، مخمس، تہنیت، قصیدہ، پر مشتمل ہے۔ چالیس (۴۰) متفرق اشعار ہیں۔ جدید طرز کی پانچ نظمیں ہیں جبکہ رباعیات کی تعداد دس (۱۰) ہے۔ دیوان کا آغاز غزل سے ہوتا ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:

آئینۂ خیال تھا عکس پذیر راز کا
طور شہید ہو گیا جلوۂ دل نواز کا

غزلیں باعتبارِ ردیف باترتیب ہیں۔غزلوں کی کل تعداد ایک سو دو (۱۰۲) ہے جس میں آٹھ سو بانوے (۸۹۲) اشعار ہیں۔غزلوں کی باترتیب فہرست دیکھیے:

ردیف	الف	—	۱۹ غزلیں
,,	ب	—	۱ غزل
,,	پ	—	۱ غزل
,,	ت	—	۱ غزل
,,	ٹ	—	۱ غزل
,,	ث	—	۱ غزل
,,	ج	—	۱ غزل
,,	چ	—	۱ غزل
,,	ح	—	۱ غزل
,,	خ	—	۱ غزل
,,	د	—	۲ غزلیں
,,	ر	—	۵ غزلیں
,,	ڑ	—	۱ غزل
,,	ز	—	۳ غزلیں
,,	س	—	۲ غزلیں
,,	ش	—	۲ غزلیں
,,	ص	—	۱ غزل
,,	ط	—	۱ غزل
,,	ظ	—	۱ غزل

,,	ع	—	۱ غزل
,,	غ	—	۱ غزل
,,	ف	—	۲ غزلیں
,,	ق	—	۲ غزلیں
,,	ک	—	۱ غزل
,,	گ	—	۱ غزل
,,	ل	—	۱ غزل
,,	م	—	۲ غزلیں
,,	ن	—	۱۱ غزلیں
,,	و	—	۵ غزلیں
,,	ہ	—	۱ غزل
,,	ی	—	۲۸ غزلیں

اس دیوان کی دوسری اشاعت 'ترانۂ وحشتؔ' کے ساتھ ضمیمے کے طور پر مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ ہوئی:

> ''دیوان وحشتؔ جو ۱۹۱۰ء میں ستارۂ ہند پریس کلکتہ میں طبع ہوا تھا۔اس میں مصنف کا عنفوانِ جوانی کا کلام ہے۔جس وقت داغؔ دہلوی، امیرؔ لکھنوی اور جلالؔ لکھنوی کا آخری دور تھا۔مصنف ان اساتذہ کرام کے رنگِ کلام سے قدرتی طور پر ایک حد تک متاثر ہوا۔اگر چہ غالبؔ سے اسے برابر ایک خاص عقیدت رہی۔یہ دیوان اب ترانۂ وحشتؔ کے ساتھ بطورِ ضمیمہ پیش کیا جاتا ہے۔''
>
> (ترانۂ وحشت،ص:۱۷۵)

یہ دیوان اب بالکل نایاب ہے۔اس کا ایک ۱۹۱۰ء کا نسخہ نیشنل لائبریری، کلکتہ کی ملکیت ہے۔ ۱۹۱۰ء میں جب دیوانِ وحشتؔ شائع ہوا تو اس وقت مقتدر شعرا نے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔وحشتؔ کے اہم معاصرین نے جن کو وحشتؔ سے عقیدت اور انسیت تھی، قطعۂ تاریخ

کہا۔ یہاں کچھ قطعاتِ تاریخ درج کیے جاتے ہیں:

صفیؔ لکھنوی:

(ابیات بروش مثنوی مع سال تاریخ)

مژدہ کہ آراست دل آرای من　　خم کدۂ نواز شراب کہن
نامہ و دیوان فصاحت نشاں　　آمدہ چوں وحی بہ دردی کشاں
مست شدم مست ازاں جوی مئے　　تازہ دماغ و دلم از بوی مئے
رقصم ازاں بادۂ چوپیا نہ　　کامدہ از حضرتِ جا نا نہ
زانکہ ستم عاشقِ نادیدہ اش　　صید برام و گر دیدہ اش
اومہِ اوجِ سخن و ہالہ ام　　معتقدِ جادوی بنگالہ ام
وحشتِ فرزانۂ بیدار مغز　　از ہمہ دل برد بگفتار مغز
معجزۂ حسن خیالات او　　آیہ روشن زکمالات او
وہ چہ سخن گسترِ نازک خیال　　ہر غزلش مئو خترک از غزال
صید معانیش اسیرِ کمند　　پایۂ نظمش ز ثریا بلند
بردوش غالبؔ و میرؔ آمدہ　　شاعر بے مثل و نظیر آمدہ
از اثر طبع سخن گوی او　　فارسیش غازۂ اردوی او
خامۂ ایجاد گرش آفرید　　نظم دل افروز بطرز جدید
ناطقہ برجودت طبعش گواہ　　نیک بہر صنف سخن دستگاہ
حاصہ بصورت گرئی واقعات　　بردہ سبق از شعرائے ثقات
ہر غزلش مایۂ لذت ہمہ　　ماندۂ درد محبت ہمہ
نغمہ دراز زمزمہ اش ساز نطق　　کرحلاش ہمہ اعجاز نطق
شنکیم در علب ساغرے　　ہدیہ فرستاد برمن کو ثرے
تادل شور یہ بفرط عطش　　برلب آں چشمہ شود جرعہ کش
دیدہ کلامش ہمہ گفتم صفیؔ　　گوہر تاریخ بسفتم صفیؔ

ایں ہمہ از خوں جگر نقش بست　　گلکدہ یا دلکدہ وحشتؔ است

۱۹۱۰ء / ۱۳۲۸ھ

عزیزؔ لکھنوی:

قطعۂ تاریخ

شکراللہ کہ دردورِ سعید　　طبع شد خوب کلامِ وحشتؔ
نظراو وزاول الا بصا راست　　ایں خوش اسلوب کلامِ وحشتؔ
ریختہ از کلکتہ عزیزؔ ایں تاریخ　　ہست محبوب کلامِ وحشتؔ

(۱۹۱۰ء =) ۱۳۲۸ھ

محشرؔ لکھنوی:

قطعۂ تاریخ

تعالی اللہ چھپا دیوانِ وحشتؔ　　کہ جو رونق فزائے انجمن ہے
اثر کی روح کہیے ہر غزل کو　　تصدق عندلیب نغمہ زن ہے
خوشا جوشِ بہارِ نظمِ رنگیں　　کہ پھیکا رنگ گلہائے چمن ہے
کہو مصرع سالِ طبع محشرؔ　　یہ دیواں زینتِ بزم سخن ہے

۱۳۲۸ھ

شادؔ عظیم آبادی:

قطعۂ تاریخ

صدا حسنت وصد آفریں برمصنف　　کہ در جمع دیوان محسن ہا کشیدہ
بلے مدّتے غوطہ زد تابرآمد　　زدر یای فکرش گہر ہائے چیدہ
ندانہ کسے کر پئے کسب دانش　　چہا بر دل ذی کمالاں رسیدہ
سخن آفریں را ہزاراں نیایش　　زجمع سخن خاطرش آرمیدہ

پئے سالِ طبعش ندا کرد ہاتف
چہ گلہا زگلزار مضمون دمیدہ
۱۳۲۸ھ

اکبرالہٰ آبادی:

قطعۂ تاریخ

دیوان سے وحشت کے ہے ہر طبع کو اک انس
دل کھل گئے ہیں رنگ معانی کے چمن سے

حاصل ہوئی لذت ہی جو اشعار کو دیکھا
تاریخ بھی پیدا ہوئی تحقیقِ سخن سے
۱۳۲۸ھ

حسرت موہانی:

قطعۂ تاریخ

خوبیِ اشعارِ وحشت کا نہ پوچھو کچھ مزہ
میر و مرزا کا زمانِ شاعری یاد آگیا
مصرعۂ تاریخ کی مجھ پر بھی لازم آئی فکر
گو نہیں تاریخ گوئی سے مجھے کچھ واسطا
دیکھ کر حسرت مجھے اس درجہ سرگرم تلاش
بول اٹھا ہاتف جوابِ میر و غالب ہے چھپا
۱۳۲۸ھ

شفق عمادپوری:

قطعۂ تاریخ

یہ سطریں ہیں کہ موتی کی ہیں لڑیاں
زہے کلکِ گہر افشانِ وحشت

سخن منّت کشِ اہلِ سخن ہے
سخندانوں پہ ہے احسانِ وحشت

مضامینِ جنونِ فتنہ زا سے
قیامت خیز ہے سامانِ وحشت

شفق ہاتف پکارا سالِ تاریخ
کہ عشق آمیز ہے دیوانِ وحشت
۱۳۲۸ھ

رنجور عظیم آبادی:

قطعۂ تاریخ

حقیقت میں دیوانِ وحشت نہیں
یہ معشوق ہے اک ملیح و صبیح

نہ دی جائے گر داد دیوان کی
تو انصاف پر ہے یہ ظلم و صریح

جو رنجور تاریخ کی فکر ہو
تو لکھ دو کلامِ بلیغ و فصیح
۱۳۲۸ھ

حمید کلکتوی:

رباعی فی التاریخ

ایں نقش کہ از وحشت خوش تقدیر است
مقبولِ سخن وراں گزیں تحریر است

چوں فکر سنیں طبع کردیم حمید
ہاتف گفتا مبادی تسخیر است
۱۳۲۸ھ

آزاد عظیم آبادی:

قطعۂ تاریخ

چھپا دیوانِ وحشت میں نے دیکھا
سواد دیدۂ ارباب فن ہے

یہ ہے نور شعاع شمس مغفور
اسی سورج کی چٹکیلی کرن ہے

جہاں میں سحرِ بنگالہ کی ہے دھوم
یہ اس جادو اس افسوں کا چمن ہے

یہ ہے وہ نغمۂ شیریں بہ تحقیق
جوابِ طوطیِ لشکر شکن ہے

کھٹک ہے جس کی ہر پہلو میں وہ پھانس
وہ ناوک جس کی ہر دل میں چبھن ہے

پڑھیں پڑھ کر اسے خوش ہوں سخنور
کہ گلہانگِ گلستانِ وطن ہے

تعالی اللہ سال طبع دیواں نہال تازۂ لطفِ سخن ہے

۱۳۲۸ھ

ترانۂ وحشتؔ

یہ وحشتؔ کا دوسرا دیوان ہے، جو ۱۹۵۰ء میں ترتیب پا کر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ پورا کلام دو حصوں میں منقسم ہے، پہلا غزلیات اور دوسرا منظومات۔ متفرق اشعار بھی ہیں جن کی تعداد باسٹھ (۶۲) ہے۔ پہلے حصے کی شروعات حمد سے ہوتی ہے۔ اس حصے میں غزل کے فارم میں نعتیں بھی ہیں۔ اردو اور فارسی دونوں کلام ایک ساتھ ہے، لیکن ردیف کی ترتیب سے۔ دوسرا حصہ 'مشتمل بر مضامینِ مختلفہ' کے عنوان سے نظموں پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں بھی فارسی و اردو کلام ایک ساتھ ہے۔ اس حصے میں نظمیں، قطعات، تہنیت، رخصت، سہرا، مراثی وغیرہ شامل ہیں۔ اس مجموعے میں پبلشر اور پرنٹر دونوں کا نام درج ہے:

پبلشر : رشید احمد چودھری، مکتبہ جدید لاہور

پرنٹر : سویرا آرٹ پریس، لاہور

۱۹۱۰ء میں وحشتؔ کا پہلا دیوان شائع ہوا۔ ۱۹۱۰ء کے بعد سے ۱۹۵۰ء تک یعنی ۴۲ سالوں میں جو کلام جمع ہو گیا تھا وہ 'ترانۂ وحشتؔ' کے عنوان سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ اس دیوان کے سلسلے میں مزید جانکاری کے لیے آیئے ہم وحشتؔ کے مکاتیب کے اقتباسات پر نظر ڈالیں:

> ''میں تھوڑا وقت دیوان کی ترتیب میں صرف کرتا ہوں۔ دیوان کی اشاعت اگر ہو گئی تو سمجھوں گا کہ ایک کام ہو گیا۔''
>
> (مکتوب بنام بیخودؔ — ۳/جون ۱۹۵۰ء، مشمولہ: مکاتیب وحشت، ص: ۷)

> ''۱۹۱۱ء میں میرا دیوان چھپا تھا اب اس کا ایک نسخہ کہیں نہیں ملتا۔ اس کے چھپنے کے بعد بہت سا کلام جمع ہو گیا ہے۔ ارادہ ہے کہ ایک مجموعہ شائع کروں اور دیوانِ اوّل کو ضمیمہ بناؤں۔ اس وقت دیوان کے نقل کرنے میں مصروف ہوں۔''
>
> (مکتوب بنام ظفر ہاشمی — ۳۱/اگست ۱۹۵۰ء، مشمولہ: مکاتیب وحشت، ص: ۱۱۱)

مذکورہ اقتباسات سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

- وحشتؔ تھوڑا وقت دیوان کی ترتیب میں یعنی دوسرے دیوان کی ترتیب میں صرف کرتے ہیں۔
- ۱۹۱۰ء میں ان کا اولین دیوان چھپا تھا۔ یہاں انھوں نے ۱۹۱۱ء لکھا ہے۔ ظاہر ہے ان سے تاریخ لکھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ دیوان اول کا ایک نسخہ کہیں نہیں ملتا۔
- دیوان اول کی اشاعت کے بعد بہت سا کلام جمع ہو گیا ہے جسے اپنے دوسرے دیوان (ترانۂ وحشتؔ) کی شکل میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔
- وہ پہلے دیوان کو دوسرے دیوان کا ضمیمہ بنانا چاہتے ہیں اور دوسرے دیوان کو نقل کرنے میں مصروف ہیں۔
- دونوں خطوط ۱۹۵۰ء میں لکھے گئے۔

اس طرح یہ معلوم ہوا کہ وحشتؔ اپنے پہلے دیوان کی اشاعت کے بعد جمع ہوئے کلام کو ترانۂ وحشتؔ کے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ ترانۂ وحشتؔ کی ترتیب ۱۹۵۰ء میں مکمل ہوئی۔ اور ۱۹۵۱ء میں وحشتؔ نے اسے مکتبۂ جدید، لاہور کے حوالے کر دیا۔ اب مکاتیب وحشتؔ کے مزید دو اقتباسات ملاحظہ فرمایئے، تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ترانۂ وحشتؔ کی ترتیب ۱۹۵۰ء میں مکمل ہوئی اور ۱۹۵۱ء میں اسے ناشر کے حوالے کر دیا گیا:

> ''دیوان کے سلسلے میں اب تک کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ آج ہی مکتبۂ جدید، لاہور کے مالک کو ایک خط لکھا ہے۔''
>
> (بنام بیخودؔ — ۵/دسمبر ۱۹۵۰ء، مشمولہ: مکاتیب وحشت، ص: ۸)

> ''میرا دوسرا دیوان لاہور میں زیر طبع ہے ممکن ہے کہ چار پانچ مہینے میں چھپ جائے۔''
>
> (بنام شاکرؔ — ۲۵/اکتوبر ۱۹۵۱ء، مشمولہ: مکاتیب وحشت، ص: ۵۱)

پہلا خط ۱۹۵۰ء کا ہے جس سے معلوم ہوا کہ دیوان ترتیب پا چکا ہے اور ناشر سے رابطے کے لیے خط بھی لکھا جا چکا ہے۔ دوسرا خط ۱۹۵۱ء کا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ دیوان پریس میں جا چکا ہے اور چار پانچ مہینے میں چھپ بھی جائے گا، لیکن اس کی اشاعت ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ اس

کی تصدیق مکاتیبِ وحشتؔ سے ہوتی ہے۔ پروفیسر ارشدؔ کاکوی کو وحشتؔ ۱۶؍اپریل ۱۹۵۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ترانۂ وحشتؔ خدا جانے کن ترانوں پر مشتمل ہے کہ کوئی سن نہیں پاتا! دیکھیے کب تک مکتبۂ جدید قدم اٹھاتا ہے۔''

یہ خط ۱۹۵۳ء کا ہے اور ظاہر ہے ابھی تک ترانۂ وحشتؔ کی اشاعت نہیں ہوئی، مگر پروفیسر اختر حسین کے نام ۶؍جون ۱۹۵۳ء میں لکھے گئے خط سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ۱۶؍اپریل ۱۹۵۳ء اور ۶؍جون ۱۹۵۳ء کے دوران ترانۂ وحشتؔ شائع ہو گیا۔ وحشتؔ لکھتے ہیں:

''کتابت کے متعدد اغلاط رہ گئے کیوں کہ پروف مجھے نہیں دکھایا گیا۔''

(مکاتیب وحشت، ص:۱۴۰)

یہ ۱۹۵۳ء کے خط کا اقتباس ہے اور اس اقتباس سے صاف عیاں ہے کہ اب ترانۂ وحشتؔ شائع ہو چکا ہے اور اس میں کتابت کے متعدد اغلاط رہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف کو پروف نہیں دکھایا گیا تھا۔ شاکرؔ کلکتوی کو بھی ۱۶؍جون ۱۹۵۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''دیوان کا پروف مجھے نہیں دکھایا گیا تھا، کتابت کے بہت اغلاط رہ گئے جو باعث ملال ہیں۔ کیا کیجیے کہ کوئی چارہ نہیں۔'' (ایضاً، ص:۶۰)

ترانۂ وحشتؔ میں ایک تاریخ ۱۳۷۰ھ درج ملتی ہے۔ یاد رہے کہ ترانۂ وحشتؔ تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۷۰ھ کے عدد نکلتے ہیں جو ۱۹۵۰ء کے مطابق ہیں، لیکن وحشتؔ کے خطوط کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ترانۂ وحشتؔ کی اشاعت ۱۹۵۳ء میں ہوئی لیکن اس کی تدوین ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ اس طرح ۱۳۷۰ھ (=۱۹۵۰ء) سالِ اشاعت نہیں، بلکہ سالِ تدوین ہے۔ ترانۂ وحشتؔ کا دوسرا اڈیشن ۱۹۶۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔

نقوش و آثار

'ترانۂ وحشتؔ' ۱۹۵۰ء میں ترتیب پا چکا تھا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد وحشتؔ ۲۰؍جولائی ۱۹۵۶ء تک

زندہ رہے۔ اس دوران انھوں نے جو کچھ تخلیق کیا اسے ان کی وفات کے بعد ۱۹۵۷ء میں 'نقوش و آثار' کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں مکتبۂ عارفین، قرآن منزل ڈھاکہ سے شائع کیا گیا۔ یہ وحشتؔ کا تیسرا اور سب سے آخری مجموعۂ کلام ہے جس میں ۱۹۵۰ء کے بعد کا کلام ہے۔ اسے 'تتمۂ ترانۂ وحشتؔ' بھی کہا گیا ہے۔

وحشتؔ کی شعری تصانیف کے بعد آئیے اب ان کی نثری تصانیف پر نظر ڈالیں۔ ان کی نثر نہایت شستہ، رواں اور دلکش ہے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں اور کرم فرماؤں کے نام بہت سے خطوط لکھے۔ شاگردوں اور ہم عصروں کی کتابوں کے دیباچے اور ان پر تبصرے تحریر کیے۔ کئی اچھے مضامین اور مقالات بھی قلمبند کیے، جن کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔

مضامینِ وحشتؔ

وحشتؔ صرف اچھے شاعر ہی نہیں، بلکہ اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان میں تحقیقی اور تنقیدی میلان بھی تھا۔ انھوں نے متعدد مضامین لکھے، جن کے مطالعے کے بعد ان کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے بکھرے ہوئے مضامین کو ۱۹۸۲ء میں جمال احمد صدیقی نے مرتب کر کے 'مضامینِ وحشتؔ' کے عنوان سے مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی جانب سے شائع کیا، جس میں تعدادِ اشاعت ایک ہزار، مطبع فوٹو آفسٹ پرنٹرس۔ کلکتہ-۱۷ اور قیمت ۱۷ روپے درج ہے۔ کل صفحات ۲۴۰ ہیں۔ جمال احمد صدیقی کتاب کے 'پیش لفظ' میں لکھتے ہیں:

''مضامینِ وحشتؔ، علامہ رضا علی وحشتؔ مرحوم کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک لکھے اور ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ان مضامین میں کچھ تنقیدی ہیں اور کچھ تحقیقی، کچھ تبصرے ہیں اور کچھ ریڈیائی بات چیت — یہ مضامین مخزن، لاہور خاور، ڈھاکہ، جدید اردو، کلکتہ- جادو، ڈھاکہ۔ ماہ نو، کراچی مہر نیم روز، کراچی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مضامین کچھ تو یہاں کی لائبریریوں سے اور کچھ احباب سے حاصل ہوئے اور کچھ خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے زیروکس کاپی کر کے منگوائے گئے ہیں۔ چند

مضامین مغربی بنگال اردو اکیڈمی، کلکتہ سے بھی دستیاب ہوئے۔ ان مضامین
کے علاوہ اور بھی بہت سارے مضامین ہیں جو باوجود سراغ کے رسائل متعلقہ کی
عدم دستیابی کی وجہ سے شاملِ مجموعہ نہ کیے جا سکے جس کا مجھے دلی افسوس ہے۔''
(مضامینِ وحشت — ص: ۷)

کتاب کا مقدمہ بنگال کے معروف محقق ڈاکٹر عبدالروٗف نے لکھا ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون 'وحشت بہ زبانِ خود' ہے۔ اس کے علاوہ گیارہ (۱۱) اہم مضامین یہ ہیں — 'کلامِ ولی'، 'شیخ علی حزیں'، 'غنیمت'، 'تغزل میں اصلاح کی ضرورت'، 'اردو کا تعلق بنگالہ سے'، 'اصلاحِ غزل'، 'مولانا حالی کی غزل گوئی'، 'بنگال کا ایک شاعر — سید محمود آزاد'، 'بنگالہ کا ایک شاعر — قاضی محمد صادق اختر'، 'عبدالغفور نساخ'، 'شمس کلکتوی'۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے نام ایک طویل مکتوب، شاعری اور ادب (ریڈیائی تقریر)، ریڈیائی تقریر بسلسلۂ قاضی نذرالاسلام سالگرہ اور ایک تبصرہ 'نشاطِ رفتہ' شامل ہے۔

وحشت کا ایک اہم مضمون 'غالب کا اندازِ بیان'، 'مضامینِ وحشت' میں شامل نہیں ہے۔ لطیف صاحب کی کتاب 'نساخ سے وحشت تک' میں خصوصی طور پر یہ مضمون شامل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون 'نقاد' (آگرہ) جنوری ۱۹۲۰ء میں چھپا تھا۔ 'غصہ اور اس کے نتائج' وحشت کا وہ نایاب مضمون ہے جو 'مضامینِ وحشت' میں شامل نہیں ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ 'شمس' کلکتہ (جلد اول، شمارہ ۳) دسمبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔

مکاتیبِ وحشت

وحشت نے اپنی ۷۵ سالہ حیات میں جو خطوط لکھے وہ ادبی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں، جن کے مطالعے سے حیاتِ وحشت کے کئی باب روشن ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں بھی ان کے اسالیب نثر کا حسن شامل ہے۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ شعر میں انھوں نے غالب کا اثر قبول کیا، لیکن نثر میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ان کا نثری اسلوب جداگانہ اور ہر طرح کے تتبع سے پاک ہے۔ حاجی شمس الدین احمد عازم نے وحشت کے مکاتیب کو ترتیب دے کر 'بزمِ شاکری' کلکتہ کی

جانب سے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ 'مکاتیب وحشت' میں کل ایک سو بیاسی (۱۸۲) خطوط ہیں، جو وقتاً فوقتاً ۲۳ اشخاص کے نام لکھے گئے تھے۔ سارے خطوط مکتوب الیہ کے ناموں کے حروفِ تہجی کے مطابق ترتیب دیے گئے ہیں۔

'بزمِ شاکری' نے وحشت کے خطوط جمع کر کے جب انھیں منظرِ عام پر لانا چاہا تو وحشت سے اجازت طلب کی۔ اس کے جواب میں وحشت نے جو لکھا، اس سے ان کی عزت ہماری نگاہ میں مزید بڑھ جاتی ہے:

''یہ معلوم کر کے کہ ارکانِ بزمِ شاکری کا ارادہ ہے کہ میرے مکتوبات کا مجموعہ شائع کریں۔ ان کو جو عقیدت مجھ سے ہے وہ پرزور طریقے سے ظاہر ہوئی۔ اگرچہ یوں بھی ظاہر تھی۔ عقیدت کے بھی تقاضے عجیب ہوتے ہیں۔ کسی بات کا امکان یا عدم امکان قابلِ غور بھی نہیں سمجھا جاتا۔ میرے عزیز کچھ بھلے برے اشعار میں نے ضرور کہے ہیں۔ جنھیں چالیس پچاس سال ہوئے کچھ لوگوں نے پسند کیا تھا لیکن مجھے اکابرِ عصر اور دیگر شعرا سے خط و کتابت کرنے کی عادت کبھی نہ تھی۔ میں اس معاملے میں قدرتی طور پر کوتاہ قلم واقع ہوا ہوں۔ میرے پاس جتنے خط آتے ہیں میں ان کے جواب لکھنے کے بعد ان کو نذرِ آتش کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اور حضرات بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔

بعض لوگ خطوط خوب لکھتے ہیں جن میں مزے مزے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ایسے خطوط اگر چھاپے جائیں تو مطبوع طبائع ہوں۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر بزمِ شاکری اپنے ارادے کو جو ناقابلِ عمل ہے ترک کر دے۔ اس کے لیے نہایت ضروری کام یہ ہے کہ شاکر صاحب کا مجموعۂ کلام شائع کر دے تا کہ لوگ دیکھیں کہ اردو شاعری بااعتبارِ فن و بااعتبارِ خیالات کس بلند مقام پر پہنچائی گئی ہے۔''
(بنام محمد عارف واثق، مکاتیب وحشت — ص ص: ۱۲۱-۱۲۰)

لیکن بزم کے اراکین برابر اصرار کرتے رہے اور آخر مجبور ہو کر وحشت نے لکھا:

''بزمِ شاکری اس پر مصر ہے کہ میرے مکتوبات شائع کیے جائیں۔ میں اب کچھ

نہیں کہوں گا۔ اگر میرے مکتوبات جو بہت کم بھی تھے اور اب نایاب بھی ہیں،
آپ کو مل سکیں تو اپنی خواہش پوری کیجیے۔'' (ایضاً۔ص:۱۲۲)

اور اس طرح بزمِ شاکری کو مکاتیب کی اشاعت کی اجازت مل گئی اور شمس الدین احمد عازمؔ نے 'عرضِ مرتب' میں لکھا:

''ہمیں الفاظ نہیں ملتے کہ ہم اپنے بزرگ علامہ رضا علی وحشتؔ مدظلہ العالی کا شکریہ ادا کر سکیں۔ جنھوں نے اپنی بے انتہا شفقت و محبت سے کام لیتے ہوئے ہم کو ہمارے اصرار پر اپنے مکاتیب کی اشاعت کے لیے اجازت دے دی اور ہمیں ایک عظیم ادبی خدمت انجام دینے کا موقع عنایت فرمایا۔''
(عرضِ مرتب، مکاتیب وحشت، ص:۴)

'مکاتیب وحشتؔ' کے علاوہ بھی وحشتؔ نے متعدد خطوط لکھے جو بالعموم دستیاب نہیں ہیں۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ ان کے بعض خطوط آج بھی چند لوگوں کی ذاتی تحویل میں ہیں، اور ان کی بے توجہی کا شکار ہیں۔ وحشتؔ کے چند خطوط 'مہرِ نیم روز' کراچی کے 'وحشتؔ نمبر' اور 'نقوش' لاہور کے 'مکاتیب نمبر' میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ وفاؔ راشدی کی کتابوں میں بھی وحشتؔ کے چند خطوط کے اقتباسات مل جاتے ہیں، جن کے ماخذ تک رسائی تحقیق وتنقید کے باب میں ضروری ہے۔ وفا راشدی کے نام لکھے ہوئے وحشت کے پانچ مکاتیب 'وحشت شناسی' (مرتبہ: سید علی عرفان نقوی) میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ خطوط بھی 'مکاتیب وحشت' میں شامل نہیں ہیں۔ ڈاکٹر عندلیبؔ شادانی کے نام وحشتؔ کا ایک مکتوب، جو طوالت کی وجہ سے مضمون کی شکل اختیار کر گیا ہے 'مضامین وحشتؔ' (مرتبہ: جمال احمد صدیقی) میں شامل ہے، یہ خطوط 'مکاتیب وحشتؔ' کے مندرجات میں نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ از سرِ نو وحشتؔ کے خطوط مع 'مکاتیبِ وحشتؔ' مرتب کیے جائیں، جن سے وحشتؔ شناسی کے کئی اہم پہلو روشن ہو سکتے ہیں۔

مقدمے، تبصرے، تقاریظ، پیش لفظ

مکاتیب ومقالات کے علاوہ وحشتؔ نے جو تبصرے، مقدمے اور تعارفی مضامین قلم بند کیے،

ان کی ایک فہرست یہ ہے:

- مقدمہ —— دیوانِ شمسؔ (کلامِ شمسؔ کلکتوی)
- تعارف —— جامِ بیخودی (کلامِ عباس علی خاں بیخودؔ)
- پیش لفظ —— پیامِ نو (ہندوستان کے ۳۶ شعرا کا تذکرہ اور انتخاب کلام، از: وفاؔ راشدی)
- وجہِ تسمیہ —— تجلیاتِ قمرؔ (کلامِ قمرؔ صدیقی)
- تبصرہ —— نشاطِ رفتہ (کلامِ عندلیبؔ شادانی)
- تبصرہ —— تحقیقات (عندلیب شادانی کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ)
- تقریظ —— نظمِ اردو (کلامِ ناطقؔ لکھنوی)
- تقریظ —— شعلۂ رنگین (کلامِ جرم محمد آبادی)
- تقریظ —— مشامِ روح (کلامِ تاباں القادری)
- تقریظ —— مکاشفاتِ کشفیؔ (کلامِ ابو جعفر کشفی)
- تقریظ —— وحشتؔ کی اس غیر مطبوعہ تقریظ کا علم رضا نقوی کے اس بیان سے ہوتا ہے:

''یہاں تک کہ آپ (جمیلؔ مظہری) کے شفیق استاد، امام الشعرا حضرت رضا علی وحشتؔ نے کلام کی اشاعت کی خبر سن کر از راہِ شفقت ایک چھوٹی سی تقریظ ڈھاکے سے لکھ کر بھیجی، مگر اسے بھی شائع کرنے کی اجازت مجھے علامہ موصوف (جمیلؔ مظہری) نے نہ دی۔'' (نقشِ جمیلؔ۔۱۹۵۳ء)

وحشتؔ کی تقاریظ اور تبصروں کی تعداد اور زیادہ ہے، لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود میری نظر ان پر نہ پڑ سکی۔

تالیفات

وحشتؔ کی تالیفات کی حیثیت بھی تاریخی ہے۔ ان کی تالیفات 'دیوانِ شمسؔ' اور 'خواب و خیال' ہیں۔ ان کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

دیوانِ شمس

وحشت نے اپنے استاد ابوالقاسم محمد شمس کلکتوی کا دیوان ۱۹۱۹ء میں ترتیب دیا۔ جیسا کہ آصف بنارسی کے اس قطعے سے ظاہر ہے:

تاریخ ترتیبِ دیوان

از: آصف بنارسی

مژدہ، کہ ترتیب یافت دفترِ اشعارِ شمس — پیش ازیں کس ندید دفترِ رنگیں چنیں
یافت سنِ عیسوی آصف نازک خیال — ''زمزمۂ دلفریب نغمۂ ناز آفریں''
۱۹۱۹ء

اس دیوان کی اشاعت ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ مندرجہ ذیل قطعاتِ تاریخ دیکھیے:

قطعہ تاریخ طبع دیوان شمس

از: محمد یوسف رنجور عظیم آبادی

یہ سالِ طبع مرے دل نے مجھ سے اے رنجور — 'کلامِ شمس سخن سنج، واہ! واہ'!! کہا
۱۹۲۰ء / ۱۳۳۸ھ

قطعہ تاریخ طبع دیوان شمس

از: منشی عبدالکریم نشتر چھپروی

سالِ ہجری تو لکھ دے اے نشتر — 'رونقِ بزم ہے بہارِ سخن'
۱۹۲۰ء/۱۳۳۸ھ

یہ دیوان اب نایاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ نیشنل لائبریری، کلکتہ اور ایک نسخہ اشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں موجود ہے۔ بادامی کاغذ پر بڑی تقطیع کے ایک سو چار (۱۰۴) صفحات پر یہ دیوان پھیلا ہوا ہے۔ دیوان کے شروع میں وحشت کا تحریر کردہ ساڑھے تین صفحوں پر مشتمل ایک مقدمہ ہے۔ اس کے علاوہ ۸۰ر صفحات میں غزلیات ہیں جن کی تعداد ۱۹۶ر ہے۔ ان میں اشعار کی کل تعداد ۱۴۹۲ ہے۔ ۲۱ر صفحات پر مشتمل رباعیات، مسدس، مثنوی بطور ساقی نامہ، قطعاتِ تاریخ ہیں۔

قصائد اور سہرے بھی شاملِ دیوان ہیں۔ اس دیوان کے سلسلے میں وحشت کا بیان یہاں نقل کرنا، نامناسب نہ ہوگا:

''استاذی حضرت شمس کے انتقال کو پندرہ برس گزرے۔ نہایت افسوس ہے کہ ان کا کلام اس سے قبل نہیں شائع ہوسکا۔ ان کا کلام ان کی وفات کے بعد ان کے کسی عزیز کے ہاتھ لگا جو برابر یہی کہتے رہے کہ ہمارے پاس نہیں ہے! ایک دن محبّی جناب عبدالمجیب خان صاحب قیصر سے ذکر آیا۔ معلوم ہوا کہ ان کی اہلیہ کے پاس جن کو شمس مرحوم سے رشتۂ قرابت تھا کچھ کاغذات مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ میری اور مرحوم محمد یوسف خان عشرت کی درخواست پر وہ کاغذات عاریتاً میرے حوالے کیے گئے۔ دیکھا تو استاد مرحوم کے کلام کا ایک معقول ذخیرہ تھا مکمل دیوان نہ تھا لیکن اکثر ردیفوں پر غزلیں تھیں۔ بہت سی غزلیں ناتمام ملیں اور کلام کا کچھ حصہ جو پنسل سے لکھا تھا اس قدر مٹا ہوا تھا کہ پڑھا نہ گیا۔ خیر جو کچھ میرے ہاتھ لگا میں نے اس کو غنیمت سمجھا۔ کچھ خود نقل کیا کچھ کاتب سے لکھوایا۔ زیادہ حصہ عزیزی جناب قربان علی صاحب نے نقل کیا اور سب کو باعتبار ردیف جمع کیا۔ مرحوم سید ابوظفر واقف بہاری نے کلام کے چھپوانے کی خدمت اپنے ذمہ لی لیکن اس عزیز کے انتقال حسرت مآل سے یہ کام عرصہ تک ملتوی رہا۔ پھر عزیزی جناب عبدالرحمٰن صاحب آصف بنارسی نے پروف دیکھنے کا کام نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ۱۳۳۷ھ میں دیوان پریس میں بھیجا گیا تھا ۱۳۳۸ھ کے اخیر تک قریب قریب تمام چھپ گیا۔ تھوڑا سا باقی رہ گیا تھا جو ماہ صفر ۱۳۳۹ھ میں پورا کیا گیا۔''

(مقدمہ دیوانِ شمس — از: وحشت)

خواب وخیال (انگریزی اردو گرامر)

وحشت کے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''میری کتاب Hindustani Reading Book کی کاپیاں کاظمی صاحب کے پاس ہیں اور وہ اسے Jute mill والوں کے ہاتھ فروخت

کرتے رہتے ہیں۔'' (مکاتیبِ وحشت-ص:۱۲)

یہ وہی ہندوستانی ریڈنگ بک ہے جو'خواب وخیال' کے عنوان سے ۱۹۱۱ء میں انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے وحشت نے مرتب کی تھی۔اس کی افادیت کے پیش نظر اس کے کئی متواتر ایڈیشن شائع ہوئے۔اس کے آٹھویں ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۳۹ء میں صحیح تلفظ کے لیے انگریزی کے ساتھ اردو لفظوں کو دیوناگری رسم الخط میں بھی شامل کیا گیا۔اس کتاب کی ترتیب میں کرنل فیلوٹ کا تعاون شامل تھا۔اس کے تقریباً سبھی ایڈیشنوں میں وحشت کا ایک نوٹ انگریزی میں شامل ہے۔دسویں ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۴۲ء کے ناشر فقیر چند مروہ تھے اور اس کی قیمت تین روپے بارہ آنے تھی۔یہ کتاب نصابی ضرورت کے لیے ترتیب دی گئی تھی جو اب نایاب ہے۔کتاب کے سرورق پر درج ہے:

"For the higher standard examination in Urdu".

ترجمہ

سرمایۂ وحشت میں تصنیفات وتالیفات کے علاوہ ترجمہ بھی ملتا ہے جو'سپاہی سے صوبہ دار' کے نام سے شائع ہوا۔

سپاہی سے صوبہ دار

اجودھیا کا ایک شخص (سیتارام) کمپنی کی فوج میں ملازم تھا۔اپنی ۴۸ رسالہ نوکری کے بعد جب وظیفہ خوار ہوا تو شاید کسی افسر کے ایما پر اس نے اپنی سرگذشت ہندی زبان میں لکھی۔اس کا ترجمہ کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار میں (۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۳ء) قسط وار شائع ہوا۔پھر کتابی شکل میں لاہور کے وکٹوریہ پریس سے اس کی اشاعت ہوئی۔ہندی متن (۱۸۷۴ء) کا نسخہ اب ناپید ہے اور انگریزی ترجمہ بھی کمیاب ہے۔

ڈی-سی فیلٹ (D. C. Phillatt) اور وحشت کے عملی اشتراک سے اس کا اردو زبان میں

ترجمہ ہوا۔فوجی اخبار میں ۱۹۱۰ء کے دوران اس کی قسط وار اشاعت ہوئی۔نصابی کتاب'خواب و خیال' (جس کا ذکر تالیفات کے باب میں آچکا ہے) میں بھی پورا ترجمہ کئی بار چھپا۔ابو محفوظ الکریم معصومی اس سلسلے میں مزید معلومات مہیا کرتے ہیں:

> ''میری نظر سے (خواب وخیال کا) ساتواں اشاعت ۱۹۴۳ء کا ایک نسخہ گزر چکا ہے جس کے ۲۸۰ رصفحات کو یہ سرگذشت محیط ہے۔اس مشترکہ کام میں میرا خیال ہے کہ علامہ وحشت کی حیثیت شریکِ غالب کی تھی۔اس لیے کہ ترجمے کی زبان شروع سے آخر تک بہت ہلکی پھلکی، رواں اور بامحاورہ ہے۔حاشیہ پر ضروری تشریحات انگریزی میں درج ملتی ہیں جو خود فیلٹ کے بیان کے بموجب تنہا وحشت صاحب کی محنت کا ثمرہ ہیں۔''

(سوغات، مرتبہ: اسدالزماں اسد-ص:۲۲۷)

○○○

فن

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے
وحشتؔ

شرمندہ کیا جوہرِ بالغ نظری نے
اِس جنس کو بازار میں پوچھا نہ کسی نے
وحشتؔ

غزل گوئی

بَلا کی ہوتی ہے وحشتؔ کی بھی غزل خوانی
کہ اک سرور سا ہوتا ہے اہلِ محفل کو

وحشتؔ

غزل داخلی، غنائی اور رمز یاتی صنف شاعری ہے۔ دوسری اصناف کے مقابلے یہ صنف سب سے بد نام، مگر سب سے مشہور ہے۔ کسی نے اس کی گردن زدنی کی بات کہی، تو کسی نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا، لیکن کسی طرح اس کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی، بلکہ یہ مزید معروف ہوتی گئی اور آج حال یہ ہے کہ سارے جہاں میں اس کی دھوم ہے۔ اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ یہ صنف، قصیدہ، مثنوی اور مرثیے سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ عشق اس کا محبوب ترین موضوع ہے، مگر ارتقا اور زمانے کی تبدیلی کے اثر سے اس کا دامن اب کافی وسیع ہو چکا ہے۔ آج اس کے موضوعات محدود نہیں ہیں۔ اب اس میں ہر طرح کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ اس کا ایک فنی پہلو ہے اور اپنا مخصوص مزاج بھی، جس کی پاسداری نہایت ضروری ہے۔

رضا علی وحشتؔ اردو غزل کا معتبر نام ہے۔ وحشتؔ بیسویں صدی کے ممتاز شاعر ہیں۔ احیائے غزل میں شادؔ عظیم آبادی، حسرتؔ موہانی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی، جگرؔ مراد آبادی، فراقؔ گورکھپوری، بیخودؔ دہلوی، سیمابؔ اکبر آبادی، جوشؔ ملیح آبادی، کے ساتھ وحشتؔ کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدرؔ اپنی کتاب 'بیسویں صدی میں اردو غزل' میں رقم طراز ہیں:

> ''اس دور کی غزل کی کوئی تاریخ یا تنقیدی مطالعہ سائلؔ دہلوی، احسنؔ مارہروی، نوحؔ ناروی، بیخودؔ دہلوی، ناطقؔ لکھنوی، وحشتؔ کلکتوی، برج موہن دتا تریہ کیفیؔ، سیمابؔ اکبر آبادی، جوشؔ ملیح آبادی، حفیظؔ جالندھری، دلؔ شاہجہاں پوری، جگرؔ بسوانی، ناطقؔ گلاوٹھی، جگرؔ بریلوی، جوشؔ ملسیانی، آزادؔ انصاری، تاجورؔ نجیب آبادی، علی اختر اخترؔ وغیرہ کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔''

(بیسویں صدی میں اردو غزل۔ص:۱۰۷)

خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''مولانا وحشتؔ خوب سمجھتے تھے کہ روایتی غزل کا رس نچڑ چکا ہے۔ اب اس میں رنگینی خونِ جگر اور فکر و خیال ہی سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ماضی و حال کا جائزہ لیا اور اپنے رنگ و آہنگ سے نیا راستہ نکالا جس میں ماضی کی توانائی، حال کا شعور اور مستقبل کے امکانات پوشیدہ ہیں۔''

(سہ ماہی روحِ ادب، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ-۱۹۸۴ء)

وحشتؔ کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے — 'دیوانِ وحشتؔ'، 'ترانۂ وحشتؔ' اور 'نقوش و آثار'۔ تینوں کے مطالعے کی روشنی میں ان کے فنی اور ارتقائی سفر کا اندازہ لگانا چاہیے۔ بغیر ان مجموعہ ہائے کلام کے مطالعے کے ان کے شعری سفر کا اندازہ لگانا، ناممکن ہے۔ 'دیوانِ وحشتؔ' میں خالص روایتی شاعری ملتی ہے۔ تقلیدِ غالبؔ کے اشعار بھی اسی دیوان میں ملتے ہیں۔ 'ترانۂ وحشتؔ' اور 'نقوش و آثار' میں وحشتؔ کا اپنا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہے۔ شہرت کی دنیا سے کوسوں دور رہ کر وہ خلوص کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے اور تاعمر انھوں نے اردو شاعری کی نوکِ پلک سنواری۔ ان کی شاعری میں کلاسیکیت، فصیح و بلیغ زبان، روایت کی پاسداری اور قدیم اندازِ سخن کی فراوانی ہے۔ نئی حسّیت اور جدید خیالات بھی ان کی شاعری میں خصوصیت کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کا فن کے معاملے میں ذاتی نظریہ ہے، جس پر وہ پوری طرح کاربند ہیں۔

وحشتؔ کا نظریۂ فن

اس سے پہلے کہ ان کی غزل گوئی کا مفصل جائزہ لیا جائے، فن سے متعلق خود ان کا نظریہ کیا ہے، یہ جاننا انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے ایک نظر ان کے متفرق اقوال پر ڈالی جائے، تاکہ ان کے نظریۂ فن کے تعین میں آسانی ہو:

''.........حقیقت یہ ہے کہ میں پرانی لکیر کا فقیر ہوں۔ میں ہمیشہ امیرؔ لکھنوی کا یہ شعر دہراتا ہوں جو میرے حسبِ حال ہے۔

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں''

(مکاتیبِ وحشتؔ-ص:۱۲۶)

''بات یہ ہے کہ میں لڑکپن ہی سے اساتذہ کا کلام شوق سے پڑھا کرتا تھا اور بعض اشعار کا دل پر گہرا اثر ہو جاتا تھا۔ مومنؔ کا تغزل میرے لیے بڑی جاذبیت رکھتا تھا اور اس کا تناسبِ الفاظ بھی مجھے بھلا لگتا تھا۔'' (ایضاً-ص:۱۲۹)

''میں حضرت شمسؔ کا شاگرد ہوں اور وہ داغؔ کے شاگرد تھے۔ اس تعلق کی بنا پر داغؔ کا احترام مجھ پر لازم ہو گیا۔ لیکن میں نے ان کے کلام کی تقلید نہیں کی۔''

(ایضاً-ص:۱۳۰)

''غالبؔ کی تقلید میں نے بے شک کی لیکن اس حد تک نہیں کہ میں کچھ اوریجنل خیالات نہ پیش کر سکوں۔ میرے دیوان کا مطالعہ اگر گہرا ہو تو ظاہر کر دے گا کہ میں نے بھی کچھ نہ کچھ پیش کیا ہے۔ بقولِ غالبؔ

بیاورید گر ایں جا بود سخن دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد''

(ایضاً-ص:۱۳۰)

''آپ کا خیال صحیح ہے کہ میں حالیؔ کے کلام سے بہت متاثر ہوا ہوں۔''

(ایضاً-ص:۱۳۰)

''شعر میں جب گرمی نہ ہو دل میں جگہ نہیں کرتے۔'' (مضامینِ وحشت-ص:۱۰۲)

''جب تک معنی آفرینی کی کوشش نہ ہو شاعری عبث ہے اور جب معنی میں لطافت و نزاکت نہ ہو تو شعر، شعر نہیں ہے۔ بہت کم شعرا اس بات کا خیال رکھتے ہیں اور یہ بات بھی ایسی ہے کہ کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کے لیے نہایت نازک طبیعت درکار ہے۔'' (ایضاً-ص:۸۲)

''کس قدر خونِ جگر پینا ہوتا ہے جب کہیں ایک مصرعہ رنگین ہاتھ لگتا ہے یا ایک ترنم دل گداز زبان پر پیدا ہوتا ہے۔'' (ایضاً-ص:۱۰۹)

''اب عام طور پر لوگوں کی توجہ ایک قسم کی ہرزہ سرائی کی جانب مائل ہو رہی ہے جسے 'نیچرل شاعری' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ غزل میں اگر فطری جذبات ادا کیے جائیں تو نیچرل کیوں نہ کہلائے۔ کیا نیچرل شاعری کے یہی معنی ہیں کہ درخت اور پہاڑوں کی مصنوعی اور مقلدانہ تعریف کی جائے؟ شاعری نیچرل وہی ہے جس کی بنیاد حقیقت پر ہو۔ سعدیؔ و حافظ، نظیریؔ و عرفیؔ، میرؔ و غالبؔ کے کلام میں سیکڑوں اشعار ایسے ملیں گے جو بالکل نیچر کی تصویر ہیں اور زبان زد خلائق ہیں۔ برخلاف اس کے وہ نظمیں جن سے آئے دن رسالوں اور اخبارات کے صفحے سیاہ کیے جاتے ہیں۔ نہ تو عام طور پر نیچرل ہوتی ہیں اور نہ ہی بسبب اپنی طوالت کے لوگوں کو یاد رہ سکتی ہیں۔'' (ایضاً-ص ص:۱۵۵-۱۵۴)

''جہاں تک ممکن ہو سکے جدتِ مضامین اور شستگئی الفاظ کا خیال رکھیں اور پیش پا افتادہ خیالات کے نظم کرنے سے پرہیز کریں۔ مقلدانہ طور پر تشبیہات سے محترز رہنا ضرور ہے۔ دلی جذبات اور حقائق کا اظہار کرنا چاہیے''۔

(ایضاً-ص:۱۵۵)

''غزل میں اختصار کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ تیرہ چودہ شعر کافی ہوتے ہیں۔ سترہ سے تو ہرگز متجاوز نہ ہونا چاہیے۔ ایک غزل میں چار پانچ اچھے شعر نکلتے ہیں۔ باقی زیادہ تر حشو و زواید سے پر ہوتے ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ طولانی غزل سے صفحے پر کیے جائیں جن کے پڑھنے کو لوگ دردِ سر سمجھیں۔''

(ایضاً-ص:۱۵۵)

''ایک اور بات جو غزل کی شان کو بڑھا دیتی ہے وہ اس کی زمین کا انتخاب ہے۔ پامال زمینوں میں خامہ فرسائی عبث ہے۔'' (ایضاً-ص:۱۵۶)

''فرسودہ خیالات۔ اخلاق سوز اشارے اور مقلدانہ قافیہ پیمائی کب تک دلوں کو

مائل کر سکتے تھے۔ انقلابات شروع ہو گئے۔ غزل کی صورت بدل گئی اور وہ مضامین جن پر غزل کا دار و مدار تھا اب مکروہ سمجھے جانے لگے۔ اور رفتہ رفتہ متروک ہو گئے۔ مگر افسوس ہے کہ اس میں نئی برائیاں پیدا ہو گئیں۔ پہلے شعر اصاف صاف کہتے تھے۔ اگر اشعار میں کوئی حسن نہ ہوتا تھا تو وہ مہمل بھی نہ ہوتے تھے۔ اب یہ بات نہیں ہے۔ ان دنوں بہت سے اشعار ایسے سننے میں آتے ہیں جن میں الفاظ کی تراکیب بظاہر دلکش اور رنگین نظر آتی ہیں لیکن شعر کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اگر ہوا بھی تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے وہ اس قابل نہ تھی کہ نظم کی جاتی۔'' (ایضاً-ص:۱۷۰)

وحشتؔ کے خطوط اور مضامین کے علاوہ اشعار میں بھی ان کا نظریۂ فن موجود ہے:

مطربِ خلد کیا سنائے وحشتِ خستہ کیا سنے
معتقدِ قدیم ہے زمزمۂ حجاز کا

کلامِ عرفیؔ شیراز ہے تقلید کے قابل
ہمارے ریختے میں دیکھ لے وحشتؔ جواب اس کا

دل وجانِ وحشتِ بے نوا، ہے شہید لذّت شعر کا
کوئی خوش ہو یا نہ ہو اس کو کیا وہ ہے آپ اپنے ہنر سے خوش

خدا گواہ کہ ہوں ترجمانِ دل وحشتؔ
کہے ہیں شعر نہیں، کی ہے شاعری میں نے

زنہار بارِ خاطرِ اہلِ سخن نہ ہو
وحشتؔ غزل میں لطف رہے اختصار کا

مندرجہ بالا اشعار اس امر کے غماز ہیں کہ وحشتؔ فن کار بھی ہیں اور فن پرست بھی۔ معتقدِ قدیم بھی ہیں اور شہیدِ لذّتِ شعر بھی۔ ترجمانِ دل بھی ہیں اور ذہن کے نباض بھی۔ وہ محض شعر

(بیت برائے بیت) نہیں کہتے بلکہ شاعری کرتے ہیں اور شاعری کے لیے فن سے آشنائی کس قدر ضروری ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وحشتؔ، حالیؔ کے تغزّل سے متاثر ہیں۔ غالبؔ کی شاعری کے دلدادہ، اور داغؔ کے معتقد ہیں۔ اردو کی کلاسکی شاعری کا شباب دیکھنا ہو تو کلامِ وحشتؔ کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ فن پر گرفت اور شاعری کے رموز و نکات سے عمیق واقفیت، وحشتؔ کو دوسرے شعرا سے ممتاز بناتی ہے۔ وہ شعر میں اختصار کے قائل ہیں:

گراں ہوتا ہے طبع شعر کو طولِ سخن وحشتؔ
اگر پر لطف رکھنا ہے غزل کو، مختصر کر دے

وحشتؔ اپنے کلام کو پیچیدگی سے پاک رکھتے ہیں، تاکہ حسنِ کلام برقرار رہے۔ ان کا ایقان ہے کہ کلام کی پیچیدگی، کلام کے حسن کو زائل کر دیتی ہے۔ غالبؔ مشکل پسند طبیعت کے مالک تھے۔ وحشتؔ نے ان کی تقلید کی، لیکن ان کی مشکل پسندی سے بغاوت بھی کی اور سلاست و فصاحت پر زور دیا۔ وہ زبان کے لطف کے زبردست حامی ہیں۔ اگر لطفِ زبان شعر میں نہ ہو تو شعر سپاٹ ہو جاتا ہے۔ ان کی نظر میں وہ شعر مکمل ہی نہیں، جس میں معانی کا حسن اور زبان کی لطافت نہ ہو۔ لہٰذا، اس معاملے میں وحشتؔ کا نظریہ، یہ ہے:

پیچیدگی سے پاک رکھ اپنے کلام کو
وحشتؔ سخن میں چاہیے لطفِ زباں رہے

وحشتؔ کمالِ شعر فصاحت کا نام ہے
مضمون کے خیال میں لطفِ زباں نہ چھوڑ

وحشتؔ مری نظر میں مکمل نہیں وہ شعر
جس میں کہ حسنِ معنی و لطفِ زباں نہ ہو

شاعری خیال کو لباس دینے کا نام ہے۔ خیال کی اہمیت اپنی جگہ، مگر لباس کی زیبائش بھی ضروری ہے۔ ورنہ شعر کا لطف جاتا رہے گا۔ وحشتؔ کے یہاں نازک خیالی بھی ہے اور باریک

بینی بھی۔ فلسفیانہ، متصوفانہ اور عرفانی خیالات و تصورات بھی ہیں اور فلسفہ و تصوف کے بنیادی نکتے بھی۔ رنگین بیانی بھی ہے اور نزاکت بھی:

سخن سے تیرے وحشتؔ طرزِ غالبؔ آشکارا ہے
کہیں رنگیں بیانی میں، کہیں نازک خیالی میں

''عموماً آج کل نظموں کے لکھنے کا رواج ہے اور وہ لوگ جنھوں نے فن شعر کو باقاعدہ حاصل نہیں کیا ہے طبع آزمائی کرتے ہیں اور مہمل بکتے ہیں۔ نظمیں بے سروپا ہوتی ہیں۔ الفاظ کو معنی سے تعلق نہیں ہوتا۔'' (مکاتیب وحشتؔ۔ص:۸۰)

فن کے حوالے سے ان کے اپنے تحفظات ہیں۔ فن میں بدعت کے خلاف اور تجربے کے نام پر کیے جانے والے کھلواڑ کے سخت مخالف ہیں۔ مشاعروں میں غزل سرائی سے صرف اس لیے اجتناب کرتے ہیں کہ وہاں کی شاعری فن کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ وہاں انھیں اپنا کوئی ہم نوا نہیں ملتا۔ ان کا ایمان ہے کہ غزل کا لطف طرزِ کہن سے وابستہ ہے۔ وہ تصرفہائے بیجا کا گلہ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ فن کے قاتل فنِ شعر کو برباد کر ڈالیں گے:

اور ہی ٹھہرا ہے وحشتؔ اب تو معیارِ سخن
علم فن کا تھا تجھے دعویٰ وہ باطل ہو گیا

غزل کا لطف ہے وابستۂ طرزِ کہن وحشتؔ
خیالِ خاطرِ اصحابِ جدت آشنا کب تک

مشاعروں میں غزل سرائی نہیں مجھے اب پسند وحشتؔ
نئے ہیں انداز شاعروں کے بدل گیا رنگ شاعری کا

ہائے کس قدر بدلا رنگِ شاعری وحشتؔ
اب نظر نہیں آتا کوئی ہم زباں اپنا

ہے مجھے وحشتؔ تصرفہائے بے جا کا گلہ
کس قدر ہے ان دنوں اردو زباں بدلی ہوئی

کیسے کیا کیا تصرف شعر میں جدت پرستوں نے
ہے وحشتؔ مدعا ان کا یہ فن برباد ہوجائے

وحشتؔ کے یہاں فن میں بے جا تصرف کی گنجائش نہیں۔ انھوں نے اکتسابِ فن کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ بلاشبہ وہ فن کے امام ہیں۔ ان کے پیچھے فن کاروں کا قافلہ چلتا ہے۔ شعر گوئی کا ملکہ انھیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا ہے۔ فروغِ طبع خداداد ہے۔ پھر بھی وہ کسبِ فن کو ضروری خیال کرتے ہیں:

فروغ طبع خدا داد اگر چہ تھا وحشتؔ
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسب فن کے لیے

اس میں کوئی شک نہیں کہ وحشتؔ کا نظریۂ فن قابل تتبع ہے۔ بغیر فن کے شعر، شعر نہیں رہتا۔ شاعری فن کا تقاضا کرتی ہے اور فنی بصیرت سب کو آسانی سے نہیں ملتی۔ صرف کسی کسی کو یہ ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک ادب کو پہلے ادب ہونا چاہیے، بعد میں کچھ اور۔ ان کے یہاں 'ادب برائے زندگی' کے نام پر نعرے بازی نہیں ملتی۔

زبان

فصاحت، بلاغت اور سلاست، وحشتؔ کی شاعری کے طرۂ امتیاز ہیں۔ ان کی زبان نہ صرف پختہ ہے، بلکہ رواں دواں، شستہ، دلکش اور سلیس بھی ہے۔ وحشتؔ اپنی شاعری میں ندرتِ خیال کو فصاحت و بلاغت کا جامہ پہنا کر گل بوٹے کھلاتے ہیں۔ انھیں لذّتِ زبان عزیز ہے۔ زبان و بیان کا حسن ان کی شاعری کا وہ پہلو ہے جس پر مشاہیر نے رشک کیا۔ معنی و لفظ کا حسن ان کے یہاں بہت نکھر کر آتا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی ان کی زبان دانی کا اعتراف کرتے ہیں:

''وحشتؔ نے اپنی خدمات سے یہ ثابت کر دیا کہ اردو صرف دہلی اور لکھنؤ کی

زبان نہیں۔ بلکہ پورا ہندوستان اس کی آغوش میں ہے اور بنگال میں بھی ایسی اردو لکھی جاسکتی ہے جس پر اہلِ دہلی واہلِ لکھنؤ وجد کریں۔''

(سہ ماہی روحِ ادب، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ-۱۹۸۴ء)

ان کا شعور، ریاضت کی آگ میں جل کر پختہ اور زبان، روایت کے سایے میں پرورش پا کر جوان ہوئی۔ ان کی زبان بامحاورہ اور باسلیقہ ہے۔ قدیم شعرا کے دواوین کے مطالعے نے جہاں ان کے شعور کو جولانی دی ہے وہیں ان کی زبان کو بھی صلابت بخشی ہے۔ انھیں اپنی زبان دانی پر ناز ہے:

سن کے بولے کلام وحشتؔ کا
اس کی خوبی میں کچھ کلام نہیں

داغؔ دہلوی اپنے وقت کے بہت بڑے زبان داں تھے۔ لوگ ان کی زبان دانی کا لوہا مانتے تھے۔ وحشتؔ کا یہ دعویٰ بجا ہے کہ ان کے زمانے میں اگر داغؔ زندہ ہوتے تو ان کی زبان دانی کا اعتراف ضرور کرتے:

ابھی ہوتے اگر دنیا میں داغِؔ دہلوی زندہ
تو وہ سب کو بتا دیتے، ہے وحشتؔ کی زباں کیسی

فارسیت

ہمارے ریختے میں فارسی کی شان ہے وحشتؔ
کہیں ترکیبِ عرفیؔ ہے کہیں طرزِ فغانیؔ ہے

وحشتؔ نے اردو ادب کے ساتھ فارسی ادبیات کا بھی عمیق مطالعہ کیا تھا، جس کی جھلک ان کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ اگر گہرا ہو تو آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے فارسی تراکیب کا استعمال کیسے کیسے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فارسیت غالبؔ کی طبیعت کے عین مطابق تھی اور اسی وجہ سے غالبؔ کے کلام میں خصوصیت پیدا ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کے

خیال کی ندرت ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ وحشتؔ نے بھی غالبؔ کا اثر قبول کیا، لیکن یہ کہنا کہ انھوں نے غالبؔ کی تقلید میں فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال کیا ہے ان کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ غالبؔ کے یہاں فارسیت کی وجہ فارسی ادب کا گہرا مطالعہ ہے اور غالبؔ نے خود فارسی میں شعر کہے ہیں، ٹھیک اسی طرح وحشتؔ کے یہاں بھی فارسی ادب کا عمیق مطالعہ ہے۔ انھوں نے بھی فارسی میں شاعری کی ہے اور کافی عمدہ کی ہے۔ وحشتؔ کا دیوانِ فارسی، دیوانِ اول میں موجود ہے۔ وحشتؔ کی فارسی شاعری پر علامہ اقبالؔ اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں:

> ''فارسی کلام بھی آپ کی طبّاعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔''
>
> (مشمولہ: دیوان وحشت ۱۹۱۰ء)

ظفر علی خاں رقم طراز ہیں:

> ''مولانا وحشتؔ ریختہ گوئی ہی کے حق میں یدِ طولیٰ نہیں رکھتے بلکہ آپ کا فارسی کلام بھی استادانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔'' (ایضاً)

وحشتؔ کی فارسی شاعری سے قطع نظر، اگر ان کی اردو شاعری پر نظر ڈالیں تو ان کے اردو کلام پر بھی فارسیت کا غلبہ دکھائی دے گا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

بگرا نمایگیِ خویش و بکم ظرفیِ دہر
ہوں میں وہ جنس کوئی جس کا خریدار نہیں

نوٹ: پہلا مصرع پوری طرح فارسی ہے۔

''ہوں گل فروش جلوۂ صبح وطن ہنوز''

نوٹ: 'منم' کی جگہ 'ہوں' وزن کے تقاضے کے تحت لایا گیا ہے۔

''ہنگامہ تراوش لخت جگر کہاں''

نوٹ: یہاں 'کہاں' کی جگہ 'کجا' پڑھیے۔ مصرع مکمل فارسی ہو گیا۔

''مدعا امر محال اور پائے طاقت منقطع''

نوٹ: 'اور' کی جگہ 'و' پڑھیے۔ مصرع مطلق فارسی کا ہو جاتا ہے۔

''جاں نذرِ لذتِ خلشِ تیرِ یار ہو''

نوٹ: 'ہو' کی جگہ 'شد' پڑھیے اور فارسی کا لطف لیجیے۔

''سامانِ حشر ساز ' دلِ بیقرار ہو''

نوٹ: پھر 'ہو' کی جگہ 'شد' پڑھیے۔

''حریف یک دوخس و خار گلستاں کیوں ہو''

نوٹ: 'کیوں ہو' کے بجائے 'چرا شد' پڑھیے۔ پھر دیکھیے فارسی کا مصرع ہوا یا نہیں۔

''خیالِ کلفتِ ہجراں بلائے جاں کیوں ہو''

نوٹ: ایضاً

''فغاں ہے شیوۂ آزردہ خاطراں اے دل''

نوٹ: 'است' کی جگہ 'ہے' بہ تقاضائے وزن ہے۔

''سرگرم دل آزاری ارباب وفا ہے''

نوٹ: 'ہے' کی جگہ 'است' یا 'ہست' پڑھ کر دیکھیے۔

روایت کی پاسداری

روایت ماضی سے حال تک کے مسلسل سفر کا نام ہے جسے ایک اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی کسی شے کا ماضی سے حال تک رائج ہونا روایت ہے۔ سماجی اطوار، رسم ورواج، تصورات وعقائد، اقدار وغیرہ روایت کا ناگزیر حصہ ہیں۔ انہی عناصر سے روایت کی تشکیل ہوتی ہے۔ روایت کے مفہوم میں قدامت اور کہنہ پن کے معنی بھی شامل ہیں۔ ادبی اصطلاح کے بطور روایت ماضی سے حال تک تسلسل کے ساتھ آنے والا وہ مذاقِ سلیم ہے جو ادبی معاشرے کی رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہوتا ہے۔ روایت کی وضاحت میں عابد علی عابد رقم طراز ہیں:

> ''ادبی روایت دراصل ان اصطلاحات، تشبیہات واستعارات، علائم ورموز، اسالیبِ زبان وبیان، پیرایہ ہائے ابلاغ، اظہار، اشارات وتلمیحات، ذوق سلیم اور انتقاد کے متعلق تصورات اور فنکار اور مخاطب کے درمیان ان تفہیمات پر مشتمل ہوتی ہے جن کے معنی واضح ہوتے ہیں اور جن کے استعمال کی سند نہیں

مانگی جاتی ہے۔'' (اصولِ انتقادِ ادبیات-ص:۵۸)

شمیم حنفی روایت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روایت کی حیثیت فن اور فکر کے ارتقا میں اساسی ہوتی ہے اس حقیقت سے قطع نظر زندہ اور فعال حقیقتوں سے مملو روایت بیک وقت آئندہ حقیقتوں کو محرک اور اس کے امتحان کی حیثیت بھی رکھتی ہے وہ ماضی و حال دونوں زمانوں میں ایک ساتھ زندہ رہتی ہے۔'' (مشمولہ شعر و حکمت حیدرآباد، شمارہ نمبر ۲،ص-۲۰)

ان بیانات کی روشنی میں جب ہم وحشت کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو وہ روایت سے مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ان کی غزلیات میں کہنہ پن کے ساتھ نیاپن بھی نظر آتا ہے۔ روایت بہت سی جدتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ ہر جدت اپنے استحکام اور استقلال کے بعد روایت کا حصّہ بن جاتی ہے۔ روایت ادبی مزاج کی بنیاد ہے جس پر نئی نئی عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ہر جدت یا ہر نیا تجربہ روایت سے استوار ہو۔ وحشت کی شاعری میں روایت کا صحت منداظہار ملتا ہے۔ گہرائی، گیرائی اور آفاقی صداقت ملتی ہے۔ ان کی روایت سے مکمل وابستگی دیوانِ وحشت کی پہلی ہی غزل میں محسوس کی جاسکتی ہے:

آئینۂ خیال تھا عکس پذیر راز کا — طور شہید ہو گیا جلوۂ دلنواز کا
پایہ بہت کیا بلند اس نے حریمِ ناز کا — تا نہ پہنچ سکے غبار رہگزرِ نیاز کا
خستگیٔ کلیم نے نکتہ عجب سجھا دیا — ورنہ حریف میں بھی تھا اس مژۂ دراز کا
دیر ملا تھا راہ میں کعبے کو ہم نکل گئے! — جذبۂ شوق میں دماغ کس کو ہوا امتیاز کا
بندگی اور صاحبی اصل میں دونوں ایک ہیں — جس کا غلام ایاز ہے وہ ہے غلام ایاز کا
کوتہیٔ نصیب نے دور رکھا تو کیا ہوا — بندۂ خانہ زاد ہوں اس کے قدِ دراز کا
شوق ترا ہے موجزن ذوق ترا بہانہ جو — کھول نہ دیں بھرم کہیں پردگیانِ راز کا
مستیٔ بیخودی سے یاں آنکھ کھلی نہ حشر تک — یعنی یہی جواب تھا نرگسِ نیم باز کا
خاک میں مل گئے و لے آنکھ اٹھی نہ شرم سے — ہم سے ہوا نہ حق ادا اس کی نگاہِ ناز کا

مطربِ خلد کیا سنائے وحشتِ خستہ کیا سنے
معتقدِ قدیم ہے زمزمۂ حجاز کا

وحشت طرزِ قدیم کے عاشق ہیں۔ معتقدِ قدیم ہیں۔ اپنی غزلوں میں قدما کے اسالیبِ زبان و بیان کا پاس رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں مخصوص اصطلاحات، تشبیہات و استعارات اور علائم کا اظہار ملتا ہے۔ دیوان وحشت کی پہلی غزل کا پہلا شعر تلمیح ہے اور تلمیح بھی ایسی جو ہماری روایتی شاعری میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ میر، سودا، درد، مصحفی وغیرہ نے اسے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ سودا کو سنیے:

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا

حریمِ ناز، رہگزرِ نیاز، خستگیٔ کلیم، مژۂ دراز، دیر و کعبہ، جذبۂ شوق، بندۂ خانہ زاد، قدِ دراز، نرگسِ نیم باز، نگاہِ ناز جیسے الفاظ اپنے روایتی ہونے کا بذاتِ خود اعلان کرتے ہیں۔ مخصوص قسم کی تراکیب اور انتخابِ الفاظ وحشت کی شاعری کے کلاسکی رنگ کو نشان زد کرتے ہیں۔ ان کا کلاسکی شعور کافی پختہ ہے۔ ساقی و میخانہ، شباب و شراب، شوق، شوخ، بہار و خزاں، آشیاں، توبہ، غرورِ شیخ، کاکل و زلف، لب و رخسار، ہجر و فراق کے تلازمے اردو کی شعری روایت کے جزوِ لاینفک ہیں، جو وحشت کی غزل میں نئی معنویت سے ہمکنار ہوتے ہیں:

غضب ساقی کی بدمستی، ستم جوشِ شباب اس کا
چھلک پڑتا ہے اس کے ہاتھ سے جامِ شراب اس کا

تھا شوقِ پائے بوس بھی ہنگامہ آفریں
وہ شوخ خوابِ ناز سے بیدار ہو گیا

شہیدِ انتظارِ جلوۂ دیدارِ ساقی کو
حریفِ چشمِ وا گرویدۂ مشتاقِ ساغر تھا

ہے خارِ چشم اب خس و خاشاکِ آشیاں
ہنگامۂ بہار کی رخصت ہے کیا کروں

ٹوٹا مثالِ توبۂ رنداں غرورِ شیخ
تیری نگاہِ ناز بھی کیا کام کرگئی

مصیبت بے کسی ہائے شبِ ہجراں کی کیا کہیے
ہمارے حال پر رونے کو بس اک دیدۂ تر تھا

اے مست جامِ حسن، تجھے کچھ بھی خبر ہے
بو تیری زلف کی مجھے بے ہوش کرگئی

تری مستانہ رفتاری سے ظاہر موجِ دریا تھی
تری ہنگامہ آرائی سے پیدا شورِ محشر تھا

روایت ادب میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جس پر نئی نئی عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں، مگر ارتقائی عمل سے جداگانہ روایت پرستی میں اپنے زمانے سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ اس لیے جدت پسندوں کے نزدیک یہ عمل غیر مستحسن اور دشنام کے مترادف ہے۔ اقدار کے لحاظ سے روایت کی دو قسم ہوتی ہے — صحت مند اور غیر صحت مند۔ وحشتؔ کی شعری عمارت صحت مند روایت پر کھڑی ہے، جو ماضی سے حال تک کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے، اور آدرش کی حیثیت رکھتی ہے۔ وحشتؔ کی قادرالکلامی میں کلام نہیں۔ فنی اصول وضوابط پر گہری نظر اور عروض پر دسترس ہے۔ کلاسکی شعرا کے شانہ بہ شانہ چل کر انھوں نے روایتی شاعری کی خوشگوار فضا قائم کی، جس کی بھینی بھینی خوشبو روح کو معطر کر دیتی ہے۔ روایتی کلاسکی شاعری اپنی لطافت کی وجہ سے آج بھی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور آنے والے وقتوں میں بھی وہ شاہکار کی حیثیت رکھے گی۔ روایتی شاعری کے موضوعات مخصوص ہیں جو مختلف ادوار میں فکری تنوع کے ساتھ برتے

گئے ہیں۔ کفر و ایمان، گل و بلبل، قفس و آشیاں، گلشن و چمن، صید و صیاد، آہ و فغاں، شوریدہ سری، جنون، نشیمن وغیرہ روایتی شاعری کے محبوب موضوعات ہیں، جو وحشتؔ کی شاعری میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں:

دیر میں اپنا ٹھکانہ ہے نہ کعبے میں پناہ
کفر رنجیدہ ہے، آزردہ ہے ایماں مجھ سے

پیغامِ گل پہ نکلی اسیرِ قفس کی روح
بلبل چمن میں بے مددِ بال و پر گئی

چمن کے دام سے جائیں گے ہم کہاں صیاد
قفس فضول ہے پروردۂ چمن کے لیے

قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے
ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے

کہاں کا امن کیسا عیش کیا آسودگی ہمدم
قفس سا دیکھتا ہوں سامنے اپنے نشیمن کے

تری دیوار بھی واقف ہے در بھی
جنونِ وحشتِ شوریدہ سر ہے

وحشتؔ نے اپنے روایتی اسلوبِ بیان میں شوخی اور طنز سے بھی کام لیا ہے:

ملے رقیب سے وہ اور مجھ سے فرمایا
جو اعتماد ہے مجھ پر تو بدگماں کیوں ہو

ہے یہی خلش مری زندگی کہیں مٹ نہ جائے یہ چارہ گر
مری زیست کا جو خیال ہے تو علاجِ زخمِ جگر نہ کر

تغافل کو توجہ جانیے رسمِ محبت میں
جفا و جور کو اک شیوۂ ناز وادا کہیے

فتنے برپا کر رہا ہے دمبدم نیرنگِ حسن
اور وحشت مفت کوئے عشق میں بدنام ہے

عشقیہ شاعری

غزل اردو شاعری کی آبرو ہے اور عشق اس کا محبوب ترین موضوع۔ عشقیہ شاعری کی یہ صنف ہمیں ایرانی شاعری سے ترکے میں ملی۔ ہم نے نہ صرف اس صنف کی ساخت اور خارجی اسلوب ورثے میں حاصل کیا، بلکہ مضامین، موضوعات، تخیلات، مفروضات، تصورات و علائم کی ایک مرصع اور بے کراں دنیا بھی حاصل کی۔ کلاسکی غزل میں 'عشق' سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ عشق ہی کی وساطت سے حیات وکائنات کے اہم مسائل تک رسائی ہوتی ہے۔ عشقِ مجازی کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ یہ عشقِ حقیقی تک پہنچنے کا پہلا زینہ ہے۔ اردو شاعری میں عشقِ حقیقی و مجازی کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے جس میں ہمارے شعرا کے تخلیقی شعور کی پرورش ہوئی ہے۔ دراصل عشق ہی حیات وکائنات کی حقیقت ہے۔ عشق ہی حیات وکائنات کی تخلیق کا باعث اور نجات کا ذریعہ ہے۔ عشق ہی سے زندگی میں رونق ہے۔ ہمارے یہاں شوق، آرزو، چاہت، محبت، الفت، پیار، سب عشق ہی کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں، مگر عشق ایک مخصوص اصطلاح ہے جس کے معنی کافی وسیع ہیں۔ شعرائے فارسی کی تقلید میں شعرائے اردو نے بھی اس موضوعِ خاص میں ایسے ایسے لطیف مطالب و معنی پیدا کیے ہیں اور اس پر تخیل اور جذبات کے کچھ ایسے رنگ و روغن چڑھائے ہیں کہ اس کا ہر پہلو روشن اور پرکشش بن گیا ہے۔

وحشت کی شاعری میں عشق کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ ان کی تخلیقی قوتیں عشق ہی سے متحرک ہوئی ہیں۔ ان کا تصورِ عشق شائستہ/ پختہ، اور جمالیاتی شعور بیدار ہے۔ انھوں نے حسن کے ہر وار کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ مختلف اوقات میں حسن وعشق کی متعدد کیفیات کے جو نقوش ان کے دل پر مرتسم ہوئے ہیں، انھوں نے انھیں نہایت لطیف انداز میں شعر کے قالب میں ڈھال دیے ہیں۔ ہجر ووصال، محبوب کی کج ادائیاں اور ظلم وتعدی، عاشق کی وفا شعاری اور جاں نثاری غزل کے پسندیدہ مضامین ہیں۔ یہ مضامین اب اردو غزل کی روایت کا لازمی حصہ بن چکے ہیں وحشت کی شاعری میں بھی یہ مضامین آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔ جذبۂ عشق کے محسوسات اور اثر انگیزی پر ان کا ایقان ہے:

جذبۂ عشق کا آخر کچھ اثر ہوتا ہے
یوں بظاہر نہ ہو محسوس مگر ہوتا ہے

اگر عشق نہ ہو تو حسن بے معنی ہے۔ حسن اور عشق لازم وملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرا ادھورا ہے۔ معشوق کا غرور عاشق کی محبت کی دین ہے۔ عشق ہی کی وجہ سے حسن کی سرکار میں رونق ہے:

ہے نیازِ بندگاں ہی سے غرور صاحبی
عشق ہی کی رونقیں ہیں حسن کی سرکار میں

وحشت کی عشقیہ شاعری میں گہرائی و گیرائی ہے۔ ایمائیت/ وزن، وقار/ کشش، اثر/ دل پذیری، حرارت/ گرمی، شوخی/ طنز نے ان کے عشقیہ پیرایے میں روح پھونک دی ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

ترانہ ہائے محبت سناؤں گا وحشت
کبھی خیال اگر آیا غزل سرائی کا

وحشت کی عشقیہ شاعری قدیم و جدید کی بہترین آمیزش ہے۔ روایت اور جدت کے اعلیٰ نمونے ان کے یہاں ملتے ہیں۔ وہ قدیم رنگ میں جدید خیال پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر اجتہاد سے دامن نہیں بچاتے:

دکھائیں کیوں نہ وہ اندازِ حسن میں جدت
کہ فنِ عشق میں ہم اجتہاد کرتے ہیں

وحشتؔ کی شاعری کو ہم سوقیانہ نہیں کہہ سکتے۔ ان کی شاعری بے حیائی اور چھیڑ چھاڑ سے پاک ہے۔ وہ جرأتؔ، انشاؔ اور داغؔ کی تقلید نہیں کرتے۔ حالاں کہ اکثر شعرا نے ان کی تقلید میں بازاری اشعار کہہ کر اپنے دواوین کو داغ دار کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وحشتؔ کے اشعار دلیل میں پیش کیے جائیں آپ نمونے کے طور پر دوسروں کے فحش اشعار پر فاتحہ پڑھ لیجیے۔ دوسرے شعرا کے اشعار اس لیے بھی پیش کیے جا رہے ہیں کہ آپ کو وحشتؔ کی شائستگی کا بخوبی اندازہ ہو جائے:

مل جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
(جرأتؔ)

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
(انشاؔ)

ہمارے پاس جو بیٹھے تو کسمسا کے اٹھے
چرا کے آنکھ وہ اپنا بدن چرا کے اٹھے
(داغؔ)

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
(غالبؔ)

تو کہ بہتی ہوئی ندیا کے سمان
تجھ کو دیکھوں تو مجھ کو پیاس لگے
(جاں نثار اخترؔ)

اب وحشتؔ کے چند اشعار:

بے دیکھے ہر کوئی ترا دیوانہ ہو گیا
افسوس ترے جمال کا افسانہ ہو گیا

میں کیا کہوں چمن آرائیاں تصور کی
خیالِ یار ہے گویا وصالِ یار مجھے

کون جانے کہ یہ کافر نظری کس کی ہے
خبر اتنی ہے کہ ثابت مرا ایماں نہ رہا

حسن آفریں ہوا ہے تصور جمال کا
دل کو ہوائے گل نے گلستاں بنا دیا

شوق نے عشرت کا ساماں کر دیا
دل کو محوِ روئے جاناں کر دیا

جھک گئی آخر حیا سے ان کی آنکھ
شوق نے مجھ کو پشیماں کر دیا

آنکھیں جو کھولیں صبح کو اک مست خواب نے
وا میرے واسطے درِ میخانہ ہو گیا

گلستاں کر دیا ہے دامنِ دل کے تصور نے
ہوائے شوق میں حاصل ہے عیشِ جاوداں مجھ کو

وحشتؔ کا محبوب وہ ہے جس کی آنکھوں کو شراب پر برتری حاصل ہے۔ جس کے چہرے پر

بہاریں قربان ہیں اور جس کی طرف دل خود بخود کھچا چلا آتا ہے۔ ان کا محبوب بے پردہ نہیں رہتا، لیکن حجاب کے باوجود ان کے تصور کی آنکھیں محبوب کا دیدار کر لیتی ہیں، جو عشق کی صداقت کی دلیل ہے:

ہر چند بیچ میں ہے ترا پردۂ حجاب
جلوہ ترے جمال کا میری نظر میں ہے

———

آنکھوں نے تیری کیف مٹایا شراب کا
چہرے نے تیرے بات بگاڑی بہار کی

———

شوق تیرا کھینچتا ہے جس طرف جاتا ہوں میں
اضطرابِ عشق میں فرصت کہاں پاتا ہوں میں

وحشتؔ کا تصورِ عشق دیگر شعرا سے مختلف ہے۔ ان کے ہاں روایتی طور پر رقیبوں سے حسد جلن کا انداز نہیں پایا جاتا، اور نہ ہی ان کے ہاں سطحی عشق کی چونچلے بازی ملتی ہے۔ ان کے ہاں جرأتؔ و مومنؔ کی معاملہ بندی نہیں ملتی۔ ان کا رشک اپنے اندر ضبط اور ٹھہراؤ رکھتا ہے۔ اظہرؔ قادری کہتے ہیں:

”رشک سے بجائے کدورت پیدا ہونے کے ان کے عشق کو اور جلا ملتی ہے۔ کبھی کبھی یہ رشک حسن و عشق دونوں کے لیے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ رقیب سے ان کو رشک ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس رشک و رقابت میں عناد نہیں ہوتا۔ اس میں مسرت ہوتی ہے۔ نشاط ہوتا ہے۔ فرحت ہوتی ہے۔ خلوص ہوتا ہے۔“

(رضا علی وحشت، ڈھاکہ، ۱۹۵۵ء، ص:۳۱)

عشق حقیقی اسے ہی کہتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

رشک کہاں، حسد کسے اور مجھے خوشی ہوئی
غم میں ترے رقیب کو سینہ فگار دیکھ کر

———

میں قیدِ رشک سے آزاد ہوں محبت میں
کہ تجھ کو شمع بنایا ہے انجمن کے لیے

وحشتؔ کی غزل کا شعری کردار محبوب کی شان میں کبھی گستاخی نہیں کرتا۔ وہ محبت میں جانب داری اور زبردستی کا قائل نہیں۔ شرم وحیا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ہمیشہ ادب و تہذیب کا پاس اور سنجیدگی/متانت کا خیال رکھتا ہے۔ اس کی محفل میں اہلِ ہوس کی رسائی نہیں۔ وہ عشق میں پاکیزگی چاہتا ہے۔ وصل کی ہوس سے اس کو آلودہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ مکمل سپردگی پر ایمان رکھتا ہے:

وصل کی آرزو سے کام نہیں
پختہ مغزانِ عشق خام نہیں

———

اے حسن ہو چلی ہے ہوس ہم رکابِ عشق
تجھ سے امیدِ یک نگہِ امتیاز ہے

———

پوچھ دیکھ اپنے ہی تغافل سے
میرا سودائے عشق خام نہیں

———

رہِ محبت میں جز محبت مرا کوئی مدعا نہیں ہے
نظر چراتے ہو مجھ سے کیوں تم مری کوئی التجا نہیں ہے

———

گستاخ میں ہوا نہ کبھی باوجودِ شوق
ان کے حجاب سے مجھے شرمندگی نہیں

———

مدعائے عشق میرا کچھ نہیں جز ذوقِ عشق
حسن کو حیرت یہ کس سعیِ بے حاصل میں ہے

وحشتؔ عشق کو کوئی روگ اور مصیبت نہیں سمجھتے اور نہ ہی ان کے یہاں فقط شباب کی

اضطراری کیفیات اور ہیجانی جذبات کا بیان ملتا ہے۔ان کے یہاں فانی کی طرح گھٹن، مایوسی، قنوطیت اور تنگی کا احساس نہیں، بلکہ عشق کی جو فضا ملتی ہے وہ بڑی صاف اور شفاف ہے۔ان کی عشقیہ شاعری کے مطالعے سے اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس سے ایک قسم کا سرور حاصل ہوتا ہے۔ان کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کا تصور ملتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی عشقیہ شاعری میں تنوع ہے۔یہاں عشق کی حقیقی و مجازی دونوں صورتیں جلوہ گر ہیں۔اظہر قادری ان کے مجازی عشق سے متعلق رقم طراز ہیں:

> ”وحشت کا عشق لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد یا وامق عذرا کا عشق نہیں۔وہ ایسے عشق کو ایک مہلک مرض سمجھتے ہیں جو انسان کو اس پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے ہم مجلسوں کو چھوڑ کر اور دنیا کو تیاگ کر صحرا نوردی ہی کو سب کچھ سمجھ لے۔وہ عشق کو کوئی آسمانی چیز نہیں سمجھتے اور نہ اتنی بلندی پر پرواز کرنے کے قائل ہیں کہ جہاں سے ہمیں اپنی زمین بھی نظر نہ آسکے۔ان کا عشق اسی دنیا کی چیز ہے۔انسانی گوشت پوست کا عشق ہے۔ایک ایسے فرض شناس اور تندرست و توانا انسان کا عشق ہے جو دنیا میں رہنا اور سماج اور روزانہ زندگی سے علاقہ رکھنا انسان کی سب سے بڑی منزل سمجھتا ہے۔“ (رضا علی وحشت، ڈھاکہ، ۱۹۵۵ء، ص ص: ۲۶-۲۷)

وحشت کے عشق میں سرور اور دیوانگی بھی موجود ہے، جس میں وہ تھوڑی سی ہوشیاری بھی چاہتے ہیں۔وہ عشق کی وساطت سے حیاتِ انسانی کے بنیادی اور مثبت قدروں میں پختگی/ گیرائی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔وہ فرار کے قائل نہیں، بلکہ عشق کے ہر وار کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ان کے اندازِ بیاں میں شگفتگی، لوچ، نزاکت، لطافت، سب کچھ ہے:

بے خبر منزل سے ہیں وہ سالکانِ راہِ عشق
جو قدم رکھتے ہیں راہ و رسمِ منزل دیکھ کر

جفا پر منحصر ہے شاید ان کی شانِ محبوبی
نہ طرزِ دلبری چھوٹی نہ اندازِ ستم چھوٹا

تھا انتہائے عشق میں وحشت عجیب حال
ہر گز نہ مجھ کو اپنے سر و پا کا ہوش تھا

قتیلِ عشق کی تربت پہ کوئی کہتا تھا
کہ اے ستم زدہ اب تو تجھے قرار آیا

ترے عشقِ غم فزا میں ہوئے دونوں خاک ایسے
کہ دل و جگر میں ممکن نہیں امتیاز ہر گز

نہیں محروم رونق سے ترے عاشق کا غم خانہ
اجالا اس میں رہتا ہے چراغِ داغِ ہجراں کا

چھوڑا اتنا تو اثر عشقِ ستم ایجاد نے
اک مزے کا درد میرے دل میں پیدا کر دیا

خود عشق ہی میں مجھ کو ملا مدعائے عشق
جو دل کا درد تھا وہی دل کی دوا ہوا

عقل دیتی ہے دعا، آمین کہتا ہے جنوں
دل قیامت تک تری زلفوں کا دیوانہ رہے

حریفِ دیدۂ دیدار جو کیا ہو حجاب اس کا
نگاہِ آشنا ہے مجھ کو ہر تارِ نقاب اس کا

کبھی ہے حسن تمھارا، کبھی ہمارا عشق
وہی ہے ذکر جسے زیبِ داستاں دیکھا

کون بدبخت وفا کر کے گنہ گار ہوا
تو جو یوں درپئے اربابِ وفا ہوتا ہے

روایتی کلاسیکی شاعری میں محبوب ہمیشہ بے وفا ہوتا ہے۔ وہ لاکھ وعدے کرلے، مگر عاشق بے چارے کو وصل میسر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عاشق جو عشق میں کمزور ہوتے ہیں فوراً بدگمان ہوجاتے ہیں اور راہِ محبت میں شکست کھاتے ہیں، لیکن وحشتؔ کا عشق سچا ہے۔ ان کا شعری کردار محبوب کے ستانے پر بھی اسے فراموش نہیں کرتا، بلکہ اپنی مکمل وفاداری کا ثبوت دیتا ہے:

تری عاشق فراموشی کی گو حد ہوگئی ظالم
ترا وحشتؔ تجھے اس پر بھی اکثر یاد کرتا ہے

عشق نا کام کو میرے ہے ابھی تک امید
واہ رے شعبدۂ حسنِ فسوں ساز ترا

صد شکر آج ہوگئی تکمیل عشق کی
اپنے کو خاکِ کوچۂ جاناں بنا دیا

وحشتؔ نے طنزیہ پیرائے میں بھی عشقیہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہاں بھی انھوں نے شائستگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ حالانکہ کسی پر طنز کرنا بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ ادب کے دائرے میں رہ کر طنز کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ کچھ شعرا تو پھبتی سے پھکڑّ پن اور پھکڑ پن سے دشنام طرازی پر اتر آتے ہیں، مگر وحشتؔ کا کمال یہ ہے کہ ان کی شخصیت ہر حال میں مہذّب رہتی ہے:

کیا تھا شکوۂ جورو جفا کبھی میں نے
تمھاری مہر و محبت بھی دیکھ لی میں نے

کیا ہوئی مہر و محبت کیا ہوا قول و قرار
یہ نظر بدلی ہوئی اور یہ زباں بدلی ہوئی

تغافل کو توجہّ جانیے رسمِ محبت میں
جفا و جور کو اک شیوۂ نازوادا کہیے

بے وفائی سبھی معشوق کیا کرتے ہیں
تم اگر مجھ سے وفا کرتے تو جدت ہوتی

جو کہیے کچھ تو وہ اپنی خطا ٹھہرتی ہے
خموش رہیے تو ہوتا ہے بدگماں کوئی

وحشتؔ کے عشقیہ افکار جدید شعری پیرایے میں بھی کافی ملتے ہیں۔ عشقیہ مضامین کو نظم کرنے میں بعض شعرا لکیر کے فقیر ہوجاتے ہیں۔ نئے پہلوؤں پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے معنی آفرینی کی موت ہوجاتی ہے۔ اردو غزل میں عشقیہ مضامین کو نئے پہلو عطا کرنا یقیناً کار دشوار ہے، لیکن حسرت موہانی اور وحشت جیسے شعرا کے ہاں عشق کی نیرنگیوں اور نزاکتوں کو Romanticize کرنے کا مرحلہ نہایت دلچسپ اور روح افزا ہے۔ وحشت کی شاعری قدیم و جدید کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے:

وصل کس کو کہتے ہیں ہجر کیا ہے کیا جانوں
ہے غمِ محبت ہی عیشِ جاوداں اپنا

تونے وحشتؔ کیوں خلافِ رسمِ عشق
درد کو رسوائے درماں کر دیا

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

اپنا بھی وہی حال ہوا راہِ وفا میں
جو حال ہوا کرتا ہے اربابِ وفا کا

تیری نگاہِ مست سے ڈرنے لگا ہوں میں
بے ہوش کیا ہوا کہ مجھے ہوش آ گیا

مرے تو دل میں وہی شوق ہے جو پہلے تھا
کچھ آپ ہی کی طبیعت بدل گئی ہوگی

یہ اشعار اس امر کے غماز ہیں کہ یہاں بھی وحشتؔ نے اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں۔ان کی عشقیہ شاعری کی فضا میں ایسی سرشاری ہے کہ قاری اس کے نہاں خانوں میں کھو سا جاتا ہے اور ان کے اشعار دل میں دبے پاؤں داخل ہو جاتے ہیں۔اظہر قادری کا خیال ہے:

''وحشتؔ کی عشقیہ شاعری اپنے اندر بڑا حسن، بڑی لچک اور کسک رکھتی ہے۔''

(رضا علی وحشت، ڈھاکہ، ۱۹۵۵ء، ص:۲۵)

وحشتؔ کی شاعری ابتذال سے پاک ہے۔محبوب کے خد و خال، قد و قامت، ادا و انداز وغیرہ کی معاملہ بندی اردو شاعروں کا شیوۂ خاص رہا ہے۔بعض شعرا تلذذ پر کبھی کبھی اس قدر اتر آتے ہیں کہ عشق کا وقار مجروح ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔معشوق کے حسن و شباب کا وصف بیان کرنے، تاک جھانک کرنے، گلہ شکوہ کرنے، ظلم و اذیت سہنے، ذلیل و خوار ہونے کو اپنا مقدر سمجھتے ہیں۔ایسی حالت میں عشق اور بوالہوسی کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ہوس پرستی میں ہمارے شعرا اس قدر پستی میں اتر آتے ہیں کہ عشق کے مفاہیم ہی بدل جاتے ہیں۔مسعود حسن رضوی ادیب کہتے ہیں:

''عشق پاک اور بے غرض محبت کا نام ہے......... محبت جب خود غرضی اور نفس پرستی کی سرحد سے گزر جاتی ہے تو عشق کا درجہ پاتی ہے۔''

(ہماری شاعری- ص:۲۰۱)

وحشتؔ کے عشقیہ اشعار کے مطالعے سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ ان کی شاعری غرض اور ہوس پرستی سے مبرا ہے۔ان کی محبت بالکل بے لوث ہے۔ان کی شرافت اور متانت ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ان کے یہاں ہمیں کہیں بھی داغؔ کی مانند گھٹیا شوخی، اخلاقی پستی، تلذذ پرستی اور چھچھورا پن نہیں ملتا۔

حُزنیہ شاعری

'غم' اردو غزل گوئی کا محبوب موضوع ہے۔پی-بی-شیلیؔ نے کہا تھا:

"Our sweetest songs are those that tell of saddest thought".

شیلی کے جملے میں گہرائی و گیرائی ہے۔ہماری غزلیہ شاعری کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے غم کو موضوعِ سخن نہ بنایا ہو۔یہ الگ بات ہے کہ کسی کے یہاں یہ پہلو زیادہ پایا جاتا ہے، کسی کے یہاں کم۔غزل غنائی اور داخلی صنفِ سخن ہے۔داخلیت جس قدر زیادہ ہوگی، شعر اتنا ہی دل پذیر ہوگا اور دیرپا اثرات مرتب ہوں گے۔میرؔ اردو غزل کے بادشاہ ہیں۔ان کی شاعری حزن و یاس کی ترجمان ہے۔میرؔ نے اردو کی حزنیہ شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچایا۔میرؔ سے پہلے بھی حزنیہ شاعری کی روایت قائم تھی اور میرؔ کے بعد بھی شعرا نے بڑی تعداد میں اس موضوعِ خاص پر طبع آزمائی کی۔غم انسان کی داخلی کیفیت کا نام ہے۔بیسویں صدی میں فانیؔ اور وحشتؔ نے اس روایت کو تقویت بخشی۔وحشتؔ کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ نہیں کیا گیا اور کسی نے ان کی شاعری کے اس پہلو پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی، مگر جن لوگوں نے کلامِ وحشتؔ کا عمیق مطالعہ کیا، وہ ان کے فن کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔حالیؔ، شبلیؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، شررؔ سبھی نے ان کے فن کا لوہا مانا، مگر جن لوگوں نے کلامِ وحشتؔ کا سطحی اور سرسری مطالعہ کیا، وہ ان کی شاعری کے مزاج سے ناآشنا رہے، اور غلط رائے قائم کرتے رہے۔ان پر ظلم ہے کہ تقلید کا الزام لگا کر انھیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی۔بیشتر تاریخ نویسوں نے جب ادب اردو کی تاریخ لکھی تو ان کا نام تک نہ لیا۔جہاں نام نہاد نقادوں نے ان کا ذکر غزل کی تاریخ میں

نہیں کیا، وہیں چوٹی کے غزل گو حسرتؔ موہانی، سرکردہ نقاد نیازؔ فتح پوری اور عندلیب شادانی نے ان کی شاعری پر بھرپور تبصرہ کیا۔ وحشتؔ کا شعر ہے:

اللہ رے زورِ مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیوں کر وہ اٹھایا جاتا ہے

ہم پوچھتے ہیں کہ وحشتؔ کے اس شعر میں کیا نہیں ہے؟ کیا داخلیت نہیں ہے؟ کیا یہ شعر ندرتِ بیان سے خالی ہے؟ کیا کسی بھی زاویے سے یہ سپاٹ لگتا ہے؟ کیا یہ دل کی آواز نہیں؟ کیا اس پر شعر سازی کا اطلاق ہوتا ہے؟ کیا یہ آمد نہیں، آورد ہے؟ کیا اس میں سادگی و برجستگی نہیں؟ کیا یہ فصیح و بلیغ نہیں؟ کیا یہ حسن سے معرا ہے؟ کیا اس پر بے ساختہ واہ کہنے کو جی نہیں چاہتا؟ اگر آپ کے پاس فنی بصیرت ہے تو اس شعر کا جائزہ لیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ اس کا مقام کیا ہو سکتا ہے؟ آپ کا فیصلہ جو بھی ہو۔ اس شعر پر اردو کے سرکردہ اور بالغ نظر نقاد نیازؔ فتح پوری کا فیصلہ سنیے:

''افسوس ہے کہ میں وحشتؔ سے بہت دور ہوں ورنہ میں خود جا کر ان سے پوچھتا کہ اس شعر کی تخلیق کیوں کر ہوئی اور وہ کون سا حال تھا جو اس الہام پارہ کے نزول کا باعث ہوا۔'' (مالہ وماعلیہ، نگار، جون ۱۹۴۶ء)

وحشتؔ کے اشعار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں کتنی تہہ داری ہے:

دل پھنکا جاتا ہے پر آہ کہاں کرتا ہوں
کس قدر پاس ترا سوزِ نہاں کر تا ہوں

یہاں تو دوستوں سے بے ہنسے بولے نہیں بنتی
گزرتی رہتی ہے جو دل پہ وحشتؔ کوئی کیا جانے

ایک پر ایک کی حالت کا اثر ہوتا ہے
دل تڑپتا ہے تو مجروح جگر ہوتا ہے

اک زخم ہے کہ جس کو مرہم سے دشمنی ہے
اک درد ہے کہ جس کو پروا نہیں دوا کی

وہ آنسوؤں کی پہلی سی طغیانیاں کہاں
ندی کی ہے مثال کہ چڑھ کر اتر گئی

ٹپکتے جاتے ہیں آنسو، نہیں رکتے، نہیں تھمتے
یہ جو ہر خاک میں ایک ایک پنہاں ہوتے جاتے ہیں

میرے دلِ شکستہ میں ناگفتہ رہ گئی
وہ داستانِ غم جو کسی نے سنی نہیں

یوں تو لب خاموش ہیں پر اک طلاطم ہے نہاں
کنجِ دل کو محشر ستانِ فغاں پاتے ہیں ہم

دل رفتہ رفتہ خوگرِ آزار ہو گیا
غم تھا بہت مجھے، وہی غم خوار ہو گیا

اس کار گاہِ ہستیِ بے اعتبار میں
اچھا رہا وہ جس کو کہ ہستی کا غم نہ تھا

زندگی کو سنوارنے، اسے حسین و متین بنانے میں غم اہم رول ادا کرتا ہے۔ غم کے بغیر زندگی سب کچھ ہو سکتی ہے، مگر متین اور سنجیدہ نہیں ہو سکتی۔ یاسیت زندگی کو شدید حسیت بخشتی ہے۔ غم انسان کو پختہ بناتا ہے۔ وحشتؔ نے غم سے فرار حاصل نہیں کیا بلکہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جو لوگ زندگی کا صرف تصور کرتے ہیں ان کے لیے زندگی طربیہ بن جاتی ہے اور جو لوگ اسے جھیلتے ہیں

ان کے لیے المیہ۔ وحشتؔ تمام عمر زندگی کی تلخیوں سے جوجھتے رہے۔ اس کے ہر وار کو سہتے رہے، مگر انھوں نے کبھی زبان سے اُف تک نہ کیا۔ مصائب اور غمِ زیست کا استقبال کیا۔ وہ غم والم کی پرفریب کیفیات سے واقف ہیں۔ اسی لیے اس کا ماتم نہیں کرتے۔ انھیں درد میں مزا ملتا ہے۔ انھیں دوا سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ روتے ہیں، مگر آنسوؤں کے بغیر۔ آنسوؤں کی نمائش ان کے نزدیک غم کی توہین ہے، اور کبھی جب ضبط کی انتہا ہو جاتی ہے تو ان کی آنکھوں سے چند قطرے بھی نکل آتے ہیں، لیکن ایسا شدید ترین حالات میں ہوتا ہے۔ وہ صبر کے آنسو ہوتے ہیں، جس میں شکست نہیں ہوتی۔ ان کا غم ان کے دل کے نہاں خانے میں محفوظ ہے۔ انھیں رنج والم عزیز ہیں۔ اسی لیے وہ انھیں سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ ان سے بیزاری کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ اپنی زیست کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ غم میں بھی ایک سرور، لطف اور خلش ہوتی ہے، جو دل کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہے۔ اس کی پراثر اور واضح تشریح وحشتؔ کے شعروں میں ملاحظہ ہو:

مرہم کا ذکر کس نے عداوت سے کر دیا
یہ کیا نئی خلش مرے زخمِ کہن میں ہے

ہمدرد کون ہو کہ ہیں سب مبتلائے درد
کب تک سناؤں درد کا دفتر ہر ایک کو

تھیں بیاں کرنے کے قابل دردِ دل کی لذتیں
پر کہوں کس سے یہاں درد آشنا کوئی نہیں

یہ ثابت کر دیا ہے لذت دردِ محبت نے
جہاں تکلیف ہوتی ہے وہیں آرام ہوتا ہے

تکلیف ہی تکلیف ہے اس دہر میں وحشتؔ
صد شکر مزاج اپنا امیرانہ نہیں ہے

دل ہے شکستہ حال جو بہتی ہے سیلِ خون
کیوں بے سبب خفا ہیں مری چشمِ تر سے آپ

اب یاس ہی پیامِ سکوں دے گی قلب کو
اب درد ہی سے درد کا درماں کریں گے ہم

درد اتنا اور بے دردی یہاں تک ہائے ہائے
کھائے جاتا ہے مجھے غم، اور مجھے کچھ غم نہیں

سوزِ پنہانی مرا تجھ پر عیاں ہو جائے گا
دردِ دل حد سے سوا ہو کر زباں ہوجائے گا

مجھے ضبطِ محبت میں لگا رہتا ہے اندیشہ
کہیں آنسو نکل آئیں نہ رازِ غم چھپانے میں

یہ کیوں کہوں کہ سوزِ دل اپنا عیاں نہ ہو
ہاں التزامِ نالہ و آہ و فغاں نہ ہو

خموشی میں مری پنہاں مرے غم کی کہانی ہے
زبانِ قصۂ حسرت زبان بے زبانی ہے

ضبط کی کوشش ہے جانِ ناتواں مشکل میں ہے
کیوں عیاں ہو آنکھ سے وہ غم جو پنہاں دل میں ہے

ہم کو انجامِ دلِ ناشاد ماں معلوم ہے
کس قدر تاثیر رکھتی ہے فغاں معلوم ہے

وحشتؔ غم کی مثبت قدروں پر نظر رکھتے ہیں۔ کبھی رونج والم سے چیخ اٹھتے ہیں اور کبھی غم کی

سراپا تصویر بن جاتے ہیں۔ وہ خود کو اس افسردہ چراغ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں جو برسوں سے یکساں طور پر جل کر دوسروں کو منور کر رہا ہے۔ اکثر دھوکے کھاتے ہیں، مگر حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ انھیں غم کی شدت کا اچھی طرح احساس ہے۔ غم سے آنکھ ملا کر باتیں کرتے ہیں، اور اپنے تجربات کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں:

ہمیشہ ہم سبق آموزِ روز گار رہے
فسردہ مثلِ چراغِ سرِ مزار رہے

دھو کے کھایا کیا ہمیشہ غریب
یعنی وحشتؔ کا شیوہ تھا اخلاص

نالوں سے اگر میں نے کبھی کام لیا ہے
خود ہی اثرِ نالہ سے دل تھام لیا ہے

گونجتے رہتے ہیں نغمے جس کی بزمِ ناز میں
اس کے آگے نالۂ دل کی صدا کچھ بھی نہیں

وحشتؔ کا غم اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ ان کے ہاں غم کو برتنے کا جو آرٹ ہے، وہ موثر، پر شکوہ اور جامع ہے۔ ان کے غم میں اجتماعی شعور کار فرما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں عام دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ چیزیں ان کے یہاں کہیں اور سے نہیں آئیں، بلکہ ان کی خلاّقی کا نمونہ ہیں، جن میں داخلی کیفیات کا سلیقہ مند اظہار ہے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا/محسوس کیا، اسے داخل کا حصہ بنا کر اشعار میں ڈھال دیا۔ یعنی ان کی غزل میں ذاتی تجربے کی حدت اور اظہار کی حریت ہویدا ہے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے تصورات میں غمِ جاناں کو انھوں نے اس لیے فوقیت دی ہے کہ اس میں شدید داخلی وابستگی شامل ہے:

شکرِ خدا کہ دل غمِ الفت سے بھر گیا
گنجائش اب رہی نہ غمِ روز گار کی

غمِ الفت غمِ دنیا نہیں ہے
یہ نعمت ہوتی ہے مشکل سے حاصل

دہر فانی ہے عجب عبرت کدہ
دیدۂ اہلِ نظر پرنم رہا

قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے
ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے

اے بادِ ستم کس لیے ہے شمع کے درپے
بجھ جائے گی یہ سوختہ جاں وقتِ سحر آپ

زمیں روئی ہمارے حال پر اور آسماں رویا
ہماری بے کسی کو دیکھ کر سارا جہاں رویا

جفائے دشمناں اور بے وفائی ہائے یاراں سے
بہت غم دیدہ ہو کر وحشتِ آزردہ جاں رویا

غم زدہ خیالات کے بیان میں وحشتؔ نے جس ہنرمندی سے کام لیا ہے وہ ان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اقبالؔ کی طرح انھیں بھی غم میں مزہ ملتا ہے۔ وہ مشکلات کا سامنا کرتے ہیں اور مصائب کی ہمہ جہت کیفیات/ حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ غم کو کوئی بلا نہیں سمجھتے بلکہ اسے مسرت و شادمانی پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کا غم اسی جہانِ آب و گل کا غم ہے، جس میں تصوراتی نہیں، بلکہ تجرباتی پہلو مستور ہیں۔ انھوں نے رنج و آلام کو قابل اعتنا جانا۔ انھیں اپنے قریب رکھا اور نبھایا:

ہوا تا عمر میرا غم نہ دم بھر کو جدا مجھ سے
کیا میں نے بھی غم کا پاس، جتنا ہو سکا مجھ سے

وحشتؔ کی حزنیہ شاعری اپنے اندر صلابت اور جامعیت رکھتی ہے۔ یہاں وہ ولیؔ، میرؔ اور فانیؔ کی صف میں ہیں، لیکن ان کی شاعری صرف غم ہی سے عبارت نہیں ہے، مگر غم زدہ خیالات و احساسات کا صحت مند اظہار اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ ان کے اس پہلو کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ناقدینِ ادب نے ان کی شاعری پر عموماً جو آراء قائم کیں وہ اس مخصوص پہلو سے عاری ہیں۔ ان کی شاعری کی ہمہ گیری اور وسعت کا اندازہ اسی وقت بہتر طور پر لگایا جاسکتا ہے جب اس پہلو کو مرکزی صورت دی جائے۔ اس ضمن میں جو اشعار پیش کیے گئے ہیں وہ سرسری طور پر منتخب کیے گئے ہیں۔ دیوانِ وحشتؔ اس قبیل کے اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ اہلِ ذوق چاہیں تو مطالعہ کر کے دیکھ سکتے ہیں:

غزل اپنی کہاں ہے قابلِ بزمِ طرب وحشتؔ
کہ ہر ہر شعر کہتا ہے صدائے گریۂ دل ہوں

تصوف

وحشتؔ کی غزل میں تصوف کا رنگ بھی ملتا ہے۔ چونکہ وہ روایت کے پاسدار تھے اس لیے روایتی موضوعات ان کی شاعری کے لیے ناگزیر ہو گئے۔ نتیجے میں انھوں نے تصوف کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا، مگر یہ امر قابلِ غور ہے کہ انھوں نے صرف روایت کے لحاظ میں صوفیانہ اشعار کہے۔ وہ قطعی صوفی نہ تھے۔ ہاں ان پر اسلامی تعلیمات کا گہرا اثر ضرور تھا۔ وفاؔ راشدی لکھتے ہیں:

> ''وہ تصوف کو محض نظریہ نہیں، تجزیۂ حیات سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک تصوف عقیدہ نہیں عمل ہے۔ اسی اندازِ فکر کا اثر تھا کہ ان کی پوری زندگی مشرقی وضع اور اسلامی طرز کی پابندی میں گزری اور اس سے ان کی شاعری بھی متاثر ہوئی۔''
>
> (وفا راشدی، حیات وحشت، ص ص: ۷۹-۸۰)

صوفیانہ اشعار میں وہ جدت سے کام نہ لے سکے۔ انھوں نے بھی وہی مضامین دہرائے، جو قدما باندھتے آئے تھے۔ تصوف کا لغوی مفہوم 'علم معرفت' ہے، جس کا خالص تعلق عشقِ حقیقی سے

ہے۔ عشق حقیقی سے مراد عشق خداوندی ہے۔ اس عشق میں محبوب و مطلوب ذاتِ باری ہے اور عشق مجازی کا تعلق انسانی عشق سے ہے جس کا مطلوب انسان ہے۔ عشقِ حقیقی میں دو مخصوص تصورات ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس کا راستہ قربتِ الٰہی کے شوق میں معرفت کی طرف جاتا ہے اور دوسرا وہ ہے جس کی راہ ہمہ اوست کے فلسفے کے ساتھ فنافی الذات پر ختم ہوتی ہے۔ پہلی حالت میں روحانیت غالب رہتی ہے۔ عاشق اپنے محبوب حقیقی کے عشق میں اس کی دید کا طالب ہوتا ہے۔ دیدار کا شوق اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس خدا کی بنائی ہوئی ہر شے میں اس کے حسن کا پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ پرتوِ حسن کو نگاہوں سے چومنے کے شوق میں وہ دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ ذرّے ذرّے سے محبت کرنے لگتا ہے۔ یہ محبت ارتقائی زینے طے کرتی ہوئی اپنی انتہائی منزل پر پہنچتی ہے تو عشقِ حقیقی حرارتِ جاں بن کر پورے وجود میں سرایت کرنے لگتا ہے۔ ذاتِ باری سے عشق کی بدولت اس کے دل میں ساری کائنات کی محبت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نزدیک فرق و امتیاز کے ظاہری اعتبارات بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ہر شے میں محبوب حقیقی کا جلوہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس کے لیے دیر و حرم سب یکساں حیثیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اسے جہاں جی چاہتا ہے، نمازِ عشق ادا کرتا ہے۔ وحشتؔ کی غزلوں میں کیسے کیسے صوفیانہ خیالات نظم ہوئے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

دیر و حرم کی قید نہ تھی راہِ شوق میں
میں نے نمازِ عشق ادا کی جہاں ہوا

نکل سکا نہ کبھی حلقۂ مجاز سے میں
اگرچہ مجھ کو حقیقت نما مجاز رہا

فریبِ جلوہ نے تیرے پھرایا دربدر مجھ کو
پرستش دیر کی چھوٹی نہ احرامِ حرم چھوٹا

ذرّے ذرّے پر جمالِ یار ضو افگن ہوا
گوشے گوشے میں چراغِ آرزو روشن ہوا

پائے بت پر میں نے وہ سجدے کیے
کفر کو بھی جزوِ ایماں کر دیا

ادا ہوئی ہے سیہ مستیوں میں اپنی نماز
شرابِ ناب سے برسوں ہوا و ضو میرا

بے خودیٔ عشق نے مجھ کو دیا درسِ خودی
میں ہی میں ہوں ہر طرف میرے سوا کوئی نہیں

منظور تھا مشاہدۂ شاہدِ جمال
دیکھا اسی کو اپنی جہاں تک نظر گئی

فقر کے پردے میں پنہاں ہے غنا میرے لیے
مسندِ شاہی ہے میرا بوریا میرے لیے

محرک ہو گا شوقِ دید کا خود تیرا استغنا
یہ شعلہ اور بھڑ کے گا صدائے لن ترانی سے

دیکھا ہے چشمِ شوق نے تجھ کو غلط غلط
تو جلوہ گر جہاں تھا وہاں کس کو ہوش تھا

ہمیں تو ایک معمہ ہے اس کا جلوۂ ناز
کہ آشکارا ہوا پھر بھی (ایک) راز رہا

ابتک نظر آجاتی ہے مشتاق دلوں کو
وہ برقِ تجلی جو سرِ طور نہیں ہے

سیاسی، ملی اور قومی شاعری

عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ وحشتؔ کی شاعری عشق، تصوف اور دیگر روایتی موضوعات سے عبارت ہے۔ بہت کم لوگ اس بات سے آشنا ہیں کہ انھوں نے سیاسی موضوعات کو بھی تخلیقی بنت کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں سیاسی خیالات کا بھی برمحل اظہار ہے۔ ان کے یہاں قوم و ملت کا درد نمایاں ہے۔ تغزل میں سیاست کی آمیزش الگ ہی مزا دیتی ہے، لیکن ان کے اشعار میں سیاسی رنگ کا اندازہ آسانی سے نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ سرکاری ملازم تھے اور حکومت کے خلاف کھل کر اظہارِ خیال کرنا ان کے لیے دشوار تھا۔ اسی لیے انھوں نے تشبیہات واستعارات کے پردے میں اپنے افکار کا اظہار کیا۔ ان کا جو زمانہ تھا اس وقت پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف تخریبی فضا تیار ہو رہی تھی۔ انگریزی سرکار سے بیزاری کے مظاہرے ہو رہے تھے۔ انگریزوں کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ آزادی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ حرّیت کے جذبے پروان چڑھ رہے تھے۔ لوگ آزاد اور سنہرے ہندوستان کا خواب دیکھ رہے تھے، مگر اس کے لیے قربانی درکار تھی۔ وحشتؔ اچھی طرح جانتے تھے کہ آزادی کی دیوی بغیر خون کے چڑھاوے کے نہیں مانے گی اور حصولِ آزادی کے لیے لاکھوں جانوں کی قربانیاں دینی پڑیں گی۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار اپنے ایک شعر میں کیا ہے:

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی
کہ یہ بھی چاہیے رنگینیٔ چمن کے لیے

وحشتؔ شہر کلکتہ کے باشندے تھے اور شہر کلکتہ ان دنوں پورے ہندوستان کے سیاسی انقلابوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انھوں نے نہ جانے کتنی سیاسی جماعتوں کو بنتے اور ٹوٹتے دیکھا۔ ان کی نظر کے سامنے کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت تحریک پروان چڑھی۔ ایسی حالت میں انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ہندو مسلم آپس میں متحد ہو جائیں، مگر انگریز اس راز سے واقف تھے کہ اگر یہ دونوں قومیں مل گئیں تو ان کا یہاں رہنا محال ہو جائے گا۔ لہٰذا انھوں نے دونوں قوموں کے درمیان پھوٹ ڈالنی شروع کی۔ 'لڑاؤ اور حکومت کرو' ان کی پالیسی قرار پائی۔

ان حالات سے وحشتؔ کا حساس دل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کہتے ہیں:

ترے غمزے لڑا دیں گے مسلماں کو مسلماں سے
ترے عشوے بھڑا دیں گے برہمن کو برہمن سے

انگریزوں کا مقصد شروع ہی سے ملک کو لوٹنا تھا۔ وہ ملک کی معیشت پر قابض تھے۔ ہندوستانیوں کو ملکی اشیا سے محروم کیا جا رہا تھا۔ ملکی چیزیں غیر ممالک کی زینت بن رہی تھیں۔ برطانوی حکومت کی لوٹ کھسوٹ سے وحشتؔ کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ فرماتے ہیں:

جگر لاؤں کہاں سے میں جو تاراجِ خزاں دیکھوں
انھی آنکھوں نے کل رنگینیاں دیکھی ہیں گلشن کی

لٹے اک بار ہم ایسے کہ آنکھیں کھل گئیں اپنی
ہماری رہبرِ منزل بنی تائید رہزن کی

حصولِ آزادی کے لیے جس طرح آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی وحشتؔ اس سے خوف زدہ تھے۔ ان کے نتائج ان کی نظر کے سامنے گردش کر رہے تھے اور صرف وحشتؔ ہی نہیں بلکہ ہر شخص اس سوچ میں تھا کہ دیکھیے بغاوت کا انجام کیا ہو:

کیا رنگ انتقامِ خزاں کا ہو دیکھیے
ڈرنے لگے ہیں جوشِ بہارِ چمن سے ہم

ہندوستانیوں کی جدوجہد رنگ لائی اور وہ وقت آ ہی گیا جس کا انتظار برسوں سے تھا۔ ملک کو آزادی مل گئی، مگر آزادی کے ساتھ کبھی نہ مٹنے والا داغ بھی ملا۔ یعنی ملک تقسیم ہو گیا۔ آزادی کی مسرت باہمی نفرت میں بدل گئی، اور نتیجے میں خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ یہ واقعہ وحشتؔ کے اس شعر میں لطیف پیرایے میں نظم ہوا ہے:

بہار آئی تو کیا دیکھی ہے چشمِ باغباں میں نے
نظر آتی نہیں ہے خیراب اپنے نشیمن کی

ہندو اور مسلمان کی باہمی نفرتیں بڑھتی گئیں۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا جاتا رہا۔ خون کی ہولی بدستور جاری رہی۔ فسادات کی وجہ سے لوگ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور ایسے حالات میں وحشتؔ کا قلم بھی خاموش نہ رہ سکا:

ستم ہے آشنا بیگانگی اے باغباں تیری
ہوا خواہانِ گلشن ہی نکالے جائیں گلشن سے

جس سنہرے ہندوستان کا خواب دیکھا گیا تھا وہ پارہ پارہ ہو گیا۔ بظاہر ہندوستان کو آزادی تو مل گئی، لیکن وہ سکون نہ مل سکا جس کی آرزو لوگوں نے کی تھی۔ ملک تقسیم ہو گیا اور یہ صرف زمینوں کی تقسیم نہیں تھی، بلکہ لاکھوں دلوں کی تقسیم تھی۔ کبھی نہ ختم ہونے والے رشتوں کی تقسیم تھی۔ تقسیمِ وطن کے اس سانحے نے ہزاروں دلوں کو دہلا کر رکھ دیا۔ انسانیت لرز اٹھی اور صدیوں کے اتحاد کا شیرازہ پل بھر میں بکھر گیا۔ نانک اور چشتی کی سرزمین خون سے سرخ ہو گئی۔ لوگ صدیوں تک کندھے سے کندھا ملا کر حب الوطنی کے گیت گاتے رہے لیکن تقسیم کے المیے کے بعد ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ مذہب کی آڑ میں آگ اور خون کے رقص کا وہ مظاہرہ کیا گیا جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فسادات کی تباہ کاریوں سے ملک کا داخلی نظام کمزور ہو گیا۔ فرقہ پرستی کی لرزہ خیز آندھی نے ایک ملک کے نہیں، بلکہ ایک تہذیب کے پرخچے اڑا ڈالے۔

اب لوگ ہجرت کر کے پاکستان جا رہے تھے۔ وحشتؔ نے بھی ان حالات کا غیر معمولی اثر قبول کیا اور ہجرت کے جاں کاہ المیے کا شکار ہوئے یعنی انھیں بھی ہجرت کرنی پڑی اور ہجرت کا کرب ان کے شعری بیانیے میں در آیا:

بہار آئی ہے اور مجھ کو نکل جانا ہے گلشن سے
نگاہِ باغباں ہٹتی نہیں میرے نشیمن سے

اک یادِ عیش جس پہ ہوں قرباں ہزار عیش
لے کر چلے ہیں ساتھ تری انجمن سے ہم

دو گز زمین چاہیے دیکھیں کہاں ملے
اٹھنے کو تو اٹھے ہیں ترے آستاں سے ہم

مہاجرین کے ساتھ پیش آنے والی دشواریوں کو وحشتؔ کی چشم دور بیں دیکھ رہی تھیں۔ ایسی صورت میں مہاجرین کے لیے ان کا مشورہ حقیقت شناسی پر مبنی ہے:

بہتر یہی ہے اپنا سمجھ لیں اسے وطن
اب جائیں جس طرف کو نکل کر وطن سے ہم

ہجرت کر کے وحشتؔ ڈھاکہ پہنچے، مگر ان کا دل جو کلکتے کا عادی ہو چکا تھا، وہاں نہیں لگا۔ وہ اداس رہنے لگے۔ کلکتے کا چھوٹنا ان کے لیے قیامت ثابت ہوا۔ آخر کار گوشہ نشین ہو گئے:

زمینِ ڈھاکہ نے کی قلب پر افسردگی طاری
ہوا خلوت نشیں میں اور شوقِ انجمن چھوٹا
وطن اور وہ بھی کلکتہ غضب تھا چھوڑنا اس کا
قیامت ہوگئی وحشتؔ سے وحشتؔ کا وطن چھوٹا

وحشتؔ کے دل میں سچا مسلمان آباد تھا، جو مسلمانوں کی زبوں حالی پر کڑھتا تھا۔ برصغیر اور خصوصاً کلکتے کے مسلمانوں کی تکالیف پر ان کا دل رویا کرتا تھا۔ اپنے شعروں کے توسّل سے وہ مسلمانوں کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں خودداری کا پیغام دیتے ہیں۔ ذلّت کا احساس دلاتے ہیں۔ سنہرے ماضی کا جائزہ لیتے ہیں اور حال سے اس کا موازنہ کرتے ہیں:

ہمیں احساس تک ہوتا نہیں ہے اپنی ذلّت کا
بنایا ہم نے زیبِ طاقِ نسیاں نقشِ خود داری

ہوئی ہے مبتذل اس دہر میں یوں قوم کی حالت
یقیں آتا نہیں اپنے گذشتہ عہدِ زریں کا

اس وقت مسلمانوں کے جو مذہبی حالات تھے اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

مذہب کی حرارت کے بھڑکتے نہیں شعلے
ہاں آتشِ خاموش کا تھوڑا سا دھواں ہے

اوامر سے ہمیں غفلت، نواہی سے ہمیں رغبت
کیا ہے نام روشن ہم نے بھی اسلام کا کیسا

وہ مسلمانوں کا ہمیشہ بھلا چاہتے تھے۔ ان کی خیر خواہی ان کے اشعار میں جا بجا نظر آتی ہے:

خدا کرے کہ تمھیں دین کا مزا مل جائے
مرض گناہ کا دل سے مٹے، دوا مل جائے

نماز روزہ کی لذّت خدا نصیب کرے
سرورِ عیشِ تلاوت خدا نصیب کرے

مسلمانوں کا معاشرتی اور تمدّنی انحطاط انھیں سدا کچوکے لگاتا رہتا ہے:

اپنی بربادی کا افسانہ ہے مشہورِ جہاں
محفلِ دشمن میں زیبِ داستاں ہوتے ہیں ہم

وہ مسلمانوں کے سماجی حالات کی تصویر نہایت عبرت انگیز لفظوں میں کھینچتے ہیں:

نہ کچھ غیرت رہی دل میں نہ ہے کچھ حوصلہ باقی
اب اس سے بڑھ کے ناکامی کا نقشہ اور کیا ہوگا

وہ مزید کہتے ہیں:

کہا جو منہ پر آیا اور کیا جو آ گیا دل میں
ہمیں کس بات کا ڈر ہے، ہمیں کس بات کی پروا

مزے کی زندگی ہے وقت بیکاری میں کٹتا ہے
نہ ہے امروز کی کچھ فکر نہ ہے اندیشۂ فردا

ان کی پریشانی کا ایک سبب قوم وملّت کی زبوں حالی بھی ہے۔قوم وملّت کی تکالیف/مصائب سے وہ پریشان رہتے ہیں۔چنانچہ فرماتے ہیں:

عزیزوں کو نہ ہو راحت تو ہم کو کیسے راحت ہو
خوشی کیوں کر ہو جب قوم اپنی محصورِ مصیبت ہو

ان کا ایقان ہے کہ زندگی کو بدلنے کے لیے تعلیم کا حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔بغیر تعلیم کے کوئی بھی قوم ترقی نہیں کرسکتی:

نہیں معلوم کیا ہم کو کہ ہیں اک قومِ جاہل ہم
اور اپنا کام بے تعلیم ہرگز چل نہیں سکتا

وحشتؔ کی شاعری کا معتد بہ حصہ عملِ پیہم و جہدِ مسلسل پر مشتمل ہے،جس کو وہ زندگی کا مقصد قرار دیتے ہیں۔یہاں قوم وملت کے لیے وہ مصلح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔وہ اسی راستے کو اختیار کرتے ہیں جسے ان کے متقدمین نے اختیار کیا تھا۔سرسید، حالیؔ اور شبلیؔ نے جس طریقے سے قوم وملت کی اصلاح کی وہ بھی اسی نہج پر قوم وملت کی فلاح و بہبود اور اصلاح کے قائل ہیں۔وہ قوم کو اس کی بے حسی کا احساس دلاتے ہیں۔ان کے نزدیک عمل کے بغیر زندگی محض دھوکا ہے۔جدوجہد ہی میں رازِ کائنات پوشیدہ ہے۔وہ جس با مقصد زندگی کا درس دیتے ہیں وہ عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل کے بغیر ممکن نہیں:

کبھی سوچا بھی تو نے زندگی کا مدعا کیا ہے
جو فقدانِ عمل ہے زندگی پھر ایک دھوکا ہے

نہیں اک ذرہ بھی عالم میں جدّ و جہد سے خالی
کشاکش سعی کی ہے عام، گویا سب کو سودا ہے

فریبِ زندگی کھاتا رہے گا زندگی بھر تو
کہ مقصد زندگی کا جب ترے نزدیک عنقا ہے

حیاتِ انسانی کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔کوئی یوں ہی سرخرو نہیں ہوتا۔یوں ہی سرفرازی نہیں مل جاتی۔اس کے لیے قربانیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔تب کہیں کوئی کامران ہوتا ہے۔کامرانی کی اس راہ میں ناکامیاں بھی ہوتی ہیں،مگر وحشتؔ اس سے مایوس نہیں ہوتے۔وہ عملِ مسلسل کا پیغام دیتے ہوئے اپنی مدد آپ(Self help is the best help) کی تلقین کرتے ہیں:

طلب کرتی ہے تیری زندگی کچھ تجھ سے قربانی
سرِ تسلیم خم کر دے کھڑا اب سوچتا کیا ہے

لطف آتا رہا ہر سعیٔ باطل میں مجھے
ہے یہاں افسوس کس کو منتِ برباد کا

لازم ہے کارواں کو رہے آپ مستعد
شرمندۂ صدائے جرسِ کارواں نہ ہو

ہے کام تجھ کو جو کرنا تجھی کو کرنا ہے
کسے پڑی ہے کہ کوشش کرے کسی کے لیے

کبھی کبھی ان کا لہجہ طنزیہ بھی ہو جاتا ہے:

یہاں تو تندہی درکار ہے اور حیف اے غافل
جہانِ کار میں مطلوب، آسائش تجھے تن کی

وحشتؔ کو اس امر کا احساس شدت سے ہے کہ راحت طلبی راحت کو کھو دیتی ہے۔اس لیے زندگی میں جدّ وجہد ناگزیر ہے، بلکہ زندگی جدّ وجہد ہی کا نام ہے۔زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔بے مقصد زندگی کسی جانور کی تو ہو سکتی ہے،انسان کی ہرگز نہیں ہو سکتی:

محنت ہی پہ موقوف ہے آسائشِ گیتی
کھوئی مری راحت مری راحت طلبی نے

ہے ایک مخصوص مقصد زندگی کا، یہ نہیں غافل
کہ اپنی عمر کو تو جس طرح چاہے بسر کر دے

حق مانگا نہیں جاتا، چھین لیا جاتا ہے۔ وحشتؔ کہتے ہیں:

اسی کا حق ہے جو ثابت کرے حق زورِ بازو سے
یہ لفظِ پرفریب خلق معنی سے مبرا ہے

خودداری ان کے شعری مزاج کے خمیر میں ہے، جہاں غم کی نمائش توہینِ غم کے مترادف ہے۔ زمانہ گھات میں بیٹھا ہے کہ اپنے باغیوں کے سر کچل دے، لیکن یہی بغاوت طنزیہ شاعری میں اسلوب کو جلا بخشتی ہے، کیوں کہ بغاوت پرخار راہوں سے گزرنے کا نام ہے۔ روحانی کرب اعتماد کی شکستگی کا زائیدہ ہے۔ قدروں کا ٹوٹنا انسانی رشتوں کے کھوکھلے پن کی دلیل ہے:

کوئی ہمدرد بھی دیکھا کوئی غم خوار بھی پایا
سنائی تو سبھوں کو دردِ دل کی داستاں تو نے

وحشتؔ نے اپنی شاعری سے اصلاحِ قوم کا کام بھی انجام دیا۔ قوم کو بیدار بھی کرنے کی کوشش کی اور جدّ وجہد کا بھی پیغام دیا۔ ان کی ملی اور قومی شاعری کا درجہ بلند ہے۔ یہاں وہ حالیؔ، اقبالؔ اور چکبستؔ سے قریب نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کا یہ حصہ ان کے زمانے کے عین مطابق ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے زمانے کا ساتھ دیا ہے۔

غالبؔ کے اثرات

تری شاعری نے وحشتؔ یہ مچائی دھوم کیسی
کہ زمانہ کہہ رہا ہے تجھے غالبؔ زمانہ

وحشتؔ نے جہاں دوسرے متقدمین کا اثر قبول کیا وہیں انھوں نے نابغۂ روزگار غالبؔ کا بھی گہرا اثر قبول کیا۔ انھیں غالبؔ کے کلام سے ایک طرح کا عشق تھا۔ وہ عرفیؔ، نظیریؔ، فغانیؔ، حافظ و سعدیؔ کے ساتھ غالبؔ، مومنؔ، داغؔ، شمسؔ اور حالیؔ کے زیرِ اثر تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ان اساتذہ کے دواوین کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ سب سے زیادہ انھیں غالبؔ نے متاثر کیا۔ بیسویں صدی میں غالبؔ کی تقلید زوروں پر تھی۔ اکثر شعرا غالبؔ کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بیسویں صدی کے چوٹی کے شعرا میں حسرتؔ موہانی، اصغرؔ گونڈوی، فانیؔ بدایونی اور جگرؔ مرادآبادی نے غالبؔ کی تقلید میں شعر کہے۔ وفاؔ رامپوری نے بھی غالبؔ کی خوب تقلید کی۔ اُدھر لکھنؤ میں عزیزؔ لکھنوی اور اِدھر کلکتے میں وحشتؔ کلکتوی نے کھلّم کھلاّ غالبؔ کی تقلید کی۔ عزیزؔ اور وفاؔ رامپوری کو تتبعِ غالبؔ میں زیادہ کامیابی نہیں ملی، مگر وحشتؔ کو تقلیدِ غالبؔ میں جو کامیابی ملی وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ غالبؔ کے شاگرد مولانا الطاف حسین حالی وحشتؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مولانا اگر انصاف سے دیکھیے تو مرزا کا تتبع کرنا درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا مگر آپ نے ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا ہے۔ تکلّف برطرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے، مستثنیٰ کر لیا جائے تو آپ کے اردو دیوان کو بے شائبہ تصنّع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخلِ مبالغہ نہیں ہوسکتا۔''

(مکتوب بہ نام وحشتؔ، مشمولہ دیوانِ وحشتؔ، ۱۹۱۰ء)

علامہ شبلی نعمانی اپنے ایک مکتوب میں وحشتؔ کو لکھتے ہیں:

''آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالبؔ اور مومنؔ کی ترکیبیں اور طرزِ ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہیں۔'' (ایضاً)

شوقؔ قدوائی رقم طراز ہیں:

''آج کل ہندوستان میں حضرتِ غالبؔ اور حضرتِ میرؔ کی تقلید کرنے والے

زبان کے دعوے سے اکثر پائے جاتے ہیں مگر کلام کے رنگ سے کم، میں نے کم
کا لفظ صرف اس بنا پر لکھا ہے کہ پوری تقلید حضرتِ غالبؔ کے رنگ کی حضرتِ
وحشتؔ ہی نے کی ہے اور ان کی ذاتِ واحد 'کم' ہی کے لفظ کی مصداق ہوسکتی ہے۔''

(ایضاً)

ذوقؔ کے شاگرد ظہیرؔ دہلوی وحشتؔ کو ایک خط میں غالبِؔ ثانی کا لقب دیتے ہیں:

''آپ کا کلام بلاغت نظام دیکھ کر بخدائے لایزال کسی شاعر کا کلام نظر میں نہیں
جچتا۔ غالبؔ ثانی ہونے میں آپ کے کوئی کلام نہیں۔ خدا کی قدرت ہے ایسے
ایسے باکمال ہندوستان میں چھپے بیٹھے ہیں۔'' (ایضاً)

پورا ہندوستان وحشتؔ کو غالبؔ ثانی ماننے پر مجبور ہوگیا۔ وحشتؔ خود کہتے ہیں:

سر زمینِ ہند گونج اٹھی تری آواز سے
شعر نے وحشتؔ ترے اک شور برپا کر دیا

وحشتؔ کی شاعری نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ انھوں نے غالبؔ کی تقلید اپنے ابتدائی
زمانے میں شدت کے ساتھ کی لیکن بعد میں ان کا رنگِ سخن بدل گیا اور انھوں نے بھی اپنے لیے
الگ راہ نکالی۔ ان کی تقلید خلاّقانہ تھی، جس میں اندھی تقلید کے بجائے تخلیقی وفور کا احساس غالب
ہے۔ ان کے عہد میں تمام اہم ترین ادبا نے انھیں داد و تحسین سے نوازا اور ان کے فن کی قدر کی،
لیکن بعد کے ناقدین نے انھیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی اور انھیں صرف مقلد ہی کہتے رہے۔
مقلد کہہ کر انھیں جدید شعرا کی صف سے خارج کر دیا گیا، مگر سوال یہ ہے کہ کس نے اثرات قبول
نہیں کیے؟ اتباع کا رنگ کس کے ہاں نہیں ہے؟ کیا غالبؔ کا کلام تقلید سے پاک ہے؟ کیا غالبؔ
نے طرزِ بیدلؔ میں شعر نہیں کہے؟ کیا دیوانِ غالبؔ میں حافظؔ، سعدیؔ، عرفیؔ، نظیریؔ کے اثرات
نہیں ملتے؟ غالبؔ کا شعر ہے:

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اب ذرا دل و جگر کو مضبوط اور اپنے کان کھڑے کر کے غالبؔ کی تقلید پر ایمان لائیے، کیوں
کہ اس شعر کا مضمون انھوں نے کہیں اور سے اڑایا ہے۔ یہ مضمون جلالؔ یزدی کا ہے۔ جلالؔ یزدی
کا شعر یوں ہے:

از شوق تو صد بوسہ زنم بر دہنِ خویش
ہر گاہ کہ نامِ تو برآید ز زبانم

مسئلہ یہ ہے کہ کس نے تقلید نہیں کی۔ کتنے شاعر ایسے ہیں جن کا کلام تقلید سے مبرا ہے۔ اس
ضمن میں ان شعرا پر نظر ڈالنا ضروری ہے جنھوں نے تقلیدی روش اختیار کی۔ دیاشنکر نسیمؔ نے آتشؔ
کی تقلید کی۔ امیرؔ مینائی نے ناسخؔ کی تقلید کی۔ داغؔ نے ذوقؔ کی تقلید میں شعر کہے۔ جلالؔ، ناسخؔ اور
میرؔ کے مقلد ہیں۔ اسماعیلؔ میرٹھی غالبؔ کے مقلد ہیں۔ چکبستؔ کے یہاں غالبؔ، اقبالؔ، آتشؔ
اور انیسؔ کا رنگ نمایاں ہے۔ شادؔ نے میرؔ اور انیسؔ کا اتباع کیا۔ ریاضؔ خیرآبادی نے امیرؔ مینائی کی
شاگردی پر فخر کیا اور داغؔ کا اتباع کیا۔ عزیزؔ لکھنوی غالبؔ کے مقلدین میں مشہور ہیں۔ وفاؔ
رامپوری بھی غالبؔ کے مقلدین میں مقبول ہیں۔ جلیلؔ مانکپوری نے اپنے استاد امیرؔ مینائی کی
پیروی کی۔ ثاقبؔ لکھنوی نے غالبؔ کا اتباع کیا۔ آثرؔ لکھنوی نے میرؔ و غالبؔ دونوں کا تتبع کیا۔ جگرؔ
مرادآبادی نے داغؔ، تسلیمؔ اور غالبؔ کے رنگ میں شعر کہے۔ فراقؔ — مصحفیؔ، میرؔ، ذوقؔ، داغؔ
اور ناسخؔ سے بہت متاثر تھے۔ احسانؔ دانش کے کلام میں اقبالؔ اور جوشؔ کی جھلک صاف طور پر نظر
آتی ہے۔ مقلدین کی طویل فہرست ہے، لیکن ہمیں غرض بیسویں صدی کے شعرا سے ہے کیوں
کہ وحشتؔ کا تعلق بیسویں صدی سے ہے اور بیسویں صدی کے شعرا میں وحشتؔ کو سب سے زیادہ
نظر انداز کیا گیا۔ وجہ کیا تھی؟ یہی کہ وہ غالبؔ کے مقلد ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس دور میں اور بھی
تو شعرا موجود تھے جنھوں نے غالبؔ کی تقلید کی۔ تو پھر وحشتؔ ہی کے ساتھ یہ امتیاز کیوں؟
وحشتؔ ہی کو کیوں تعصب کی عینک سے دیکھا گیا؟ ایک وجہ اس کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وحشتؔ دہلی
و لکھنؤ کے باشندے نہ تھے۔ مگر کیا یہ علاقائی اور لسانی تنگ نظری نہیں؟ کیا اردو کا دائرہ صرف دہلی و
لکھنؤ ہی تک محدود ہے؟ اگر نہیں تو پھر ضرورت اس بات کی ہے کہ وحشتؔ کو بھی وہ مقام دیا جائے

جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ اگر ہمیں اپنی زبان کی وسعت کا دعویٰ ہے تو وحشتؔ کو بھی ان کا مقام دینا چاہیے۔

حسرتؔ، اصغرؔ، فانی اور جگرؔ بیسویں صدی کے چوٹی کے غزل گو ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ یہ حضرات بھی غالبؔ کے مقلد ہیں تو آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ ان کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے جب پورے ملک میں غالبؔ کی شاعری کی دھوم تھی۔ ایسی حالت میں ان کا غالبؔ کے کلام سے متاثر ہونا فطری امر تھا، مگر اپنی تقلید میں یہ کس حد تک کامیاب ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے:

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
غالبؔ

مل چکی ہم کو ان سے دادِ وفا
جو نہیں جانتے لگی دل کی
حسرتؔ

نہ صرف مضمون ایک ہے بلکہ بحر بھی وہی ہے۔ حسرتؔ کے شعر کے دوسرے مصرعے میں الفاظ کی ترتیب غیر مانوس ہے جو کانوں کو بھلی نہیں لگتی، مگر کیا کیجیے یہ چوٹی کے غزل گو ہیں۔ ان کے خلاف کچھ کہنا بھی کفر ہے۔ نثری ترتیب یہ ہوگی ''جو دل کی لگی نہیں جانتے۔'' مگر قافیے کی مجبوری جو ٹھہری۔ خیر آگے سنیے:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہ جام بہت ہے
غالبؔ

کافی تھی مجھے دُردِ تہ جام بھی حسرتؔ
کاسہ جو مرا مے سے وہ لبریز نہ کرتے
حسرتؔ

جو بانکپن اور لطف غالبؔ کے شعر میں ہے وہ حسرتؔ کے شعر میں کہاں؟

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
غالبؔ

مل گیا اچھا سہارا عذرِ مستی کا ہمیں
لے لیا آغوش میں اس گل کو بے باکانہ آج
حسرتؔ

غالبؔ نے ادب کا پاس رکھا ہے مگر مولانا حسرتؔ سے ادب کا دامن چھوٹ گیا۔ غالبؔ تو صرف دھمکی ہی دے رہے تھے، مگر میاں حسرتؔ تو بغیر انتظار کیے لپک پڑے۔ خیر آگے چلیے:

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
غالبؔ

چھیڑ نا حق نہ اے نسیمِ بہار
سیرِ گل کا یہاں کسے ہے دماغ
حسرتؔ

'سیرِ باغ' کی جگہ 'سیرِ گل' کیا خوب متبادل ہے!

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟
غالبؔ

شرح بے مہریٔ احباب کروں کیا حسرتؔ
رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا
حسرتؔ

جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
غالبؔ

جان کر مجھ پر ستم بھی ہو تو ہے منظورِ شوق
لطفِ بے پروا کی میں کیا قدر کیوں پروا کروں
حسرتؔ

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
غالبؔ

ہے غضب اس شہسوارِ حسن کا فتراکِ ناز
دل ہے جس میں اک شکارِ نیم جان اضطراب
حسرتؔ

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
غالبؔ

مانا کہ یقینی ہے اثر جذبۂ دل کا
کیا ہو گا مگر ہجر میں تائید اثر تک
حسرتؔ

حسرتؔ کے مندرجہ بالا اشعار کس قبیل میں رکھے جائیں گے یہ اربابِ ذوق خود فیصلہ کرلیں۔ بخوفِ طوالت چند ہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اب ذرا اصغرؔ گونڈوی سے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
غالبؔ

ہے تلون سے ترے جلوۂ نیرنگِ حیات
میں تو مر جاؤں جو امیدِ وفا ہو جائے
اصغرؔ

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
غالبؔ

پھر یہ سب شورش و ہنگامۂ عالم کیا ہے
اسی پردہ میں اگر حسن جنوں ساز نہیں
اصغرؔ

اصغرؔ نے جتنے الفاظ بڑھائے شعر اتنا ہی گھٹ گیا۔ فانیؔ بدایونی نے بھی غالبؔ کی خوب تقلید کی۔ سنیے:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
غالبؔ

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت
احباب سے غم خوار ہوا بھی نہیں جاتا
فانیؔ

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے
غالبؔ

جتنے غم چاہے دیے جا مجھے یا رب لیکن
ہر نئے غم کے لیے تازہ جگر پیدا کر
فانیؔ

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
غالبؔ

نہیں یہ مردنِ دشوار بے سبب یعنی
یقینِ وعدۂ پیغام بر نہیں ہے مجھے
فانیؔ

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد
غالبؔ

فانیؔ کی ذات سے غمِ ہستی کی تھی نمود
شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا
فانیؔ

اسدؔ ہے نزع میں، چل بے وفا برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے
غالبؔ

قدم نکال اب تو گھر سے باہر جو دم بھی سینہ سے سہل نکلے
دکھانہ اب انتظار اپنا لحد کو ہے انتظار میرا
فانیؔ

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
غالبؔ

دل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا
جلوۂ برقِ طور نے طور کو کیوں جلا دیا
فانیؔ

جگرؔ مرادآبادی بھی بیسویں صدی کے غزل گو ہیں۔ انھوں نے بھی غالبؔ کے کلام سے کچھ کم استفادہ نہیں کیا۔ ملاحظہ ہو:

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
غالبؔ

تصویر امیدوں کی آئینہ ملالوں کا
انسان جسے کہتے ہیں محشر ہے خیالوں کا
جگرؔ

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو
غالبؔ

سر رکھ ہی دیا سنگِ درِ یار پہ میں نے
اب حشر بھی اٹھے تو مجھے کچھ نہ خبر ہو
جگرؔ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
غالبؔ

میں وہاں ہوں نہیں جہاں میں بھی
عالم و ماورائے عالم کیا
جگرؔ

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
غالبؔ

اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار
خود مجھ ہی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے
جگرؔ

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد
غالبؔ

موت سے ڈر نہیں مگر ہے یہ وہم
عشق بے خانماں نہ ہو جائے
جگرؔ

اب تو یقین آ ہی جانا چاہیے کہ غالبؔ کی پیروی صرف وحشتؔ ہی نے نہیں کی بلکہ اس دور کے سبھی چوٹی کے شعرا نے کی۔ ہاں فرق بس اتنا ہے کہ دیگر شعرا نے پوشیدہ طور پر تقلید کی جبکہ وحشتؔ نے کھلم کھلا تتبع کیا اور اس پر مفتخر بھی رہے۔ ہم نے تو حسرتؔ، اصغرؔ، فانیؔ اور جگرؔ کو صرف مقلد ثابت کیا ہے جبکہ معروف نقاد ڈاکٹر عندلیبؔ شادانی نے تو انھیں چور تک کہہ دیا ہے اور ان پر ڈنکے کی چوٹ پر 'سرقہ' کا الزام عائد کیا ہے۔ بادشاہِ متغزلین حسرتؔ موہانی سے متعلق عندلیبؔ شادانی کی رائے کیا ہے۔ دیکھیے:

''درحقیقت نقالی میں آپ کو وہ یدطولیٰ حاصل ہے کہ اگر آپ کو بادشاہِ مقلدین بلکہ خدائے مقلدین کا لقب بھی دیا جائے تو کچھ بیجا نہیں۔''

(دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی-ص:۱۸۶)

ڈاکٹر شادانی اصغرؔ گونڈوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آپ کے مدارج معرفت کو سمجھنا تو ہم ایسے دنیاداروں کے بس کی بات نہیں مگر اتنا ظاہر ہے کہ عالم وجد میں آپ جو اشعار فرماتے تھے۔ان میں 'صنعتِ سرقہ' کا استعمال ضرور کرتے تھے۔''

(دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی-ص:۲۴۸)

جگرؔ مرادآبادی سے متعلق ڈاکٹر شادانی کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

''حضرت جگرؔ کا دیوان چونکہ اصغرؔ و فانیؔ کے دیوانوں سے کہیں زیادہ بڑا ہے اس لیے آپ کو ''سرقہ'' بھی زیادہ کرنا پڑا ہے۔غالبؔ کا دیوان تو دورِ حاضر کے چوٹی کے غزل گو شعرا کی مشترکہ ملکیت ہے۔اس لیے جگرؔ صاحب کو بھی اس میں سے معتد بہ حصہ ملا ہے۔''

(دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی-ص:۲۵۵)

حسرتؔ موہانی اور اس دور کے دیگر چوٹی کے غزل گویوں کی یہ 'اخلاقی جرأت' دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح انھوں نے بے دھڑک دوسروں کے مال سے اپنا گھر بھر لیا ہے، مگر ہمارے اس بیان سے ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ ہمیں ان شعرا سے ہمدردی نہیں اور ہمیں صرف ان کی تنقیص ہی مقصود ہے بلکہ ہم نے تو صرف اس لیے ان کے اور غالبؔ کے کلام میں مماثلت دکھائی ہے کہ آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ اُس دور پر غالبؔ کی گہری چھاپ تھی اور کثرت سے لوگ غالبؔ کی تقلید کر رہے تھے۔ایسے حالات میں غالبؔ کے کلام سے متاثر ہونا ہر شاعر کے لیے ایک فطری امر تھا۔اس طرح دوسرے شعرا کی طرح وحشتؔ نے بھی غالبؔ کا اثر قبول کیا، مگر وحشتؔ کی صاف گوئی کی داد دیجیے کہ انھوں نے اپنی تقلید کو دوسروں کی طرح پوشیدہ نہیں رکھا بلکہ فخریہ طور پر انھوں نے غالبؔ کی تقلید کی:

وحشتؔ ہمیں تتبعِ غالبؔ ہے آرزو
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

مظفر حنفی کہتے ہیں:

''غالب نے طرزِ بیدل میں ریختہ کہنے کو قیامت سے تعبیر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں طرزِ غالب میں ریختہ کہنا اس سے بڑی قیامت تھی جس سے علامہ وحشت کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔'' (مغربی بنگال، کلکتہ، وحشت نمبر۔ص:۵۰)

اشعار ملاحظہ ہوں:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب

تقدیر کا ہر دن رونا ہے یعنی کہ چراغ ارمانوں کا
ہر روز جلایا جاتا ہے ہر روز بجھایا جاتا ہے

وحشت

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

غالب

اوروں کو دیکھتے ہو میری طرف بھی دیکھو
رکھتا ہے کچھ توقع میرا دلِ حزیں بھی

وحشت

گرنی تھی مجھ پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

غالب

اے برق حسن! خرمنِ دل پر مرے بھی گر
کیا ایک جلوہ گاہ تری کوہِ طور ہے

وحشت

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

غالب

دلِ دیوانہ کرتا ہے درو دیوار سے باتیں
مری خلوت نہیں ہے یہ تو محفل ہوتی جاتی ہے

وحشت

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالب

حسرت گناہ کی بھی تو پوری نہ ہوسکی
دو دن کی زندگی مجھے بدنام کر گئی

وحشت

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

غالب

میری ایذا دوستی کردے گی آساں مشکلیں
خار بھی ہو جائے گا شاخِ چمن میرے لیے

وحشت

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

غالب

مری صبح کیا، مری شام کیا، نہیں فرق دونوں میں اک ذرا
مجھے انتظار سحر کا تھا، وہی شب کی بات سحر میں ہے

وحشت

جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

غالبؔ

منہ دکھایا ہی نہیں سامنے آیا ہی نہیں
ہائے ظالم کا جفاؤں سے پشیماں ہونا

وحشتؔ

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

غالبؔ

ہزار بار سہیں ہم فراق کے صدمے
ترا وصال اگر ایک بار ہو جائے

وحشتؔ

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غالبؔ

خاک میں مل گئے ولے آنکھ اٹھی نہ شرم سے
ہم سے ہوا نہ حق ادا اس کی نگاہِ ناز کا

وحشتؔ

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑ نا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

غالبؔ

نمک افشانیاں پھر کیوں تبسم ہائے پنہاں کی
مرے زخم جگر کا گر مداوا ہو نہیں سکتا

وحشتؔ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

غالبؔ

قائل ہوں خوش کلامیٔ واعظ کا میں ولے
پیرِ مغاں سے مجھ کو عقیدت ہے کیا کروں

وحشتؔ

گو واں نہیں ہیں واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

غالبؔ

کیا ہوا وحشتؔ اگر ہوں دور کوئے یار سے
رکھتی ہے نسبت چمن سے نکہتِ برباد بھی

وحشتؔ

غالبؔ کی تقلید میں اور بھی وحشتؔ کے بہت سے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں، مگر ہم نے اختصار سے کام لیا ہے، کیوں کہ سب کو پیش کرنا یہاں ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ واقعی وحشتؔ نے تتبع غالبؔ کا حق ادا کر دیا۔ جب انھوں نے شاعری شروع کی تھی تو اسی وقت انھیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ غالبِؔ ثانی اور غالبِؔ دوراں ہونا ان کا مقدر ہے:

ترے اندازِ سخن سے ہے یہ ظاہر وحشتؔ
کہ مقدّر ہے ترا غالبِؔ دوراں ہونا

وحشتؔ نے غالبؔ کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اسے پختگی اور صلابت عطا کی اور زمانہ انھیں غالبِؔ ثانی ماننے پر مجبور ہو گیا، لیکن یہ بھی اپنی جگہ درست ہے کہ تقلیدِ غالبؔ ہی کی وجہ سے ان کی شاعری کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا اور انھیں سب سے زیادہ نظر انداز بھی کیا گیا۔ ان کے ان اشعار سے اغماض برتا گیا جن میں ان کا خاص اپنا رنگ ہے۔ انھیں صرف مقلّد کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ خصوصاً ایسا بعد کے ناقدین نے کیا۔ ان کے دور میں جتنے بڑے شعرا اور ناقدینِ ادب

موجود تھے انھوں نے ان کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس دور کے سب سے بڑے ناقد خواجہ الطاف حسین حالی نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا اور حسرت موہانی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

> ''مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ زمانہ موجودہ کے ان چند برگزیدہ شعرا میں سے ہیں جن کے حسنِ کلام پر اردو شاعری کو فخر کرنا چاہیے۔''
>
> (اردوئے معلی، اپریل ۱۹۱۰ء)

احیائے غزل

جن شعرا نے اردو غزل گوئی کا احیا کیا ان میں رضا علی وحشت کا نام بھی نمایاں ہے۔ اردو غزل کا احیا ہوتے ہی اس کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی اور اب غزل 'جدید غزل' کہلانے لگی۔ جدید ذہن کی کارفرمائی، خیالات کی ندرت، وسعت اور رفعت نے غزل کا معیار بلند کیا۔ انداز بیان زیادہ متین اور سنجیدہ ہو گیا۔ جدید علوم نے غور و فکر کے انداز کو بھی بدلا۔ وحشت نے جب شاعری شروع کی تو اس وقت اردو غزل سے متعلق گوناگوں بدگمانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ حالی نے غزل پر سخت اعتراضات کیے اور غزل کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ وحشت نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، مگر آخر کار انھوں نے اسی مطعون صنفِ سخن کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ ثاقب کانپوری لکھتے ہیں:

> ''میں نے جب ہوش سنبھالا اور رسائل و اخبارات کا مطالعہ شروع کیا تو ہندوستان میں طوطیِ بنگالہ وحشت کے ترانے گونج رہے تھے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ وحشت کا پہلا دیوان ۱۹۱۰ء میں شائع ہو چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب داغ، امیر اور جلال بزم شعر کے مسند نشین تھے اور دوسری طرف حالی کی آواز آہستہ آہستہ دلوں پر اثر کر رہی تھی — داغ اور امیر خود تو بڑے شاعر تھے لیکن ان کی تقلید نے غزل کو محدود اور اس کی ذہنی سطح کو پست کر دیا — ان حالات میں چند مسیحا نفس نغمہ سراؤں نے غزل کو تہذیبِ حیات و شاعری کا معیار بنانے کی

> کوشش کی۔ حسرت موہانی مرحوم کو بجا طور پر ''اردو غزل کا مسیحا'' کہا جاتا ہے مگر افسوس یہ کہ غزل کی حیاتِ نو میں جن دوسرے بزرگوں کا حصہ ہے ان کے مرتبہ اور عظمت کا خاطر خواہ اعتراف نہ کیا گیا — شاد عظیم آبادی، رضا علی وحشت اور عزیز لکھنوی انھی مسیحا نفسوں میں سے ہیں۔'' (مہر نیم روز، کراچی، وحشت نمبر۔ ص: ۵)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''انھوں نے (وحشت نے) وہ پر آشوب دور بھی دیکھا جب غزل پر ہر طرف سے اعتراضات کے تیر برس رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غزل جس کا تصور غالب کے اس مصرعہ میں ہے کہ
>
> آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے
>
> واقعی پگھل کر ختم ہو جائے گی لیکن اس دور میں بھی غزل گو، غزل کے امکانات سے مایوس نہیں ہوئے اور ان کی کوششوں سے غزل کو نئی زندگی اور توانائی نصیب ہوئی۔ اس فہرست میں فانی، اصغر، حسرت، یگانہ، جگر، عزیز اور آرزو کے ساتھ وحشت بھی ضرور شامل ہیں۔'' (ایضاً، ص: ٦)

اس طرح وحشت نے بھی دوسرے شعرا کی طرح غزل کی حیاتِ نو میں اہم رول ادا کیا۔

وحشت کا رنگ خاص

جنھوں نے وحشت کے تعلق سے صرف سنی سنائی باتوں پر رائے قائم کی ہے یا جن لوگوں نے ان کے مجموعہ ہائے کلام کا سطحی مطالعہ کیا ہے ان کی رائے بھی سطحی ہے اور جو لوگ اس سطحیت کو قطعیت سمجھتے ہیں، وہ سراسر مغالطے میں ہیں۔ دیکھنے والوں نے عام طور پر صرف انھیں مقلد کی حیثیت سے دیکھا ہے، مگر ان کے کلام کا عمیق مطالعہ کیجیے تو پتا چلے گا کہ انھوں نے بھی اردو شاعری کو کچھ دیا ہے، جس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ بیسویں صدی نے کئی بڑے شعرا کو جنم دیا، ان میں وحشت بھی تھے اور اقبال بھی۔ ایک کو زمانے نے غالبِ ثانی اور غالبِ دوراں کہا اور دوسرے کو شاعرِ مشرق۔ تخلیقی وفور اور ندرتِ فکر کے باوجود اقبال کے ہاں بعض فنی نقائص بھی پائے جاتے

ہیں اور زبان کی سطح پر بھی ان پر اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں۔ وحشت کی نگاہ فن پر بھی گہری تھی اور اس کا اقرار اس دور کے سبھی ناقدینِ فن نے کیا۔ کون ہے جو وحشت سے متاثر نہ ہوا۔ وحشت نے تو اردو غزل کے سب سے پہلے اور اس دور کے سب سے بڑے ناقد حالی سے خراج تحسین حاصل کیا۔ شبلی نے ان کے فن کا لوہا مانا۔ شرر، اقبال، شوق قدوائی، ظہیر دہلوی، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، محشر لکھنوی، نظم طباطبائی، امداد امام اثر، منشی دیا نرائن نگم، علامہ تمنا عمادی، اثر لکھنوی، صفی لکھنوی، ناطق لکھنوی، آرزو لکھنوی، جگر مرادآبادی، نیاز فتح پوری، عندلیب شادانی، ابواللیث صدیقی، ثاقب کانپوری، جمیل مظہری، ل- احمد اکبرآبادی، آلِ احمد سرور، وفا راشدی، خواجہ احمد فاروقی، جوش ملیح آبادی، ابراہیم ہوش — سبھی ان کے معتقد اور معترف تھے۔

وحشت کی انفرادیت پر کچھ لکھنے سے پہلے چند معروف شعرا اور سرکردہ ناقدین کی آرا پیش کرنا بالکل مناسب ہے، جن سے ان کی انفرادیت پر رائے قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔ شبلی نعمانی کہتے ہیں:

''آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔''
(مشمولہ دیوانِ وحشت ۱۹۱۰ء)

عبدالحلیم شرر وحشت کے رنگِ خاص کے قائل ہیں:

''حضرت وحشت کی طبیعت شاعری کے لیے بہت مناسب واقع ہوئی ہے۔ کلام میں خاص رنگ اور خاص لطف ہے۔ پرانے مذاق کے نباہنے کے ساتھ جدید رنگ کی شوخیاں اور دلچسپیاں بھی پیدا کرنا حضرت وحشت کا خاص رنگ ہے۔''
(دلگداز، لکھنؤ، اپریل ۱۹۱۰ء)

محشر لکھنوی کا خیال ہے:

''آپ کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب وحشت کو سرمایۂ شاعری من جانب اللہ عطا ہوا ہے۔ اکتسابی کوشش کا ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ آپ کے سینے میں بااثر دل حقیقی جذبات کا مخزن ہے......فارسی ترکیبوں کے

صرف کرنے میں خدا داد طبیعت کو سلیقہ خاص عطا ہوا ہے، سب سے بالاتر اور لائق تحسین یہ امر ہے بلکہ اسی کو مشقِ کمال یا کمالِ مشق کہنا چاہیے کہ فارسی بندشوں میں ادائے خیال کے وقت کسی مقام پر کہیں الجھن نہیں۔ جو مضمون ہے وہ موتی کی طرح صاف، جو تخیل ہے وہ بالکل پاک و پاکیزہ۔ یہی طریقہ بلاغت کی جان اور یہی انداز فصاحت کی روح ہے۔''
(رسالہ معیار، لکھنؤ، مئی ۱۹۱۰ء)

اثر لکھنوی کی رائے دیکھیے:

''رنگِ غالب کو اتنی خوبی اور کامیابی سے برتنے والا اس دور میں ان کے سوا اور کوئی نہ تھا مگر خود ان کا بھی ایک خاص رنگ تھا......کورانہ تقلید یا محض لفاظی سے کوسوں دور۔''
(مہر نیم روز، کراچی، وحشت نمبر-ص:۵)

ثاقب کانپوری کہتے ہیں:

''حسرت موہانی مرحوم کو بجا طور پر 'اردو غزل کا مسیحا' کہا جاتا ہے مگر افسوس یہ کہ غزل کی حیات نو میں جن دوسرے بزرگوں کا حصہ ہے ان کے مرتبہ اور عظمت کا خاطر خواہ اعتراف نہ کیا گیا— شاد عظیم آبادی، رضا علی وحشت اور عزیز لکھنوی انھیں مسیحا نفسوں میں سے ہیں، عزیز نے لکھنؤ میں اور وحشت نے بنگال میں غالب کو اپنا خضرِ راہ بنایا، مگر ان دونوں نے اندھی تقلید نہ کی — ان کی تقلید خلاّقانہ تھی اور ان کی شاعری میں ان کی انفرادیت بھی نظر آتی ہے۔'' (ایضاً)

شبلی کے مطابق وحشت کے کلام میں جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ شرر کے مطابق کلامِ وحشت میں جدید رنگ کی شوخیاں اور دلچسپیاں موجود ہیں۔ محشر لکھنوی کے مطابق وحشت کا جو طریقۂ شاعری ہے وہ بلاغت کی جان ہے اور ان کا جو انداز شاعری ہے وہ فصاحت کی روح ہے جس میں اکتسابی کوشش کو ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ اثر لکھنوی کے مطابق وحشت کی شاعری کورانہ تقلید اور محض لفّاظی سے کوسوں دور ہے اور ثاقب کانپوری کے بموجب وحشت کی شاعری میں ان کی انفرادیت بھی نظر آتی ہے۔ اب دیکھیے خواجہ احمد فاروقی کیا کہتے ہیں:

''مولانا وحشت خوب سمجھتے تھے کہ روایتی غزل کا رس نچڑ چکا ہے۔ اب اس میں

رنگینی خونِ جگر اور فکر و خیال ہی سے پیدا کی جاسکتی ہے چنانچہ انھوں نے ماضی و حال کا جائزہ لیا اور اپنے رنگ و آہنگ سے نیا راستہ نکالا جس میں ماضی کی توانائی، حال کا شعور اور مستقبل کے امکانات پوشیدہ ہیں۔''

(وحشتؔ کی انفرادیت، مطبوعہ 'روحِ ادب' ۱۹۸۴ء)

وحشتؔ کی شاعری ماضی کی توانائی، حال کے شعور اور مستقبل کے امکانات پر محیط ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وحشتؔ نے اپنے لیے نیا راستہ نکالا جس سے ان کی انفرادیت باقی رہی۔ خواجہ احمد فاروقی کا خیال درست ہے کہ وحشتؔ نے اپنی خلّاقی کے ذریعہ غزل کا احیا کیا۔ حسرتؔ موہانی کی طرح انھوں نے بھی تغزّل ہی کو اپنا میدان بنایا اور تمام عمر اسی صنفِ خاص میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے لہو سے اردو غزل کو سینچا، اس کی آبیاری کی اور اس کی نوکِ پلک سنواری۔ بنیادی طور پر ان کی غزل کا مزاج روایتی ہے، مگر انھیں اس کا علم اچھی طرح تھا کہ روایت کی صحت مند پاسداری 'لکیر کا فقیر' ہونے کا نام ہرگز نہیں۔ ان کی شاعری طرزِ قدیم میں رنگِ جدید کی آمیزش ہے۔ اس نقطۂ نظر کی وضاحت ان کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے:

طرزِ جدید میں ہے وہی شیوۂ قدیم
بھرتے ہیں جامِ نوکو شرابِ کہن سے ہم

وحشتؔ نے قدیم و جدید کے امتزاج سے اپنی شاعری میں وہ رنگ و آہنگ پیدا کیے جو انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتے ہیں۔ جدید رجحانات اور نئی قدروں کو انھوں نے اپنی شاعری میں جگہ دی:

تم مرے گھر کو اگر آکے نہ کرتے روشن
آتشِ شوق چراغِ شبِ فرقت ہوتی

محیطِ عشق میں ہم شورِ طوفاں بن کے اٹھے ہیں
ہمیں آتا نہیں اندازِ رازِ دل چھپانے کا

کون جانے کہ یہ کافر نظری کس کی ہے
خبر اتنی ہے کہ ثابت مرا ایماں نہ رہا

حسرتوں کا ہائے رے دل میں ہجوم
آرزوؤں کا نتیجہ دیکھیے

اپنے ذوقِ قتل کی بسمل کہاں پاتا ہے داد
دیکھیے جس کو ثنائے بازوئے قاتل میں ہے

لوٹا ہے مجھے اس کی ہر ادا نے
انداز نے ناز نے حیا نے

سببِ عیش ہے مجھ کو ترے گیسو کا خیال
رفتہ رفتہ نہ کہیں خواب پریشاں ہوجائے

بدلتے وقت کے ساتھ وحشتؔ کا رنگِ سخن بھی بدلا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں انفرادی شان پیدا کی۔ جدت اور ندرت سے کام لیتے ہوئے اپنے لیے الگ راہ نکالی۔ یہی راہ فن کی بلندیوں کو چھوتی ہے اور زمانہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ ان کی طبیعت ندرت پسند ہے۔ جب ان کی طبیعت جدت آفریں ہوتی ہے تب ان کا رنگِ خاص اور نیا انداز کھل کر سامنے آتا ہے۔ خود کہتے ہیں:

ہماری طبع جب ہوتی ہے جدت آفریں وحشتؔ
نیا اندازِ فنِ شعر میں ایجاد ہوتا ہے

وحشتؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کے ذہنی سفر کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ زمانے کے تغیر کے ساتھ ان کے مزاج میں بھی تبدیلی آئی اور یہ تبدیلی اپنے ہمراہ مختلف میلانات بھی لائی۔ 'دیوانِ وحشتؔ' کے مقابلے میں 'ترانۂ وحشتؔ' اور 'نقوش و آثار' کا مطالعہ کیجیے تو یہ تبدیلی صاف طور پر محسوس ہوتی ہے۔ نیازؔ فتح پوری وحشتؔ کے اہم نقّاد ہیں۔ ان کی جدید شاعری پر نیازؔ فتح پوری کا یہ بیان لطف سے خالی نہیں۔ ملاحظہ ہو:

"جذبات و خیالات میں تغیر ہونا ضروری ہے لیکن اگر رسالہ تجلّی میں ان کی ایک غزل میری نگاہ سے نہ گزرتی تو شاید میں وحشت کی شاعری کے متعلق اسی خیال پر قائم رہتا کہ ان کا جو رنگ اب سے پچاس سال قبل تھا وہی اب بھی ہے.......
ان کی جوانی کی شاعری کے سامنے تو لوگوں کا صرف سر جھکتا تھا لیکن اب ان کے اس رنگ کے سامنے روح دوزانو ہوتی ہے۔" (نگار، لکھنؤ، جون ۱۹۴۶ء)

حالات کے تحت وحشت کے رنگِ سخن میں تبدیلی آنا فطری امر تھا۔ ہم ان کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک دور وہ جو 'دیوانِ وحشت' (مطبوعہ: ۱۹۱۰ء) سے کچھ پہلے اور بعد کا ہے۔ دوسرا دور 'ترانۂ وحشت' (مرتبہ: ۱۹۵۰ء، مطبوعہ: ۱۹۵۳ء) تک کا ہے اور آخری دوران کی وفات تک کا ہے۔ آخری دور کا کلام 'نقوش و آثار' میں ملتا ہے۔ وحشت کبھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں رہے، پھر بھی حقیقی معنوں میں ہمیشہ ترقی پسند رہے۔ ان کے کلام کے ترقی پسندانہ پہلوؤں سے اغماض ناممکن ہے۔ بقول ل۔ احمد اکبر آبادی:

"روایتی غزل اور حکیمانہ تفکر کے ساتھ وحشت کے یہاں ایک بالکل نئی چیز بھی نظر آتی ہے جو اساتذۂ متقدمین کے یہاں مفقود ہونے کے برابر ہے۔ یعنی اگر کسی کے ہاں نظر آ بھی جاتی ہے تو وہ غیر ارادی، غیر محسوس شدہ ہے۔ وحشت کے کلام میں دوسری تمام خصوصیات و شعری محاسن کے ساتھ فکر و خیال کا ترقی پسندانہ پہلو ملتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جس وقت ان کی شاعری کا شباب تھا شعر و ادب کے باب میں ترقی پسندی کی اصطلاح وضع کرنے کا خیال بھی کسی دماغ میں نہیں آیا تھا۔ اس اعتبار سے وحشت کو اگر اردو شعر میں ترقی پسندی کا امام کہا جائے تو بالکل حق بجانب ہوگا۔"

(مغربی بنگال، کلکتہ، وحشت نمبر ۱۹۹۶ء۔ ص: ۱۷)

روایات کی صحت مند پاسداری میں وحشت کی شاعری صرف حسن و عشق، فراق و وصال، دردِ دل، سودائے جنوں کی داستان نہیں بلکہ نصیحت، فلسفہ، اخلاق، خودداری، درسِ جہد، تلقینِ عمل، خوداعتمادی، صبر و توکل، وطن سے محبت اور قومی درد کا ایک جیتا جاگتا مرقع ہے:

وہ کئی لفظ جانتے ہی نہیں
مہر، الفت، کرم، وفا، اخلاص

بہت حسرت افزا ہے شمعِ مزار
بجھا یا مجھے جب جلایا چراغ

خدا کا شکر ہے وحشت کہ باہم شاد ہیں دونوں
جو ہم خوش ہیں وفا کر کے تو وہ خوش ہیں جفا کر کے

اللہ رے زورِ مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیوں کر وہ اٹھایا جاتا ہے

نوٹ: (نیاز فتح پوری نے اس شعر کو الہام پارہ سے تعبیر کیا ہے۔)

تعجب کیا اگر میری پریشانی نہیں جاتی
کہ میں مشکل میں ہوں اور فکرِ آسانی نہیں جاتی

تو کسی کا ہو کے دیکھ اے شکوہ سنجِ روزگار
کیوں یہ کہتا ہے کہ دنیا میں مرا کوئی نہیں

حال ہم کہیں کس سے کس کو کس کی پروا ہے
کوئی ہم زباں ہوتا کوئی آشنا ہوتا

یہاں ہر آنے والا بن کے عبرت کا نشاں آیا
گیا زیرِ زمیں جو کوئی زیرِ آسماں آیا

قابلِ اعتراض ہوتی ہے
خاص کر وہ روش جو عام نہیں

وہ بات ہو کے رہے گی جو ہونے والی ہے
نہ چھیڑے اپنی مصیبت کی داستاں کوئی

کیا ہوئی مہر و محبت کیا ہوئے قول و قرار
یہ نظر بدلی ہوئی اور یہ زباں بدلی ہوئی

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی
کہ یہ بھی چاہیے رنگینیٔ چمن کے لیے

طریقہ ہے زمانے کا یہی، کیا کیجیے اس کو
کوئی برباد کرتا ہے کوئی برباد ہوتا ہے

مری بے قراریوں کا ہے سبب ترا تغافل
تری بے رخی ہے سرخی مرے دل کی داستاں کی

تقدیر کا ہر دن رونا ہے یعنی کہ چراغ ارمانوں کا
ہر روز جلایا جاتا ہے ہر روز بجھایا جاتا ہے

کچھ ان کے حسن کی تابش کچھ اپنے دل کی تپش
کبھی نہ دیکھ سکے ہم انھیں نظر بھر کے

شاعری حیاتِ انسانی کی آئینہ دار ہے۔ زندگی کی سچی نقاشی اور احساسات کی مکمل صورت گری ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ اچھا شعر حسنِ خیال اور حسنِ بیان دونوں کا ملا جلا مرقّع ہوتا ہے۔ شعر وہی کامیاب ہے جس میں ہم اپنے سے قریب تر ہوتے ہوئے اور اپنے آپ کو چھوتے ہوئے محسوس کریں۔ اس میں ہمارے احساسات/جذبات کی عکاسی، خیالات کی ترجمانی اور ضمیر کی آواز ہو۔ شعر وہی قابلِ تعریف ہے جو دل میں اتر آئے اور گھر کر لے۔ اسی معیار پر کلامِ وحشتؔ کا مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ان کے بعض اشعار براہِ راست دل

میں اتر کر گھر کر لیتے ہیں۔ بعض پر تاثیر ہیں اور بعض مست کر دینے والے، جنھیں سنتے ہی ہمارا وجدان ہمیں وجد پر آمادہ کرتا ہے:

ہمارا نالۂ موزوں ہے جس کو شعر کہتے ہیں
غزل کی شکل میں ہوتی ہے وحشتؔ گفتگو دل کی

کوئی پوچھے دلِ مجبورِ اربابِ مروّت سے
کہ پاسِ دوستی بھی کس قدر دشوار ہوتا ہے

دونوں نے کیا ہے مجھ کو رسوا
کچھ درد نے اور کچھ دوا نے

اک زخم ہے کہ جس کو مرہم سے دشمنی ہے
اک درد ہے کہ جس کو پروا نہیں دوا کی

ہاں دل سے سنیں آپ کہ ہم کہتے ہیں دل کی
اظہارِ حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں ہے

ہے ہدایت کے لیے موجود خود تیرا ضمیر
گوشِ دل سے سن حقیقت کی یہی آواز ہے

ایک پر ایک کی حالت کا اثر ہوتا ہے
دل تڑپتا ہے تو مجروح جگر ہوتا ہے

زخم میں لطفِ خلش درد میں لذّت ہوتی
تجھ کو اے دل جو حقیقت میں محبت ہوتی

خوشی ان کو مبارک ہو الٰہی
وہ خوش ہیں خاک میں مجھ کو ملا کر

کہانی اپنی بھی وحشتؔ عجب کہانی ہے
جسے سنایئے وہ اشک بار ہوجائے

مندرجہ بالا اشعار دل کو چھو جاتے ہیں۔ یہاں 'حیاتِ وحشتؔ' سے وفاؔ راشدی کا یہ بیان نقل کرنا، نامناسب نہ ہوگا:

> ''قاری کے قلب اور ذہن پر ایک مستقل اثر چھوڑ جانے کی یہ کیفیت وحشتؔ کی غزل میں ان کے مخصوص لہجے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس مخصوص لہجے کے دھیمے پن میں وہی تاثیر ہے جو حسرتؔ، فانیؔ، جگرؔ، اصغرؔ اور آرزوؔ کی غزلوں میں ان کے انفرادی اندازِ نظر اور اسلوبِ اظہار کی بدولت پیدا ہوئی۔ اس دھیمے لہجے میں ایک طرف تو درد کی کسک اور دوسروں کے درد کو اپنا درد بنا کر پیش کرنے کا جو قابلِ رشک وصف اور دوسری طرف اس درد کو برداشت کرنے کا جو جرأت آمیز حوصلہ ہے اس کا اندازہ کچھ شعر پڑھ کر کیا جا سکتا ہے۔''
>
> (وفا راشدی، حیات وحشت، ص ص: ۷۲-۷۳)

وحشتؔ کے لیے زندگی المیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ زندگی کا محض تصور نہیں کرتے بلکہ اسے جھیلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں حیاتِ انسانی کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ انھوں نے غزل کو وسیلۂ اظہار بنایا اور اسی کی وساطت سے دلی جذبات، احساسات اور تجربات کو پیش کیا۔ انھوں نے حالات کی تلخیوں سے منہ نہیں چرایا، بلکہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ یہ جرأت ان کے اسلوب کو نئے مزاج سے آشنا کرتی ہے۔ ان کے انھی احساسات اور تجربات نے قاری کے دل میں جگہ پائی۔ قاری ان کے خیالات میں شریک ہوا۔ ان کے شعر کی آفاقیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے:

بہت شورش انگیز تھے میرے ارماں
بہت حسرت افزا مری داستاں ہے

طور دیکھے ہیں زمانے کے ہمارے دل نے
اب کہاں اس میں تمنا کا گزر ہوتا ہے

جہاں میں چھوڑ جاتا میں المناک ایک افسانہ
اگر مجھ سے مری رودادِ غم تحریر ہوجاتی

ہمارے پاؤں میں تم نے تو زنجیرِ وفا ڈالی
تمھارے ہاتھ سے کیوں رشتۂ مہر و کرم چھوٹا

وحشتؔ کے کچھ اشعار تو بالکل ضرب المثل ہو چکے ہیں:

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

ہماری دور بینی ہے ہمارے امن کی دشمن
نہ ہوتی فکرِ مستقبل تو عیشِ جاوداں کرتے

مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے تم بیاں کرتے کہیں سے ہم بیاں کرتے

دیر و حرم کی قید نہ تھی راہِ شوق میں
میں نے نمازِ عشق ادا کی جہاں ہوا

شرمندہ کیا جوہرِ بالغ نظری نے
اس جنس کو بازار میں پوچھا نہ کسی نے

وحشتؔ نے اردو غزل کو زندگی عطا کی۔ ہر رنگ میں اسے برتنے کی کوشش کی۔ جدید حسیت کو پیش کر کے اپنی جدت پسند طبیعت کا ثبوت دیا۔ اسی لیے ان کا شمار شعرائے جدید کی صف میں کیا جاتا ہے۔ جب اردو غزل پر تنقید کے تیر برس رہے تھے تو اس وقت ایک طرف حسرتؔ موہانی اور دوسری طرف رضا علی وحشتؔ نے غزل کی آبرو رکھ لی۔ اپنی مشّاقی کے وہ جوہر دکھائے کہ زمانہ عش عش کرتا رہ گیا۔ ان کی شاعری بھی جدید ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ عتیق کہتے رہے۔ ہر دور کی شاعری کچھ پرانی اور کچھ نئی ہوتی ہے۔ پرانی اس لیے کہ روایت سے بالکل منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ جدید اس لیے کہ ہر زمانے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، اور تمام فنونِ لطیفہ کی طرح شاعری بھی اس سے منہ نہیں موڑ سکتی۔ جدید شاعری میں فنکار اپنے افکار، احساسات اور تجربات کے آئینے میں منفرد ہوتا ہے۔ اس پر مسلک یا نظریے کا دباؤ نہیں ہوتا۔ فن کار کھلی فضا میں سانس لیتا ہے اور آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ وحشتؔ کا شمار جدید غزل گویوں میں اسی لیے ہے کہ انھوں نے بھی اس قبیل کے شعر کہے، جن میں جدت، ندرت اور پختگی نمایاں ہے:

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

نظر اٹھائی نہیں اور بات کی میں نے
زبان کھولی نہیں اور ان کو دیکھ لیا

جو کہیے کچھ تو وہ اپنی خطا ٹھہرتی ہے
خموش رہیے تو ہوتا ہے بدگماں کوئی

بے وفائی سبھی معشوق کیا کرتے ہیں
تم اگر مجھ سے وفا کرتے تو جدت ہوتی

تیری نگاہِ مست سے ڈرنے لگا ہوں میں
بے ہوش کیا ہوا کہ مجھے ہوش آ گیا

مرے تو دل میں وہی شوق ہے جو پہلے تھا
کچھ آپ ہی کی طبیعت بدل گئی ہوگی

وحشتؔ کے کلام میں اس طرح کے وافر اشعار مل جائیں گے۔ ان کی انفرادیت کے تعلق سے اب تک جتنے بھی اشعار پیش کیے گئے، ان کی روشنی میں اگر ہم ان کے مقام کا تعین کریں تو جدید شاعری میں ان کا مقام بلند نظر آئے گا۔ ان کے یہاں روایت کی پاسداری کے ساتھ جدید تقاضوں کا لحاظ جس رنگ میں ملتا ہے اس سے ان کے لہجے کی تشکیل ہوئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں وہ مقام دیا جائے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں اور خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں:

''وحشتؔ کے کمالات کا عدم اعتراف نہ صرف تاریخی غلطی ہے بلکہ ناسپاسی بھی ہے۔'' (وحشتؔ کی انفرادیت، مطبوعہ 'روحِ ادب' ۱۹۸۴ء)

آخر میں بہت سی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے وحشتؔ کا یہ شعر درج کرنا ضروری ہے:

ہر بات میں زمانے کی تقلید کیوں کریں
سب ایک ہی روش پہ چلیں کیا ضرور ہے

○○○

نظم نگاری

دل پھنکا جاتا ہے پر آہ کہاں کرتا ہوں
کس قدر پاس ترا سوزِ نہاں کرتا ہوں

وحشتؔ

وحشتؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل کا مخصوص مزاج ہے۔ ان کی غزل گوئی کا دائرہ جتنا وسیع ہے، نظم نگاری کا دائرہ اتنا ہی محدود۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غزل گو ہی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ حالانکہ بیسویں صدی میں شعرا کی بڑی تعداد نظم نگاری کی طرف مائل تھی۔ غزل پر تنقید کے تیر برس رہے تھے اور نظم میں طرح طرح کے تجربے کیے جا رہے تھے۔ حالیؔ اور آزادؔ نے جس نظم نگاری کی بنیاد ڈالی تھی اس کی روایت کو دوسرے شعرا مزید تقویت بخش رہے تھے۔ اس سلسلے میں اسماعیلؔ میرٹھی، سرورؔ جہان آبادی، اکبرؔ الہ آبادی، برج نارائن چکبستؔ، نظمؔ طباطبائی اور اقبالؔ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ پھر متاخرین میں جوشؔ ملیح آبادی، حفیظؔ جالندھری، ن۔م۔ راشدؔ، میراجیؔ، اخترؔ شیرانی، اخترؔ الایمان اور احسانؔ دانش کا نام لیا جا سکتا ہے، مگر وحشتؔ کی طبیعت نظم نگاری کے لیے موزوں نہ تھی اور نظمیہ ماحول ہونے کے باوجود انھوں نے غزلیہ شاعری میں کمالِ فن دکھایا اور اپنی غزل گوئی پر فخر بھی کیا۔ ان کے دواوین کا مطالعہ کیجیے تو چند نظموں پر بھی نظر ٹھہرتی ہے۔ 'دیوانِ وحشتؔ' میں غزلیات کے بعد 'مخمسات'، 'قطعات'، 'رباعیات' اور 'جدید طرز کی نظمیں' کے عناوین کے تحت کچھ کلام موجود ہے۔ جدید طرز کی نظموں کے باب میں کل پانچ نظمیں 'دستگیریٔ عشق'، 'کبھی کی یاد'، 'ماتمِ آرزو'، 'غالبؔ' اور 'میرؔ' شامل ہیں، جن میں 'کبھی کی یاد' اور 'ماتمِ آرزو' معرا نظمیں ہیں، جبکہ دیگر تین نظمیں مسدس کی شکل میں ہیں۔ 'ترانۂ وحشتؔ' کی پہلی نظم حافظؔ کی غزل کی تخمیس ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے، اور وحشتؔ کی فارسی دانی / قادرالکلامی کا بہترین نمونہ ہے۔ 'فغانِ مسلم قبل از تخلیقِ پاکستان'، 'قوم سے خطاب'، 'خاکِ دہلی' وغیرہ نظمیں بھی 'ترانہ' ہی میں شامل ہیں۔

وحشتؔ کی نظمیں ہنگامی حیثیت / نوعیت کی ہیں، جو وقتی پیداوار ہیں اور حالات کے تقاضے

کے تحت لکھی گئی ہیں، مگر کچھ نظمیں خالص جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ایسی نظموں کی تعداد کم ہے۔ چونکہ وحشتؔ سوشل آدمی تھے۔ ان کے تعلقات کا دائرہ وسیع تھا جس میں عقیدت مندوں، احباب اور شاگردوں کی بڑی تعداد تھی۔ کسی کی شادی ہے۔ کسی کی رخصتی ہے۔ کسی کا استقبالیہ ہے۔ کسی کی تہنیت ہے۔ کسی کی موت ہوگئی۔ ایسے موقعوں پر وحشتؔ نے جو کلام تخلیق کیا وہ ظاہر ہے ہنگامی نوعیت کا اور محض رسمی تھا۔ اس میں نہ جذبات کی صحیح عکاسی ہوسکتی تھی اور نہ ہی خلاّقی کا مظاہرہ۔ اس لیے وحشتؔ کے تعینِ قدر میں ان نظموں کی حیثیت شاید ہی کچھ ہو۔ بہر حال ان کی وہ نظمیں جو داخلی جذبات و احساسات پر مبنی ہیں، ان کا ذکر کرنا ضروری ہے اور ہماری بحث بھی انھی نظموں سے ہے۔ 'ماتمِ آرزو' کا شمار ایسی ہی نظموں میں ہے، جو اپنے اندر مخصوص کیفیت رکھتی ہے۔ عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ انھوں نے انسان کے دل میں پیدا ہونے والی بیجا آرزوؤں کا ماتم کیا ہے اور ان سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ نظم میں خاص تسلسل اور حسن ہے جو قاری پر دیرپا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رحمت خدا کی تجھ پہ ہو ناکام آرزو
اے خاطرِ ستم کشِ ایّام آرزو
آہ اے فریب خوردۂ نقشِ امید آہ
کیا کیا تری ہوس نے نہ تجھ کو کیا تباہ
طولِ امل کے دام میں تو پھنس کے رہ گیا
افسوس بر نہ آیا کوئی تیرا مدعا
سب تیری زندگانی کا روشن ہے مجھ پہ حال
معلوم خوب ہے ترا ہر عیب ہر کمال
طفلی ہی سے تو عیشِ خیالی میں مست تھا
خوابِ مسرتِ ابدی دیکھتا رہا
منصوبہ باندھتا تھا ہزاروں مگر کبھی
اے نامراد فکرِ عمل ایک دم نہ تھی

اوّل تو خواہشیں ہی تری بے شمار تھیں
اور پھر نکلنے کے لیے سب بے قرار تھیں

'کبھی کی یاد' وحشتؔ کی ایسی نظم ہے جس کے ذکر کے بغیر نظم نگاری کی بحث نامکمل رہ جائے گی۔ یہ نظم اپنے اندر بڑی معنویت اور لطافت رکھتی ہے، جس سے خاص تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وحشتؔ اس نظم میں اپنے ماضی کی طرف پلٹتے ہیں اور اس کا تخلیقی اظہار خوبصورت پیرایے میں کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

گئے وہ دن کہ روز و شب مجھے آرام رہتا تھا
یہی آرام تھا اک 'کام' جس سے کام رہتا تھا
مری تصویر سے ظاہر تھی اک صورت مسرت کی
مسرت صاف تھی تصویر گویا میری صورت کی
مجھے مسرور رکھتا تھا خیالِ خوابِ روحانی
نسیمِ آرزو کرتی تھی کیا کیا گوہر افشانی
تماشائے تجلی تھا زبس مد نظر مجھ کو
جمالِ یار کا آئینہ تھا دیوارو در مجھ کو
شرابِ بے خودی چلتی تھی ہر دم میری محفل میں
اٹھا تا تھا قیامت اشتیاقِ آشنا دل میں
چمن تھا میرا مسکن، گل مرے ہمراز تھے سارے
تکلف برطرف، معشوق کے انداز تھے سارے
نہ تھی کچھ فکرِ مستقبل نہ کچھ اندیشۂ ماضی
دل اپنے حال سے خوش تھا میں اپنے حال سے راضی

'دستگیرئ عشق' کا شمار وحشت کی کامیاب نظموں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اس نظم میں زندگی کو عشق کے بغیر 'بے سواد' بتایا ہے۔ وہ زندگی کو 'شکستِ ساغرِ امید' بھی کہتے ہیں۔ آخری بند

کو حاصلِ نظم یا نچوڑ سمجھا جا سکتا ہے۔ نظم کل سات بندوں پر مشتمل ہے۔ آخری بند ملاحظہ ہو:

اے دلِ ناداں کہ ہے اندوہ و غم ہمدم ترا
ہے چراغِ کشتہ کا سا بزم میں عالم ترا
عشق پیدا کر کہ عشرت آفریں ہو غم ترا
نغمہ بن جائے لبوں پر نالۂ پیہم ترا
''جاں نثارِ یار کردن خاک راز کردن است
قطرۂ ناچیز را دریائے گوہر کردن است''

وحشتؔ کی معروف ترین نظموں میں 'خاکِ دہلی' بھی ہے۔ اس میں تسلسل، ارتقائی کیفیت اور ربط ہے، جس میں انھوں نے دہلی کی عظمتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی تباہی کا ماتم بھی۔ چند اشعار:

ہوئے اے خاکِ دہلی تجھ پہ جورِ آسماں کیا کیا
چمن تیرا رہا ہے وقفِ تاراجِ خزاں کیا کیا
تماشے سیکڑوں دیکھے ہیں تو نے دورِ گردوں کے
ہوا تجھ میں ظہورِ انقلابِ آسماں کیا کیا
ترے گنجِ شہیداں پر نظر پڑتی ہے عالم کی
لٹے ہیں دولت و ثروت کے تجھ میں کارواں کیا کیا
دفینے تیرے ویرانوں میں دیکھے ہیں مبصر نے
بہار آگیں رہا ہے تیرا اندازِ خزاں کیا کیا
تو اے چشم و چراغِ ہند، ہے دولت کا گنجینہ
ہوئے ہیں گنجِ خوبی تیری مٹی میں نہاں کیا کیا
ہیں آثارِ صنا دید اعتبار آموزِ یک عالم
تری تہذیب کے پیدا ہیں دنیا میں نشاں کیا کیا

نصیرؔ و ذوقؔ و مومنؔ غالبؔ و آزردہؔ و احساںؔ
تری خاکِ مصفا سے اٹھے جادو بیاں کیا کیا
بس اب جانے بھی دے وحشتؔ یہ قصہ عہدِ ماضی کا
ٹپکتا ہے تری گفتار سے دردِ نہاں کیا کیا

'زبانِ اردو' وحشتؔ کی وہ نظم ہے جس میں انھوں نے اردو سے اپنی والہانہ اور بے پناہ محبتوں کا ثبوت دیا ہے۔ یہ نظم مختصر ہے، لیکن معنویت کے لحاظ سے دیگر نظموں میں اسے انفرادو اختصاص حاصل ہے۔ اختصار کی شرط غزل میں ہوتی ہے۔ نظم کے بیانیے میں تنظیم یا عضویاتی کل (Organic Whole) لازمی ہے۔ وسعت میں وحدت کا احساس ہی ارتباط پیدا کرتا ہے۔ یہ نظم مختصر ضرور ہے، لیکن موضوع کی مناسبت سے اس میں جس قسم کی وابستگی درکار ہے، وہ موجود ہے۔ جس شخص نے اردو زبان کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اس کے احساسات اس زبان کے تعلق سے کیا ہو سکتے ہیں، اس نظم کے چند اشعار سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

ہر اک دیار میں روشن ہے نام اردو کا
ہر ایک گوشے میں پہنچا پیام اردو کا
ہراک طرف طرب افزا شراب اردو کی
ہر ایک شخص کو مطلوب جام اردو کا
مفر نہیں ہے حریفوں کے واسطے کوئی
بچھا ہوا ہے ہر اک سمت دام اردو کا
اسی زبان سے ہے ارتباطِ اہلِ وطن
کفیلِ نظمِ وطن ہے نظام اردو کا
کشاں کشاں اِدھر آ جائیں گے سبھی وحشتؔ
ہے میرے ہاتھ میں پر کیف جام اردو کا

نظموں میں وحشتؔ کی حیثیت مصلح کی بھی ہے۔ اس لیے ان کی نظموں میں اصلاحی جذبات

موضوع کے تقاضے کی نسبت سے ابلاغ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ’قوم سے خطاب‘ ان کی وہ نظم ہے جس میں قوم سے ہمدردی بھی ہے اور تباہی کا ماتم بھی۔ بے حسی پر افسوس بھی ہے اور قوم کو بیدار کرنے کے جذبات بھی موجزن ہیں۔ خطابیہ انداز اور مشوروں نے بیانیہ کو سپاٹ بنا دیا ہے:

کچھ خبر بھی ہے تمھیں اس بات کی اے اہلِ قوم
سر پہ اعدا ہیں کھڑے کھینچے ہوئے شمشیرِ کیں
ہاں بجالاؤ تمھارا فرض جو ہے دوستو
یہ نہیں کہتے ہیں ہم ”تم بھی سنبھالو آستیں“
اپنے مذہب سے نہ ہو غافل اسی میں ہے صلاح
ان کو تم پیشِ نظر رکھو جو ہیں احکام دیں
سو چکے تم غفلتوں کی نیند اب ہشیار ہو
ہے تمھاری کوششوں کی منتظر فتحِ مبیں
کام مل جل کر کرو تنظیم کا رکھو خیال
حلِ مشکل کا ہے ضامن اتحاد المسلمیں
کہنے والے جو کہیں کہنے دو، تم حق پر رہو
صاف اٹھا دو دل سے خوفِ حرف گیر و نکتہ چیں
صلح کل مشرب رکھو، چھوڑ و عداوت کے طریق
کام بنتے ہیں محبت سے، عداوت سے نہیں

’فغانِ مسلم قبل از تخلیقِ پاکستان‘ وحشتؔ کے قلب کی آواز ہے۔ عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ یہ نظم مسلمانوں کے مسائل کو دل سوز انداز میں پیش کرتی ہے۔ ان کا رقت آمیز لہجہ براہِ راست دل پر اثر کرتا ہے۔ اس نظم کے اشعار پر غزل کے اشعار ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ پہلا ہی شعر دیکھیے:

درد سے تنگ آ کے مصروفِ فغاں ہوتے ہیں ہم
کب شکایت سنجِ جورِ آسماں ہوتے ہیں ہم

اس میں غزل کے تمام خواص موجود ہیں؟ اسی طرح سارے اشعار پر غزلیت یا غزلیہ رنگ غالب ہے۔ دیگر اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں:

اپنی بربادی کا افسانہ ہے مشہورِ جہاں
محفلِ دشمن میں زیبِ داستاں ہوتے ہیں ہم
قعرِ دریا میں ہم اتنے ہی گرے جاتے ہیں حیف
جس قدر شامت سے رسوائے جہاں ہوتے ہیں ہم
شادماں و کامراں ہوتے ہیں اپنے سب حریف
خستہ تن افسردہ دل آزردہ جاں ہوتے ہیں ہم
محترز دنیا سے، خود اپنی نگاہوں میں سبک
طبعِ عالم پر الٰہی کیوں گراں ہوتے ہیں ہم
کھائے ہیں دھوکے بہت اے آسمانِ نیلگوں
دل کبھی ہوتا ہے خوش تو بدگماں ہوتے ہیں ہم
امتیازِ حق و باطل یک قلم جاتا رہا
سود ہے مقصد مگر وقفِ زیاں ہوتے ہیں ہم
صدمہائے تازہ سے ہے قلبِ مسلم خونچکاں
آج پھر وحشتؔ نوا سنجِ فغاں ہوتے ہیں ہم

وحشتؔ کی نظموں کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ان کی اور بھی کئی نظمیں موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں سب کا ذکر کرنا یہاں مناسب نہیں۔ ان کی دوسری نظموں میں ’میرؔ‘ اور ’غالبؔ‘ بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ حافظؔ کی غزل پر ان کی کامیاب تضمین بھی ملتی ہے۔ شبلیؔ، اقبالؔ، اکبرالہ آبادی وغیرہ کی موت پر ان کی جو نظمیں ہیں، وہ محض رسمی نوعیت کی ہیں، مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بے کار ہیں۔ ان کی بھی اپنی اہمیت ہے جس سے انکار ہرگز ممکن نہیں۔ آخر میں ایک بار ہم پھر کہنا چاہیں گے کہ وحشتؔ کی شاعری کا اصل میدان غزل ہے، نظم نہیں۔ اپنی غزلوں ہی میں وہ

زیادہ کامیاب ہیں، اور دنیا انھیں غزل گو ہی کی حیثیت سے جانتی ہے۔

دیگر اصنافِ سخن

اس میں کوئی شک نہیں کہ وحشتؔ اقلیمِ غزل کے سلطان ہیں، لیکن کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے نظمیں بھی لکھ لیتے ہیں۔ انھوں نے کثیر تعداد میں رباعیات بھی تخلیق کیں، جو توجہ کی مستحق ہیں۔ ان کی رباعیات میں خوبصورت شاعری کے جوہر ملتے ہیں۔ جس طرح وہ غزل گوئی میں کامیاب ہیں، اسی طرح رباعی گوئی میں بھی انھیں کامیابی ملی ہے۔ وہ غزلوں کی مانند رباعیوں میں بھی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ان پر بھی کلاسکیت کی گہری چھاپ ہے۔ غزلوں کی طرح رباعیوں میں بھی ان کے فن کے جواہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ یہاں بھی قدیم وجدید کا امتزاج نظر آتا ہے۔ روایت وجدت کی آمیزش اور ان کا بے باک اظہار خصوصیت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ چند مثالوں کے ذریعے دیکھیے:

کیوں غمزۂ جاں ستاں کو خنجر نہ کہیں؟   کیوں عشوۂ دلنشیں کو نشتر نہ کہیں؟
کہتے ہو کہ کچھ شان میں میری نہ کہو   یوں ظلم کرو اور ستم گر نہ کہیں؟

تم وعدے بھی کرتے ہو مکرتے بھی ہو   تم آپ بگڑتے بھی سنورتے بھی ہو
عاشق سے جفا کے بعد کرتے ہو وفا   کیا خوب ڈراتے بھی ہو ڈرتے بھی ہو

گو ہم ہوں لطیف طبع و فرخندہ سر   فضل و ہنر و علم و حیا کے مصدر
لیکن جب نفس غالب آجاتا ہے   اس وقت بہائم سے کہیں ہیں بدتر

افعال تو وہ کہ جس سے شیطاں ہو خجل   پھر اس پہ ہیں نفس کی بدی سے غافل
اے جلوۂ قدس اک نظر اس جانب بھی   تا گردِ گنہ سے پاک ہو میرا دل

رنگین ہے جہاں، چمن طرازی دیکھو   دل شاد ہے خلق، کار سازی دیکھو

مجھ پر بھی رہے ہیں لطف اس کے جاری   یہ شانِ گنہ گار نوازی دیکھو

اس دور میں خاک ہو سخن کی عزت   جاہل لوگوں نے کھوئی اس کی وقعت
از بسکہ ہوا ہے مبتذل اب فنِ شعر   منظور نہیں کہ ہو کچھ اپنی شہرت

گو اس سے طبیعت اپنی گھبراتی ہے   توبہ شکنی وہی چلی جاتی ہے
بے توبہ مجھے بخش دے اے بارِ الہٰ   اب توبہ تو کرتے ہوئے شرم آتی ہے

ہم چند مثالوں پر ہی اکتفا کریں گے۔ اب ایک نظر تاریخ گوئی پر۔ تاریخ گوئی فن ہے اور کچھ حد تک مشکل بھی۔ رباعی اور قطعہ کی بحریں مختلف ہوتی ہیں۔ رباعی کی بحر میں تاریخی مادہ نکالنا شاعر کی قادرالکلامی اور پختہ کاری پر دال ہے۔ ایک مثال:

رباعی تاریخ طبعِ دیوانِ سید امداد امام اثرؔ

شمس العلما سیر والا گوہر   نواب سخنداں اثرؔ نیک سر
دیوانِ کلامِ خود مرتب فرسود   وحشتؔ سن طبع گفت تصنیف اثرؔ

۱۳۳۱ھ

چند قطعاتِ تاریخ بھی ملاحظہ فرمائیے:

قطعہ در تاریخِ وفات افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی

آج دہلی کی اٹھ گئی رونق   محفلِ شعر ہوگئی خالی
فکرِ تاریخ جب ہوئی وحشتؔ   شاعرِ محتشم صدا آئی

۱۳۵۹ھ

قطعہ در تاریخ وفات امیر المتغزلین حسرتؔ موہانی

ہے ہے غزل کی دنیا برباد ہوگئی اب   رخصت ہوئے غزل کے استاد یعنی حسرتؔ
تسلیم لکھنوی سے حاصل تھا جو تلمذ   ان کو نسیم و مومنؔ سے تھی سخن میں نسبت
وحشتؔ خدا کی رحمت مرحوم پر ہو نازل   تاریخ عیسوی لکھ حسرتؔ! خدا کی رحمت

۱۹۵۱ء

قطعہ در تاریخِ وفات حضرت آرزوؔ لکھنوی

ازیں دار محسن چوں آرزو رفت　　نوائے خلد روحش کرد تعلیم
نمایاں گشت وحشتؔ عیسوی سال　　زداغِ آرزو مشہورِ اقلیم

۱۹۵۱ء

وحشتؔ نے حمد، نعت، قصیدہ، مخمس، مسدس پر بھی طبع آزمائی کی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن پر توجہ دی، مگر حاصلِ سخن غزل ہی رہی۔ سب پر حاوی، سب پر مقدم۔ فارسی کلام بھی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

○○○

مقالہ نگاری

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

وحشتؔ

اکثر لوگ وحشتؔ کو صرف شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، مگر وہ بلند پایہ نثر نگار بھی تھے۔ ان کے مکاتیب اور مقالات عمدہ نثر کا نمونہ ہیں، لیکن سالک لکھنوی کی رائے بالکل درست ہے کہ ''جس شاعر کی زندگی اردو غزل کے گیسو سنوارنے میں گزری ہو اور تذکرہ نگارا سے بحیثیت شاعر نظر انداز کر چکے ہوں، اس کی نثر نگاری کی طرف کسی کی نظر کیسے جاتی۔'' (بنگال میں اردو نثر کی تاریخ، آغاز تا حال، ص: ۱۸۵) وحشتؔ کا اصل میدان شاعری ہی ہے، لیکن ان کی نثری نگارشات سے ان کا نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ انھوں نے گاہے گاہے مضامین بھی قلم بند کیے، جن پر توجہ کی ضرورت ہے۔ ابھی تک ان کے جتنے مضامین کا علم ہو سکا ہے، ان کی تعداد ۱۳ ہے۔ ان کی نثری خدمات میں دو ریڈیائی تقاریر، تبصرے اور تقاریظ شامل ہیں۔ ان کی نثر شگفتہ اور سلیس ہے۔ شعر کی طرح نثر میں بھی وہ لطفِ زبان کا خیال رکھتے ہیں۔ اپنی باتیں مضبوط دلائل اور حوالوں سے ثابت کرتے ہیں۔ ان کی رائے قابلِ اتفاق اور نپی تلی ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں تنقیدی و تحقیقی عناصر بھی ہیں، اور وہ بصیرت بھی، جو انھیں مطالعۂ بسیار کے بعد میسر آئی۔ ان کے مضامین پر معروف محقق ڈاکٹر عبدالرؤف کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

> ''صرف یہی نہیں کہ یہ مضامین حضرت وحشتؔ کے معیارِ نقد کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں بلکہ یہ اس عہد کے بھی ترجمان ہیں جن میں مولانا حالیؔ اور شبلیؔ تنقید کو ایک سائنٹفک حیثیت بخشنے کی کوشش کر رہے تھے۔''
>
> (مقدمہ، مضامین وحشتؔ۔ ص: ۱۱)

وحشتؔ کا پہلا مضمون ولیؔ دکنی پر ہے جو ۱۹۰۸ء میں لکھا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ولیؔ کا ذکر محض تذکروں تک محدود تھا اور مولانا محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' سے ان کی شاعرانہ عظمت کی واقفیت ہوتی تھی، لیکن وحشتؔ نے تذکروں کے انداز سے ہٹ کر ولیؔ پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ انھوں

نے ولیؔ کے کلام کا جو مطالعہ کیا، وہ گہری نظر اور رموزِ فکر وفن کی قدر شناسی پر دال ہے۔ انھوں نے ولیؔ کے کلام کا انتخاب پیش کیا اور اس پر بھرپور تبصرہ بھی کیا، جس سے ولیؔ کے لسانی اور شعری امتیازات کی مختلف جہتیں نشان زد ہوئیں۔ وہ ولیؔ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولیؔ کو موجد شعر اردو سبھوں نے بالاتفاق تسلیم کرلیا ہے اس سے پہلے کسی کسی نے ریختے میں کلام موزوں کیا ہے مگر اصل بنیاد ولیؔ ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔......
عالمگیر کے وقت میں اس کو سرسبزی حاصل ہوئی تھی اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں گجرات سے دہلی آیا تھا اور بہت سے لوگ اس کے فیض سے سخنور بنے تھے۔
اس وقت سوائے فارسی شاعری کے کوئی ذکر نہ تھا۔ ریختے سے لوگ ناواقف تھے۔ اس زمانے میں ولیؔ نے ریختہ کہا اور ایسا کہا کہ فارسی کہنے والے اردو کی طرف مائل ہوگئے۔ یہ واقعی ولیؔ کی کرامت تھی۔'' (مضامین وحشتؔ-ص:۲۱)

وحشتؔ نے کلامِ ولیؔ پر ایسا کامیاب تبصرہ کیا کہ فکر وفن کے ابعاد کا اختصاص روشن ہوا۔ ولیؔ کا کلام اس لیے بھی معروفِ خاص و عام ہے کہ ان کی زبان شستہ وسادہ ہے اور بقول وحشتؔ وہ حلاوت جو ولیؔ کے کلام میں موجود ہے سوائے میرؔ کی غزلوں کے ہمیں کہیں نہیں ملتی۔ ولیؔ کی طبیعت میں شاعرانہ گیرائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ہم ولیؔ کے کلام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وحشتؔ لکھتے ہیں:

''ولیؔ کی زبان کو گو آج کی اردو سے کوئی مناسبت نہیں مگر دلوں کو اس سے بوئے آشنائی آتی ہے۔'' (ایضاً-ص:۲۲)

ولیؔ کا سادہ کلام سیکڑوں رنگین بیان شاعروں کے کلام پر فوقیت رکھتا ہے۔ ولیؔ کی سادگی پر رنگین بیانی جھومتی ہے۔ مضمون آفرینی رقص کرتی ہے۔ بقول وحشتؔ:

''رنگین بیان شعرا گزرے ہیں۔ زورِ کلام سخنوروں نے دکھایا ہے، مضمون آفرینی کے کرشمے دیکھنے میں بہت آئے ہیں۔ مگر وہ سادگی وحلاوت جو ولیؔ کے کلام میں موجود ہے سوائے میرؔ کی غزلوں کے ہم کہیں نہیں دیکھتے۔''
(ایضاً-ص ص:۲۲-۲۱)

چوں کہ ولیؔ کی زبان آج کی زبان سے تھوڑی مختلف ہے، وہ 'سے' کو 'سوں' اور 'کب تک' کو 'کب لگ' لکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج بعض لوگ ان کی زبان پر ہنستے ہیں۔ حیرت ہے کہ لوگوں کی نظر صرف ان کے نامانوس، مغلق اور ادق الفاظ پر پڑتی ہے، سادہ اور عام فہم الفاظ پر نہیں پڑتی۔ وحشتؔ لکھتے ہیں:

''ولیؔ کی پرانی زبان پر آج کل کی اردو والے ہنستے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ہماری موجودہ زبان بھی ایک دن یوں ہی پرانی ہوجائے گی اور آئندہ نسلیں ہم پر ہنسیں گی۔'' (ایضاً-ص:۲۳)

وحشتؔ کے تبصرے میں معاملہ فہمی اور مستقبل کی آنکھیں مستور ہیں۔ اس بیان کی صداقت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پرانی زبان نہ صرف ہماری میراث بلکہ ہماری بنیاد بھی ہے جس پر ہماری شاندار لسانی عمارت کھڑی ہے۔ ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ وحشتؔ نے اپنے اس مضمون میں ولیؔ کی غزلوں سے ۱۵۶/اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ دو مستزاد، ایک مخمس اور دو رباعیاں بھی ان کے انتخاب کردہ کلامِ ولیؔ میں شامل ہیں۔ ان کا یہ مقالہ جامع اور معلومات افزا ہے۔ انتخاب بھی ایسا کہ وحشتؔ سے پہلے شاید ہی کسی نے پیش کیا ہو۔ اس مقالے میں وحشتؔ کا تحقیقی میلان بھی نظر آتا ہے، تنقیدی بصیرت بھی نظر آتی ہے اور ذوقِ انتخاب بھی۔ ان کے اس مقالے پر ڈاکٹر عبدالروٴف رقم طراز ہیں:

''حضرت وحشتؔ نے کلام ولیؔ کا ایک مطالعہ پیش کیا ہے جو سرسری نہیں بلکہ غائر اور حکیمانہ ہے۔ پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ تنقید کے معنی کسی کے کلام پر نکتہ چینی نہیں بلکہ تنقید کا نام ہے تفسیر شعر کا اور اس کیفیت کی باز آفرینی کا جو شاعر کے سینے میں ایک کسک بن کے رہتی ہے اور پھر حرف وصوت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔'' (مقدمہ، مضامین وحشتؔ-ص:۱۱)

فارسی گو شعرا پر وحشتؔ کے دو مضامین ہیں۔ پہلا حزیںؔ اور دوسرا غنیمتؔ پر۔ وحشتؔ کا وقیع مقالہ 'شیخ علی حزیںؔ' ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ کافی تفصیلی، بلکہ ان کے سارے مقالات میں

طویل ترین ہے۔حزیںؔ کی حیات اوران کے کلام پر اس مقالے میں بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے۔ نیز ان کے کلام کا طویل انتخاب بھی وحشتؔ نے پیش کیا ہے اور نمائندہ اشعار کی تشریح بھی کر ڈالی ہے۔کلام کے محاسن اور زبان کی لطافت کے باریک پہلوؤں کی نشاندہی بھی کر دی ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ آخر وہ دوسرے فارسی گو شعرا میں کیوں ممتاز ہیں۔انھوں نے ان کی ہنرمندی کا اعتراف کیا ہے۔ان کا یہ خیال دیکھیے اور حزیںؔ کی شخصیت کے ساتھ ان کے طرزِ تحریر کی بھی داد دیجیے:

''تصور کی آنکھوں سے اگر ہم دیکھیں تو ہم کو ایک قابلِ احترام صاحبِ ہنر نظر آئے گا۔ جو تنہا شہروں کی خاک چھان رہا ہے۔ اور شوقِ علم میں گھلا جاتا ہے۔ عشق اس کی سرشت کا جزو اعظم ہے۔ وہ بے اختیار عاشقانہ اشعار کہتا جاتا ہے۔اور خود مزے لیتا ہے۔مگر ساتھ ہی زمانے کی بے قدریوں سے افسردہ دل بھی ہے۔نغمات دلنشیں جستہ جستہ اس کے قلب پر اشتیاق سے نکل کر اس کی زبان سے تراوش کرتے ہیں۔مگر سمجھنے والے کہاں۔'' (مضامین وحشتؔ-ص:۵۷)

وحشتؔ نے کلامِ حزیںؔ کی ناقدری پر احتجاج کیا ہے اور مضبوط دلائل سے ان کے کلام کے لطیف نکتوں پر بحث کی ہے۔حزیںؔ نے غزل کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی، مگر ان کا اصل میدان غزل گوئی ہے۔بقول وحشتؔ:

''ہم کو ان کی غزل سے بحث ہے کیوں کہ قصائد، مثنویات اور قطعات گو اپنے اپنے رنگ میں اچھے ہیں مگر پورے طور سے استادانہ کلام کہلانے کے مستحق معلوم نہیں ہوتے ......شیخ کی غزلیں نہایت دل پسند واقع ہوئی ہیں۔ان کے کلام کا رنگ غزل کے لیے نہایت موزوں ہے اور ہر طرح قابلِ تتبع۔متانت۔صفائی۔ بیان و بندش۔رنگینیٔ الفاظ۔چاشنیٔ درد۔عاشقانہ اندازِ گفتگو۔تصوف۔سب خوبیاں یکجا جمع ہوگئی ہیں جن سے کلام نہایت گراں قدر معلوم ہوتا ہے۔''
(ایضاً-ص ص:۵۹-۵۸)

وحشتؔ نے شیخ علی حزیںؔ کی شاعری کا جو انتخاب پیش کیا ہے وہ داد طلب ہے اور بقول وحشتؔ

اس مضمون کا عین مقصد انتخابِ کلام ہی ہے۔ان کا مقالہ انتخاب کے ساتھ تنقید کا بھی درجہ رکھتا ہے۔انھوں نے اکثر شعروں کے موازنے میں دوسرے شعرا کے اشعار ضمناً درج کیے ہیں اور خصوصی تنقیدی نوٹ بھی لگائے ہیں۔انتخاب سرسری نہیں ہے۔انھوں نے حزیںؔ کے ضخیم ترین دیوان سے اس کا عطر کھینچ لیا ہے۔اس سلسلے میں خود انھی کا بیان درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''انتخاب ہم نے سرسری طور پر نہیں کیا ہے۔دیوان ضخیم تھا اور ہماری خواہش تھی کہ اس کا عطر کھینچ لیا جائے جس سے اربابِ بوشناس کا دماغ ہمیشہ معطر رہے۔ شروع سے آخر تک ہم نے ایک ایک شعر کو دیکھا ہے اور جس میں کوئی بات مخصوص نظر آئی ہے اس کو قلم بند کیا ہے۔ پھر ہم نے ان پھولوں کو بہ اعتبار ان کے رنگ و بو کے الگ الگ ترتیب دیا ہے۔امید ہے کہ اربابِ بصیرت لطف اٹھائیں گے۔'' (ایضاً-ص:۵۹)

وحشتؔ کے اس بیان سے ان کے ذوقِ انتخاب کا پتا چلتا ہے۔انھوں نے حزیںؔ کے اشعار کا موازنہ جن دوسرے شعرا کے کلام سے کیا ہے، ان میں غالبؔ اور حزیںؔ کے موازنے کی مثال دیکھیے:

''چشم رقیب گفتمش محرم روی خود مکن
کرد بکار دیدہ ام مصلحتِ شنیدہ را

اس شعر میں شوخی بھری ہوئی ہے۔کہتا ہے کہ میں نے جو اس سے کہا کہ تو غیر کو اپنا جمال نہ دکھلا تو اس نے اس نصیحت کا وار مجھی پر چلایا یعنی میری ہی نگاہ کو اپنے جمال سے محروم رکھا۔غالبؔ نے بھی اس مضمون کو لکھا ہے:

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

غالبؔ کا شعر حزیںؔ کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے اس وجہ سے کہ حزیںؔ کے شعر میں جہاں لفظ ''رقیب'' ہے غالبؔ کے ہاں ''غیر'' ہے اور غیر کے معنی زیادہ وسیع ہیں اور بھی کئی شعر غالبؔ کے حزیںؔ کے شعروں سے لڑ گئے ہیں۔'' (ایضاً-ص:۶۲)

غزلیاتِ حزیںؔ کی خصوصیات میں سوز و گداز بھی ہے۔ وحشتؔ کے الفاظ میں:

''شیخ کی غزلوں میں زیادہ تر سوز و گداز ہوتا ہے اور اس قسم کا زورِ کلام جیسا کہ ظہوریؔ، عرفیؔ، طالبؔ اور غالبؔ کے ہاں کثرت سے ہے۔ کم نظر آتا ہے مگر پھر بھی مثالیں دکھائی دیتی ہیں اور خود شیخ کا سوز و گداز ہی ایک قسم کا زورِ کلام میں پیدا کر دیتا ہے۔'' (ایضاً-ص:۷۷)

حزیںؔ کے ایک شعر پر وحشتؔ کا بے لاگ تبصرہ دیکھیے:

''زہرِ غم ہجر تو بجان کار گر افتاد

امید وصالِ تو بعمر د گر افتاد

شیخ کا یہ مطلع زور میں برجستگی میں، درد میں، حسنِ بیان میں، جس میں کہیے بے مثال ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ ایسا مطلع پھر اس زمین میں نکال سکے۔ اس شعر کی خوبی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ فغانیِ ہند ملک الشعرا میرؔ تقی نے اس کو قابلِ تضمین سمجھا۔'' (ایضاً-ص:۷۸)

وحشتؔ نے نہ صرف حزیںؔ کے کلام کا انتخاب پیش کیا اور نہ صرف اس پر تبصرہ کیا بلکہ شعر سے متعلق ہمیں اپنے نظریات سے بھی آگاہ کیا۔ معنی آفرینی کی اہمیت/ افادیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''جب تک معنی آفرینی کی کوشش نہ ہو شاعری عبث ہے اور جب معنی میں لطافت و نزاکت نہ ہو تو شعر نہیں ہے۔ بہت کم شعرا اس بات کا خیال رکھتے ہیں اور یہ بات بھی ایسی ہے کہ کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کے لیے نہایت نازک طبیعت درکار ہے۔'' (ایضاً-ص:۸۲)

سہل ممتنع کی تعریف وحشتؔ کے الفاظ میں:

''شعر کو سہل ممتنع کہتے ہیں۔ جب وہ سادہ اور بامزہ ہو، بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت آسانی سے کہا گیا ہے۔ مگر اصل میں ایسا نہیں ہے۔ سوائے

استاد قادر الکلام کے کوئی کہہ نہیں سکتا۔ سعدیؔ شیرازی، ہلالیؔ استرآبادی اور مولانا وحشی کرمانی سہل ممتنع کے لیے مشہور ہیں۔ حافظؔ کے کلام میں سہل ممتنع کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔'' (ایضاً-ص:۸۹)

وحشتؔ شعر کی قبولیتِ عام کی وجہ فقط ایک جملے میں بیان کرتے ہیں:

''شعر میں جب گرمی نہ ہو دل میں جگہ نہیں کرتے۔'' (ایضاً-ص:۱۰۲)

صائبؔ فارسی کا معروف شاعر ہے جس کے کلام پر وحشتؔ کی رائے تکنیکی درجہ بندی یا تفہیم کے غالب پہلو پر توجہ دلاتی ہے:

''صائبؔ کا کلام عموماً اس قسم کا ہوتا ہے کہ پہلے مصرعہ میں ایک بات کہی جاتی ہے اور دوسرے میں مثال سے اس کی تائید کی جاتی ہے۔ یعنی ایک طرف دعویٰ اور دوسری طرف دلیل۔'' (ایضاً-ص:۱۰۲)

ہمارے ہاں اکثر، شعرا کی ناقدری ہوتی آئی ہے۔ ان کی زندگی میں انھیں کوئی قابلِ فخر انعام سے نہیں نوازا جاتا، لیکن جب ان کی موت ہو جاتی ہے تو ہر طرف سے لوگ عقیدت کے پھول لے کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان پر جلسے ہوتے ہیں۔ سمینار منعقد کیے جاتے ہیں اور طرح طرح سے انھیں یاد کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ جب شاعر مستند ہے تو اس کی زندگی ہی میں اس کے کلام کی پذیرائی ہونی چاہیے۔ جب ایسا نہیں ہوتا تو شاعر عموماً زمانے کی شکایت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اپنی تعریف خود کرنے لگتا ہے۔ اسی پہلو کو وحشتؔ نے پیش کیا ہے:

''شعرا کی خود بینی اور خودستائی ایک رسم قدیم ہے .... اہلِ کمال جب دیکھتے ہیں کہ ان کے کمال کی قدر نہیں ہوتی تو وہ زمانے کی شکایت کرتے ہیں اور مجبوراً اپنے کلام کی آپ داد دیتے ہیں۔ اہلِ موسیقی کا بھی یہی حال ہے۔ داد کے طالب رہتے ہیں اور کیوں نہ ہوں۔ کس قدر خونِ جگر پینا ہوتا ہے۔ جب کہیں ایک مصرعہ رنگین ہاتھ لگتا ہے یا ایک ترنم دلگداز زبان پر پیدا ہوتا ہے۔ مستمع اگر قدر نہ کرے تو ستم ہے۔'' (ایضاً-ص ص:۱۰۸-۱۰۹)

وحشتؔ کے مقالے 'شیخ علی حزیںؔ' کے مطالعے سے حزیںؔ کی شخصیت سے ہمدردی اور ان کے کلام سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ وحشتؔ کا اندازِ بیان اتنا دلچسپ ہے کہ مقالے کی طوالت کے باوجود بوجھل معلوم نہیں ہوتا۔ حزیںؔ کو غزل اور رباعی سے خاص نسبت تھی۔ اسی لیے وحشتؔ نے حزیںؔ کی صرف غزلوں اور رباعیات سے انتخاب پیش کیا۔ ان کے انتخاب کردہ کلامِ حزیںؔ میں ۲۸۹ منتخب اشعار، ۹ غزلیں اور ۱۲ رباعیاں شامل ہیں۔

'غنیمتؔ از خاکیانِ ہند غنیمت است' یہ فقرہ محمد افضل سرخوش صاحب 'کلمات الشعرا' کا اتنا مقبول ہوا کہ ہر تذکرہ نویس نے مولانا غنیمتؔ کا ذکر کرتے ہوئے ضرور دہرایا۔ مولانا غنیمتؔ فارسی گو شعرا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وحشتؔ نے ان پر ساڑھے چودہ صفحات پر مشتمل اثر انگیز مقالہ قلم بند کیا، جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں نہ صرف غنیمتؔ کی حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، بلکہ کلام پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے، اور کلام کا انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے۔ غنیمتؔ (بطور خاص) اپنی مثنوی 'نیرنگِ عشق' کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی مثنوی سے وحشتؔ نے سو (۱۰۰) اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ ان شعروں میں لطافت بھی ہے اور معنی آفرینی بھی۔ نام ہی سے ظاہر ہے کہ مثنوی کا موضوع عشق ہے۔ عاشق کا نام عزیز اور معشوق کا نام شاہد ہے۔ مثنوی کا اسلوب دل پذیر ہے۔ وحشتؔ کی زبانی سنیے:

> ''ان کی مثنوی نیرنگ عشق ہے جس میں انھوں نے قصہ دو عاشق و معشوق کا لکھا ہے۔ معشوق آخر میں بے وفائی کر کے عاشق سے جدا ہو جاتا ہے اور عاشق عشقِ مجازی کی حد سے گزر کر عشقِ حقیقی کے دریا میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ مثنوی ہندوستان میں نہایت مقبول ہوئی اس کے بعض اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ عشق کا مضمون اس مضمون میں ایک بڑے دردانگیز اسلوب کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک استادانہ شان بھی لیے ہوئے ہے۔ بعض بعض ابیات واقعی نہایت بلند پایہ ہیں۔ بندشیں عموماً اچھی ہوتی ہیں اور رعایتِ لفظی و معنوی کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔'' (ایضاً-ص:۱۳۸)

غنیمتؔ کے دیوان کے مطالعے کے بعد وحشتؔ اس نکتے پر پہنچتے ہیں:

> ''دیوانِ غنیمتؔ بھی قابلِ سیر ہے لیکن اس میں مثنوی کی بات کہاں۔ اشعار عموماً بے مزہ ہیں اس لیے کہ رنگینیِ الفاظ کی طرف مولانا کی توجہ بیشتر مائل رہی۔ طرزِ بیدلؔ میں فروغ پانا آسان نہیں۔ پھر بھی مولانا غنیمتؔ غنیمت ہیں۔''
>
> (ایضاً-ص:۱۴۶)

'تغزل میں اصلاح کی ضرورت'، وحشتؔ کا مختصر مگر اہم مضمون ہے جو ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔ غزل بلاشبہ اردو شاعری کی آبرو ہے۔ شروع ہی سے شعرا نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ولیؔ سے لے کر آج تک غزل کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ واقعی یہ کافر صنفِ سخن ہے۔ اس کی بنیاد عربی قصائد کی تشبیب پر ہے۔ عربی سے یہ فارسی میں آئی اور فارسی سے اردو میں۔ فارسی میں سعدیؔ نے غزل گوئی میں بڑی شہرت پیدا کی اور حافظؔ نے تو اسے معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔ وحشتؔ لکھتے ہیں:

> ''ایران میں سب سے پہلے سعدیؔ نے غزل گوئی میں شہرت پیدا کی۔ ان کا تغزل اس قدر مرغوب طبائع ہوا کہ ان کا دیوانِ غزلیات ''نمکدانِ شعراء'' کہلانے لگا۔ خواجہ حافظؔ نے غزل کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ اور رفتہ رفتہ تغزل کی طرف شعرا متوجہ ہوگئے۔ فغانیؔ، وحشیؔ، محتشمؔ، نظیریؔ، عرفیؔ، طالبؔ، اسیرؔ، کلیمؔ، حزیںؔ وغیرہ ہم نے غزل میں وہ سحر بیانیاں کیں کہ ہند و عجم محوِ حیرت رہ گئے۔''
>
> (ایضاً-ص:۱۵۳)

غزل کی مقبولیت دن بدن بڑھتی گئی۔ اردو میں سب سے پہلے ولیؔ نے غزل گوئی میں جرأت مندی سے کام لیا اور اپنی سادہ مگر شگفتہ زبان سے تغزل میں وہ کمال دکھایا کہ خود بخود لوگ فارسی گوئی سے اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میرؔ نے تو غزل کو وہ زبان دی کہ آج بھی اس کی تازگی برقرار ہے، اور ترجمانِ دل معلوم ہوتی ہے۔ میرؔ کی غزلیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان کے اشعار براہِ راست دل پر اثر کرتے ہیں۔ غرض انھوں نے اپنی نازک طبیعت سے غزل کی نزاکت

میں چار چاند لگا دیے۔ بقول وحشتؔ:

"ریختہ کے موجد ولیؔ نے غزل ہی میں نام پیدا کیا اور میرؔ نے تو اس صنف میں طبیعت کے وہ جوہر دکھائے کہ اس کی متاعِ سخن کا ہر کوئی خریدار ہو گیا۔"

(ایضاً-ص ص:۱۵۳-۱۵۴)

ایک وقت وہ بھی آیا جب لوگ غزل کی فرسودگی سے بیزار ہوئے۔ ضرورت ہوئی کہ غزل میں جدت پیدا کی جائے اور اس کا دامن ہر طرح کے خیالات سے وسیع کیا جائے۔ سب سے پہلے خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے 'مقدمہ شعر و شاعری' لکھ کر تغزل میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیا اور اصلاحی تجویزیں پیش کیں:

"سب سے پہلے جس نے موجودہ غزل کی خرابیوں کی طرف لوگوں کی توجہ کو پھیرا وہ مولانا حالیؔ ہیں۔ اور خود ان کی زبردست مثال نے قدیم طرزِ غزل کے مشتاقوں کو نئی روشنی کی جھلک دکھا کر اپنا گرویدہ کر لیا۔ مولانا نے مسدّس اور قومی نظمیں ایسی دلپذیر لکھیں کہ ان کے حلاوت نے غزل کی چاشنی کو پھیکا کر دیا۔ لیکن مولانا کے متبعین اتباع کا حق ادا نہ کر سکے ایک ایسی نظم نگاری کی بنیاد پڑ گئی جس نے شاعری کی رہی سہی آبرو کو خاک میں ملا دیا نہ انھیں طریقہ نظم لکھنے کا آیا نہ غزل ہی کی راہ پر قائم رہ سکے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے"

(ایضاً-ص:۱۵۴)

تغزل میں نیچرل شاعری پر وحشتؔ کی تنقیدی رائے دیکھیے:

"اب عام طور پر لوگوں کی توجہ ایک قسم کی ہرزہ سرائی کی جانب مائل ہو رہی ہے جسے "نیچرل شاعری" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ غزل میں اگر فطری جذبات ادا کیے جائیں تو نیچرل کیوں نہ کہلائے۔ کیا نیچرل شاعری کے یہی معنی ہیں کہ درخت اور پہاڑوں کی مصنوعی اور مقلدانہ تعریف کی جائے؟

شاعری نیچرل وہی ہے جس کی بنیاد حقیقت پر ہو۔ سعدیؔ و حافظؔ، نظیریؔ و عرفیؔ۔ میرؔ و غالبؔ کے کلام میں سینکڑوں اشعار ایسے ملیں گے جو بالکل نیچر کی تصویر ہیں اور زبان زد خلائق ہیں۔ برخلاف اس کے وہ نظمیں جن سے آئے دن رسالوں اور اخبارات کے صفحے سیاہ کیے جاتے ہیں۔ نہ تو عام طور پر نیچرل ہوتی ہیں اور نہ بسبب اپنی طوالت کے لوگوں کو یاد رہ سکتی ہیں۔" (ایضاً-ص ص:۱۵۴-۱۵۵)

وحشتؔ حالی کی اصلاحی فکر اور نیچر/حقیقت کی تعریف سے متاثر ہیں۔ شبلی نے نیچر کی عکاسی کے لیے محاکات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ وحشتؔ کا تعلق اس مکتبۂ فکر سے ہے جو سرسید یا علی گڑھ تحریک کا ترجمان ہے۔ اسی روشنی میں انھوں نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شاعری نیچرل وہی ہے جس کی بنیاد حقیقت پر ہو، یعنی جذبات کی ادائیگی نہایت فطری صورت میں ہو۔ مولانا محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ نے جس نظم نگاری کی تحریک کی بنیاد ڈالی، اس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے، مگر کچھ لوگوں نے درخت، موسم، پہاڑ اور دریا ہی کی منظر کشی کو نیچرل شاعری تصور کر لیا جس سے شاعری میں جذبات کی عکاسی اور تنوع میں کمی آئی۔ وحشتؔ کو اس کا شدید احساس تھا۔ وہ شاعری میں جدتِ مضامین اور شستگیِ الفاظ کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں:

"جہاں تک ممکن ہو سکے جدتِ مضامین اور شستگیِ الفاظ کا خیال رکھیں اور پیش پا افتادہ خیالات کے نظم کرنے سے پرہیز کریں۔ مقلدانہ طور پر تشبیہات سے محترز رہنا ضرور ہے۔ دلی جذبات اور حقائق کا اظہار کرنا چاہیے۔"

(ایضاً-ص:۱۵۵)

وحشتؔ تغزل میں اصلاحی تجاویز پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"غزل میں اختصار کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ تیرہ چودہ شعر کافی ہوتے ہیں۔ سترہ سے تو ہرگز متجاوز نہ ہونا چاہیے۔ ایک غزل میں چار پانچ اچھے شعر نکلتے ہیں۔ باقی زیادہ تر حشو و زوائد سے پر ہوتے ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ طولانی غزل سے صفحے پر کیے جائیں۔ جن کے پڑھنے کو لوگ دردِ سر سمجھیں۔"

(ایضاً-ص:۱۵۵)

''ایک اور بات جو غزل کی شان کو بڑھا دیتی ہے وہ اس کی زمین کا انتخاب ہے۔ پامال زمینوں میں خامہ فرسائی عبث ہے۔'' (ایضاً-ص:۱۵۶)

'اردو کا تعلق بنگالہ سے' وحشت کا پانچواں مضمون ہے جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ گیارہ صفحات پر مشتمل وحشت کا یہ مضمون تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ بنگال میں اردو ادب کی تاریخ پر انھوں نے مختصراً تبصرہ کیا ہے۔ بنگال میں اردو شاعری کے مراکز اور نمائندہ شعرا پر انھوں نے وقیع خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قاضی محمد صادق اختر بنگال کا وہ کلاسکی شاعر ہے جسے بادشاہِ اودھ غازی الدین حیدر نے ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا تھا۔ مزید وحشت کی زبانی سنیے:

''ہگلی میں قاضی محمد صادق اختر اردو کا وہ باکمال شاعر پیدا ہوا کہ آج تک فضائے بنگالہ اس کے ذکر سے گونج رہی ہے۔ اس نے اردو شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ یہ وہی بنگالی شاعر ہے جسے اس کے ہم عصر لکھنوی شعرا نے ''شاعرِ بے بدل مانا ہے'' اور جسے غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ملک الشعرا کا خطاب دے کر اپنی قدر دانی اور بے تعصبی کا نمونہ سارے ہندوستان کے لیے چھوڑا۔'' (ایضاً-ص ص:۱۶۲-۱۶۳)

۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کا زمانہ بالکل خاموش گزرا۔ اس کے درمیان وحشت نے غالباً کوئی مضمون تحریر نہیں کیا۔ ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد انھوں نے جتنے بھی مضامین لکھے سوائے چند کے ان کا تعلق بنگال سے ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں جس بنگالے کا ذکر کیا ہے وہ غیر منقسم بنگالہ تھا اور جس میں ڈھاکہ، مرشد آباد، چٹاگانگ، فرید پور، مدنا پور، ہگلی، کلکتہ سبھی شامل تھے۔ انھوں نے اپنے گراں قدر مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی میں اردو کے دوسرے مراکز کے مقابلے میں بنگال کبھی پیچھے نہیں رہا۔ بنگال میں ہندو اور مسلمان سب نے مل کر اس زبان کی ترقی میں حصہ لیا۔ دونوں قوموں نے اپنے خون اور پسینے سے اس کی آبیاری کی۔ دونوں نے مل کر بنگال میں اس کی شاندار عمارت کھڑی کی۔ ان کا یہ بیان ملاحظہ کیجیے، جس میں انھوں نے تاریخی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے گنگا جمنی تہذیب کی روایت پر ضیا پاشی کی ہے:

''میں دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھ ساتھ بنگالے اور ہندوستان کی کل دور بیں نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ اردو کی بنیاد میں، اردو کی تعمیر میں، اردو کے استحکام میں، اردو کی بقا میں دونوں قوموں کی محنت، دونوں قوموں کا پسینہ اور خون ایک رنگ سے جلوہ دے رہا ہے۔ اردو کی یہ عمارت دلکش ہندو اور مسلمان کی متحدہ محنت و کاوش کی یادگار ہے۔'' (ایضاً-ص:۱۶۶)

۱۹۴۰ء میں وحشت نے مقالہ 'اردو کا تعلق بنگالہ سے' لکھا۔ ٹھیک ایک سال بعد انھوں نے ایک اور مضمون 'اصلاحِ غزل' کے عنوان سے رقم کیا۔ 'جدید اردو' کے کارکنوں نے اپنے ۱۹۴۱ء کے سالنامے کے لیے ان سے مضمون طلب کیا تھا۔ غزل کی اصلاح پر انھوں نے دو مضامین لکھے — پہلا 'تغزل میں اصلاح کی ضرورت' (۱۹۱۲ء) اور دوسرا 'اصلاحِ غزل' (۱۹۴۱ء)۔ یہ دونوں مضامین ان کی متوازن ذہنیت کا پتا دیتے ہیں۔ 'اصلاحِ غزل' سے اقتباس دیکھیے:

''فرسودہ خیالات۔ اخلاق سوز اشارے اور مقلدانہ قافیہ پیمائی کب تک دلوں کو مائل کر سکتے تھے۔ انقلابات شروع ہو گئے۔ غزل کی صورت بدل گئی اور وہ مضامین جن پر غزل کا دار و مدار تھا اب مکروہ سمجھے جانے لگے۔ اور رفتہ رفتہ متروک ہو گئے۔ مگر افسوس ہے کہ اس میں نئی برائیاں پیدا ہو گئیں۔ پہلے شعرا صاف صاف کہتے تھے اگر اشعار میں کوئی حسن نہ ہوتا تھا تو وہ مہمل بھی نہ ہوتے تھے۔ اب یہ بات نہیں ہے۔ ان دنوں بہت سے اشعار ایسے سننے میں آتے ہیں۔ جن میں الفاظ کی تراکیب بظاہر دلکش اور رنگین نظر آتی ہیں لیکن شعر کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اگر ہوا بھی تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے وہ اس قابل نہ تھی کہ نظم کی جاتی۔'' (ایضاً-ص:۱۷۰)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ وحشت صرف قابلِ قبول اصلاحات کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ جدت میں توازن کے قائل ہیں۔ حد سے بڑھی ہوئی جدت پسندی کی کھل کر مذمت کرتے ہیں جس کا اندازہ ان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔

وحشت حالی کی غزل گوئی سے متاثر تھے۔ انھوں نے حالی پر مضمون بہ عنوان 'مولانا حالی کی

غزل گوئی' ۱۹۴۰ء میں لکھا۔ ۳۱ ر دسمبر ۱۹۴۴ء کو اسلامیہ کالج ہال میں زیر اہتمام انجمن ترقی اردو (بنگالہ) مولانا حالؔی کی تیسویں برسی مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں منائی گئی تھی۔ اسی موقعے پر وحشتؔ نے اپنا یہ مقالہ پڑھ کر سنایا تھا۔ انھیں حالؔی سے خاص عقیدت تھی۔ انھوں نے انگریزی میں بھی حالؔی پر مضمون لکھا، جو 'مارننگ نیوز' میں چھپا۔ اس مضمون میں انھوں نے حالؔی کے کلام کی خصوصیات سے بحث کی ہے۔ مضمون کی ابتدا میں وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا حالؔی غالبؔ کے شاگرد تھے اور استاد کی جدت پسند طبیعت نے ان پر اثر ڈالا۔ ابتدا میں دلّی کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے اور جو رنگِ محفل تھا اسی رنگ میں شعر کہتے تھے لیکن فرسودہ خیالات سے اس وقت بھی اجتناب کرتے تھے۔ جذباتِ دل کی ترجمانی نہایت موثر انداز میں فرماتے تھے۔''
>
> (ایضاً- ص:۱۷۴)

'بنگال کا ایک شاعر — سید محمود آزادؔ' وحشتؔ کا آٹھواں مضمون ہے جو ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مضمون میں انھوں نے آزادؔ کی شاعری پر خوب تبصرہ کیا ہے اور نمونے کے طور پر ۲۷ ر اشعار پیش کیے ہیں۔

'بنگالہ کا ایک شاعر — قاضی محمد صادق اخترؔ' وحشتؔ کا نواں مضمون ہے جو ۱۹۵۱ء میں طبع ہوا۔ نساخؔ، شمسؔ کلکتوی کے والد تھے اور معروف شاعر بھی۔ وہ بحیثیت تذکرہ نگار بھی مقبول ہیں۔ تذکرہ 'سخنِ شعرا' نساخؔ کا زبردست ادبی کارنامہ ہے۔ متعدد تالیفات ان سے یادگار ہیں۔ کئی دواوین بھی ان کے شائع ہوئے۔ وحشتؔ کی رائے دیکھیے:

> ''جن بزرگ ہستیوں نے اردو کی ترویج و توسیع کی کوشش بنگالہ میں کی ہے ان میں نساخؔ خاص طور پر ہماری شکر گزاری کے مستحق ہیں۔ نساخؔ مرحوم نے بڑی سرگرمی سے اردو شعر و سخن کی خدمت کی۔ شیفتہؔ، نیرؔ، مجروحؔ، حالؔی، داغؔ، امیرؔ وغیرہ ہم کے معاصر تھے...... جب ان کا پہلا دیوان 'دفترِ بے مثال' شائع ہوا تھا تو غالبؔ نے اپنے ایک مکتوب میں تحسین آمیز خیالات ظاہر کیے تھے۔''
>
> (ایضاً- ص:۱۹۱)

وحشتؔ کا مضمون 'شمسؔ کلکتوی' ۱۹۵۳ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ شمسؔ سے وحشتؔ نے کسبِ فن کیا تھا۔ نساخؔ، شمسؔ کے والد اور داغؔ دہلوی کے دوستوں میں تھے۔ شمسؔ نے داغؔ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ چونکہ داغؔ ان کے والد کے دوستوں میں تھے اس لیے وہ انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ وحشتؔ کا مقالہ شمسؔ پر کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

وحشتؔ کا ایک نہایت اہم مضمون 'غالبؔ کا انداز بیاں' ہے جو نقاد (آگرہ) جنوری ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون جمال احمد صدیقی کے مرتبہ 'مضامینِ وحشتؔ' میں شامل نہیں ہے۔ اس کی تلاش کا سہرا سید لطیف الرحمٰن کے سر بندھتا ہے۔ یہ غالبؔ کے انداز بیان پر بہترین مضمون ہے۔

'غصہ اور اس کے نتائج' وحشتؔ کی نادر/ نایاب تحریروں میں ہے۔ یہ مضمون بھی 'مضامینِ وحشتؔ' (مرتبہ: جمال احمد صدیقی) میں شامل نہیں۔ وحشتؔ کی مقالہ نگاری میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں آتا۔ یہ ماہنامہ 'شمسؔ' کلکتہ کی جلد اول، شمارہ ۳، دسمبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اگرچہ اصلاحی و طبی نوعیت کا ہے پھر بھی اس میں ادبیت موجود ہے۔

یہ صحیح ہے کہ وحشتؔ کی نثر نگاری سے عموماً لوگوں کی واقفیت کم ہے۔ اس پہلو پر تحقیق بھی کم ہوئی ہے اور مضامین بھی خال خال ہی لکھے گئے ہیں، لیکن مقالاتِ وحشتؔ کی اہمیت اس لیے بھی مسلّم ہے کہ یہ تاریخی حیثیت کے حامل ہیں اور ان سے وحشتؔ کی شخصیت کا نیا پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی میلان کا پتا چلتا ہے۔ یہ اور ہے کہ انھوں نے جن کمالات کا مظاہرہ اپنی شاعری میں کیا، نثر نگاری میں نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا میدان مضمون/تنقید نگاری نہ تھا۔ پھر بھی علمیت کے سبب ان کے مقالوں سے اہلِ علم فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ ان کے کچھ مضامین کافی طویل ہیں۔ کچھ اتنے ہی مختصر اور تشنہ بھی۔ عبارت میں دلکشی اور رنگینی ہے۔ جگہ جگہ دیگر شعرا سے موازنے نظر آتے ہیں جن سے ان کے عمیق مطالعے کا علم ہوتا ہے، اور بقول سالک لکھنوی...... ''کیا کچھ نہیں ہے ان مضامین میں!'' (بنگال میں اردو نثر کی تاریخ، آغاز تا حال، ص:۹۰) ان مضامین پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ اس زمانے میں اردو تنقید کا معیار اتنا ترقی یافتہ نہ تھا۔ اس لیے آج کی میزان پر ان مضامین کو پرکھنا مناسب نہیں۔ انھوں نے اپنے عہد اور ماحول میں

جس طرح کے مقالے لکھے وہ بہت قابل تعریف ہیں۔ مجنوں گورکھپوری رقم طراز ہیں:

> ”مولانا رضا علی وحشت معمولی شخصیت کے آدمی نہیں تھے۔ وہ عالم متبحر اور فاضلِ اجل تھے۔ اردو، فارسی اور عربی زبانوں اور ان کے ادبیات پر وہ ماہرانہ اور مبصرانہ عبور رکھتے تھے۔ انگریزی زبان پر بھی ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ اس میں تنقیدیں اپنے زمانے میں اختراعات کا درجہ رکھتی تھیں۔ یہ تنقیدیں زیادہ تر اس دور کے سب سے زیادہ مقتدر اردو جریدہ ’مخزن‘ لاہور میں شائع ہوتی رہیں۔“
>
> (غالب شخص اور شاعر، ص: ۱۰۴/ کلکتے کی ادبی داستانیں، ص: ۱۹۲)

ان کے مضامین سے متعلق آخری بات ہم یہ کہیں گے کہ ارباب ذوق کے نزدیک ان مضامین کی حیثیت کچھ بھی ہو، لیکن اتنا طے ہے کہ بغیر ان کے مطالعے کے اردو کا کوئی بھی مورخ بنگال میں اردو کی صحیح یا معتبر تاریخ نہیں پیش کر سکتا۔ ان کا مطالعہ مورخینِ اردو کے لیے ناگزیر ہے۔

○○○

مکتوب نگاری

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

وحشتؔ

خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔ یہ کہنا انتہائی مشکل ہے کہ مکتوب نگاری کا آغاز کب ہوا اور دنیا کا پہلا مکتوب نگار کون ہے۔ انسانی تہذیب نے جوں جوں ارتقائی سفر طے کیا، نئے نئے تجربات سے اس کا دامن وسیع ہوتا گیا۔ خورشید الاسلام نے مکتوب نگاری کو ایک فن کا درجہ دیا ہے۔ ہمیں بھی اس سے انکار نہیں، لیکن فن کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور مکتوب نگاری وہ فن ہے جس کا کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں۔ ہر شخص اپنے مزاج اور استعداد کے مطابق قلم اٹھاتا ہے۔ جن لوگوں کے خطوط آج ادبی شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے اندر خداداد صلاحیتیں پوشیدہ تھیں جن کی وجہ سے ان کے خطوط لازوال ہو گئے۔ انگریزی ادب میں ولیم کوپر، چارلس لیمب، کیٹس، شیلی، بائرن وغیرہ نے مکتوب نگاری میں کمال دکھایا۔ اردو ادب میں غالبؔ، شبلیؔ، حالیؔ، اقبالؔ، مہدی افادی، ابوالکلام آزاد وغیرہ نے مکتوب نگاری کی تاریخ میں مقام بنایا۔ خطوط زندگی کے اہم گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے چھوٹی چھوٹی باتوں کا علم ہوتا ہے، لیکن ان کی حیثیت کبھی کبھی بڑی بنیادی ہوتی ہے۔ خط بے لاگ اور بے تکلف اظہارِ خیال کا نام ہے۔

اردو میں مکتوب نگاری کا باضابطہ آغاز غالبؔ کے خطوط سے ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ غالبؔ سے پہلے خطوط نہیں لکھے گئے۔ غالبؔ سے پہلے خطوط ضرور لکھے گئے، لیکن ان پر فارسیت کی چھاپ تھی۔ وہ مغلق الفاظ سے بوجھل ہوا کرتے تھے۔ لمبے لمبے القاب وآداب ان کا خاصہ تھا اور وہ تکلفات سے پر ہوا کرتے تھے۔ پہلی دفعہ غالبؔ نے اس طلسم کو توڑا اور اردو مکاتیب میں سہل نگاری کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے مقفّٰی اور مسجع عبارتوں سے دامن بچایا اور نئے طرز تحریر کی بنیاد ڈالی جس کی شگفتگی اور لطافت آج بھی یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ غالبؔ نے مراسلے کو بلاشبہ مکالمہ بنا دیا۔ مکتوب نگاری شخصی فن ہے، لیکن اس سے مکتوب نگار کے حالات کے علاوہ اس

کے عہد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح یہ اجتماعی فن کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔
مدیر 'نقوش' (لاہور) محمد طفیل ایک مقبول اور دلچسپ خط کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خط کا فن ایک شخصی فن ہونے کے علاوہ شخصیتوں کا فن بھی بن جاتا ہے آسان ترین فن .... نازک ترین فن بھی ہے، اس میں فنّی نزاکتوں کی نمود کچھ اس طرح کی مشکل شے ہے جیسے کوئی شے عدم سے وجود حاصل کرتی ہے .... غرض یہ کہ خط نگاری اصلاً فن لطیف نہ بھی ہو تب بھی بسا اوقات لطیف بلکہ لطیف ترین فن ہے .... جن خطوط کی انسانی یا سوشل اپیل کامیاب ہوگی وہی خط زیادہ مقبول اور مستقل طور پر دلچسپ ہوں گے۔''

(نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر ۱۹۵۷ء، ص ص: ۱۸-۱۹)

خورشید الاسلام کہتے ہیں کہ خطوں کا معاملہ دل سے ہوتا ہے اور جہاں دو دل ایک ساتھ ملتے ہیں وہاں بے اصولی بھی اصول بن جاتی ہے۔ لغزشیں بھی حسین ہو جاتی ہیں:

''خط لکھنے کے لیے صرف قلم اور کاغذ کی ضرورت ہے تو خط لکھنے پر حرف آتا ہے اور نہ خط لکھنے والے پر، کاغذ اور قلم ہی تو نہیں اس میں خونِ جگر بھی شامل ہے۔ جہاں دل کی نسبت ہو وہاں بے اصولی بھی ایک اصول بن جاتی ہے۔ لغزشیں حسین ہو جاتی ہیں۔ لکنت میں رقص پیدا ہو جاتا ہے۔ ستارے، چاند، سورج خود بنتے، سنورتے اور غروب ہو جاتے ہیں۔''

(بحوالہ: اردو نثر کا فنی ارتقا، مرتبہ: فرمان فتح پوری - ص: ۳۹۷)

خط میں نہ موضوع کی ضرورت ہے اور نہ اصول کی۔ خط اپنی باتیں خود پیدا کرتا ہے۔ اس میں نہ ابتدا ہے نہ انتہا، نہ وسط ہے نہ تکمیل، نہ تشبیب ہے نہ دعائیہ۔ خط میں زیادہ تر باتیں بے ساختہ ہوتی ہیں اور ان کا انحصار ذہن و دل کی وقتی لہروں پر ہوتا ہے۔ ہم اکثر ان خطوط کو پڑھ کر بدمزہ ہو جاتے ہیں جن میں مقالوں کی طرح سنجیدگی کا غلبہ ہوتا ہے، جو تکلّفات سے پر ہوتے ہیں اور جن میں مکتوب نگار کا شخصی پہلو ہزار پردوں میں چھپ جاتا ہے۔ اس لیے خط میں اختصار کے ساتھ لطفِ زبان بھی ضروری ہے۔ بے تکلفی کامیاب خط کی ضامن ہے۔ خط لکھنے کا ہنر بھی ہر ایک کو بقدرِ

ظرف ہی ملتا ہے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''خطوط کا معاملہ عشق و محبت کا ہے۔ جس طور پر محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی۔ اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے لکھا نہیں جاتا۔ محبت کے دیوتا کے مانند خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔''

(بحوالہ: اردو میں ادبی نثر کی تاریخ، ڈاکٹر طیبہ خاتون - ص: ۱۰۹)

خورشید الاسلام رقم طراز ہیں:

''دنیا کے سارے خط ایک فقرے سے شروع ہوتے ہیں اور ایک فقرے پر ختم ہو جاتے ہیں وہ فقرہ بہت مختصر بھی ہے اور بے کنار بھی، ''ہم اور تم انسان ہیں'' اسی ایک فقرے میں انسانیت بھی ہے اور خط لکھنے کے اصول بھی ہیں مفہوم بھی یہی ہے ساز و سامان بھی یہی ہے اور نشانہ بھی یہی ہے۔''

(بحوالہ: اردو نثر کا فنی ارتقا، مرتبہ: فرمان فتح پوری - ص: ۳۹۸)

وحشت کے خطوط بھی اسی پس منظر میں دیکھنے ہوں گے۔ وحشت نے اپنی زندگی میں ہزاروں خطوط لکھے جس کی بڑی تعداد ضائع ہوگئی یا ابھی تک پوشیدہ ہے۔ کچھ ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں اور ایک سو بیاسی خطوط 'مکاتیب وحشت' میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ وحشت کے خطوط ان کی شخصی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ بقول مظفر حنفی:

''مکاتیبِ وحشت کا مرتبہ یقیناً بلند ہے کہ یہ ان کی زندگی، ان کے فن اور ان کی دل نواز اور پہلو دار شخصیت کے آئینہ دار ہیں اور انھیں نظر انداز کر کے وحشت کے کلام کی صحیح قدر و قیمت کا تعین کرنا ممکن نہ ہوگا۔''

('مغربی بنگال'، کلکتہ، وحشت نمبر، ۱۹۹۶ء - ص: ۵۷)

'مکاتیب وحشت' میں شامل خطوط زیادہ تر اپنے سے چھوٹوں یا شاگردوں کو لکھے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں محتاط کیفیت پائی جاتی ہے اور شاید اسی لیے وہ اپنے مکاتیب میں زیادہ بے تکلفی سے کام نہ لے سکے۔ ان کے مکاتیب کے آئینے میں ہمیں ایسا شخص نظر آتا ہے جو ستم ہائے روزگار کا مارا ہوا ہے۔ بیٹے کے پاگل پن میں گھلا جاتا ہے۔ زمانے کی ناقدری کا نشانہ بنا ہوا

ہے۔شاگردوں پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار ہے۔اردو زبان وادب کا بے لوث خادم ہے۔ اخلاق کا مجسّم نمونہ ہے۔وضع داری کا پیکر ہے۔اصول پرست ہے۔سادہ دل ہے۔خوددار ہے۔ افسردہ ہے۔ضعیفی اور بیماری کا شکار ہے۔اپنے عزیزوں کا محبوب ہے۔وطن کی محبت سے سرشار ہے۔ہجرت کی تکالیف سے آزردہ ہے۔اپنی کمزوری/ ناتوانی کا شکوہ سنج ہے۔مرض ذیابطیس سے بیزار ہے۔معاصرین کا خیر خواہ ہے۔تلامذہ کی موت پر ماتم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اکثر مشاعروں/ ادبی نشستوں کی صدارت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔شاگردوں کو اہم شعری نکات سمجھاتے ہوئے فن کے باریک مسائل پر بحث کرتا ہے۔نہ صرف شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دیتا ہے، بلکہ اچھے اشعار پر کھل کر داد بھی دیتا ہے۔سیاست پر بھی تبصرہ کرتا ہے۔تہذیب پر بھی گفتگو کرتا ہے۔کبھی اپنے دیوان کی طباعت کے سلسلے میں معلومات فراہم کرتا ہے اور کبھی اپنے نظریۂ فن کا اظہار کرتا ہے۔وہ کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑاتا اور جو شخص کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑاتا، اپنا مذاق کیوں کر اڑاتا ہے اس مکتوب کے اقتباس میں دیکھیے:

''مودت نامہ مورخہ ۸؍جنوری موصول ہوا اور کنٹرولر کلکتہ کی جگہ کنٹرولر ڈھا کہ جو میں نے لکھ دیا تھا اس سے وحشتؔ کی وحشت مسلم ہوگئی!۔''

(مکاتیب وحشتؔ-ص:۵)

جب بھی کسی شاگرد کی موت ہو جاتی، وحشتؔ چیخ اٹھتے۔انھیں گہرا رنج ہوتا۔اس لیے کہ وہ انھیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔حسرتؔ نعمانی کی موت پر کہتے ہیں:

''نعمانی کی موت نے میری افسردہ طبیعت کو اور بھی افسردہ کر دیا ہے۔دن بھر بستر پر پڑا رہتا ہوں۔'' (ایضاً-ص:۶)

قمرؔ صدیقی کی وفات پر یوں صبر کر کے رہ جاتے ہیں:

''تاب لائے ہی بن گئی غالبؔ'' صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔اگرچہ صبر مشکل ہی سے آئے گا۔

دل سے کسی طرح نہ مٹے گا قمرؔ کا داغ
باقی رہے گا میرے جگر میں جگر کا داغ''

(ایضاً-ص:۵۲)

قمرؔ صدیقی کی رحلت پر ایک جگہ اور اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''مومنؔ کے مرنے پر غالبؔ نے کہا تھا۔

کافر باشم اگر بہ مرگ مومنؔ
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

میں بھی اس موقع پر غالبؔ کے شعر کو اپنے حسبِ حال پاتا ہوں۔''

(ایضاً-ص:۱۳۳)

ایسے ہی کسی موقع پر پروفیسر بیخودؔ کو لکھتے ہیں:

''بہت افسردہ ہو کر وحشتؔ آزردہ جاں رویا

ایک بجلی سی دل پر گری ہے طاقت نہیں ہے کہ کچھ لکھ سکوں۔'مورننگ نیوز' کی خبر بجنسہ روانہ کر دیتا ہوں۔خوب سر پیٹیے اور ماتم کیجیے۔

دلفگار
وحشتؔ''

(ایضاً-ص:۵)

وحشتؔ اپنے بیٹے علی حیدر کے پاگل پن کی وجہ سے اکثر اداس رہا کرتے تھے۔بیٹے کا مرض انھیں اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔وہ اسے کئی دفعہ اسپتال لے گئے۔کئی دفعہ خانقاہ لے گئے، مگر اس کی حالت بدستور خراب رہی۔وہ گھر میں توڑ پھوڑ مچاتا جس سے سب پریشان رہتے۔وحشتؔ نے اپنے مکتوب بنام ظفرؔ ہاشمی میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے:

''میں افکار گونا گوں میں گرفتار ہوں۔لڑکا میرا علی حیدر جس سے آپ واقف ہیں، پاگل خانے میں ہے۔ابتدائے فروری سے اس کی حالت بگڑنی شروع ہو

ئی اور عید کے دن رانچی سے جہاں یہ پاگل خانہ ہے، خط آیا کہ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ میں اسی شب کو رانچی روانہ ہوگیا اور پہنچ کر دیکھا کہ بالکل ہوش کھو بیٹھا ہے، مجھے پہچانا بھی نہیں۔ اس کے ناقابلِ علاج مرض نے دل کو مایوس کر رکھا ہے۔ یہ صدمہ تو ہے ہی، مزید بریں مالی دقتوں کا بھی سامنا ہے اور یہ دقت عموماً بہت حوصلہ فرسا ہوا کرتی ہے۔ اس پر کاموں کی وہ کثرت ہے کہ اللہ تیری پناہ کالج اور امتحانات کے علاوہ خطوں کے جواب، غزلوں کی اصلاح، احباب کے مراسم ان سب کے لیے وقت نکالنا خصوصاً جب دل ٹھکانے نہ ہو، اس قدر مشکل ہے کہ میں ہی جانتا ہوں۔‘‘ (ایضاً-ص:۷۶)

خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کس قدر پریشان حال تھے۔ ایک تو بیٹے کا پاگل پن، اس پر مالی تنگی۔ کاموں کی کثرت، کالج اور امتحانات کے پرچوں کی جانچ، خطوط کے جواب، شاگردوں کی غزلوں کی اصلاح اور احباب کے لیے وقت نکالنا، ان کے لیے کتنا مشکل تھا اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ علی حیدر سے متعلق ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیے:

’’عزیزی علی حیدر کا حال ہسپتال میں روز بروز خراب ہوتا گیا۔ ۱۳ر مئی کو کلکتے لایا گیا لیکن بقول شاعر:

دو گونہ رنج و عذابست جان مجنوں را
بلائے فرقت لیلیٰ و صحبت لیلیٰ

پہلے جدائی سے دل کڑھتا تھا اب اس کا حال دیکھ کر دل اداس ہے۔ دن بھر ایک ہنگامہ مچا رہتا ہے کسی کو ذرا چین نہیں۔‘‘ (ایضاً-ص:۷۹)

وحشتؔ کے تلامذہ کی کثیر تعداد تھی۔ ان سے غیر مقامی تلامذہ بذریعہ خط اصلاح لیا کرتے تھے۔ وہ بڑی شفقت سے ان کی غزلیں بنایا کرتے تھے اور فن کے رموز و نکات بھی بتایا کرتے تھے۔ اگر غزل اچھی ہوتی تو تعریف کیا کرتے، اور کوئی نقص نکلتا تو درست کردیا کرتے تھے۔ ظفرؔ ہاشمی ان کے غیر مقامی شاگردوں میں تھے۔ وحشتؔ انھیں لکھتے ہیں:

’’افسوس ہے کہ آپ نے ایک شخص کو اپنا استاد بنایا جس کا دلِ افسردہ آپ کے جوشِ طبیعت کی قدر کافی طور پر نہیں کرسکتا۔‘‘ (ایضاً-ص:۶۷)

شوقؔ سندیلوی کو لفظی ترکیب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’میدانِ محشر میں جو آپ کو شک ہے۔ وہ بجا ہے کیوں کہ محشر اسم ظرف ہے یعنی وہ جگہ جہاں حشر ہو۔ لہٰذا میدان کا لفظ زیادہ ہے۔ میدانِ حشر صحیح ہے۔‘‘
(ایضاً-ص:۷۳)

قمرؔ صدیقی کے نام ایک خط میں شکستِ ناروا اور ایطا کے بارے میں رقم طراز ہیں:

’’شکستِ ناروا کے متعلق آپ نے جو خیال ظاہر کیا ہے اس سے میں بالکل متفق ہوں۔ اگر اس شکستِ ناروا کا خیال رکھا جائے تو شعر کہنا ہی مشکل ہو جائے۔ ایطا سے میں خود بچتا ہوں کیوں کہ پرانے اسکول کا ہوں لیکن اوروں پر جو اس کی پروا نہیں کرتے معترض نہیں ہوتا۔‘‘ (ایضاً-ص:۱۳۱)

اپنے شاگرد امیر الاسلام شرقیؔ کی غزل کی تعریف یوں کرتے ہیں:

’’غزل آپ کی تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے اور خوب ہے۔‘‘
(ایضاً-ص:۷۰)

اپنے عزیز ترین شاگرد شاکرؔ کلکتوی کی غزل کی توصیف اس طرح کرتے ہیں:

’’جزاک اللہ بے مثل غزل کہی ہے۔ پوری کی پوری غزل روحِ تغزل ہے۔‘‘
(ایضاً-ص:۴۸)

شاکرؔ صاحب کو ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

’’آپ کے کلام سے بوئے آشنا آتی ہے اور میں مست ہو جاتا ہوں۔‘‘
(ایضاً-ص:۴۹)

مکاتیب کے تعلق سے یہ بات بہت مشہور ہے کہ خطوں کو نجی ہونا چاہیے۔ نجی باتوں میں رنگا رنگی، دلچسپی، تنوع اور عمومیت پیدا کرنا اچھے مکتوب نگار کا کام ہے۔ اس بیان کی روشنی میں اگر ہم

وحشت کے مکاتیب کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ ان کے سارے خطوط (سوائے چند کے) بالکل نجی ہیں، مگر وہ ان میں رنگارنگی اور زیادہ دلچسپی پیدا نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بقول ان کے وہ کوتاہ قلم واقع ہوئے تھے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اچھا مکتوب نگار اپنی باتوں کو یوں پیش کرتا ہے کہ وہ ہمیں اپنی ہی داستان معلوم ہونے لگتی ہیں تو وحشت کے خطوط اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ ان میں عمومیت غالب ہے اور ہم مکاتیبِ وحشت میں وحشت کے غم میں شریک نظر آتے ہیں۔ مکاتیب وحشت کے مطالعے کے دوران کبھی کبھی ہمیں وحشت کی کیفیات میں اپنی ہی چیزیں جھلکنے لگتی ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں عمیق جزئیات تو نہیں ملیں گی، لیکن ان میں جو کچھ ہے وہ غنیمت ہے، کیوں کہ ان کے مطالعے کے بغیر ہم وحشت کی سیرت، شخصیت اور فن پر کوئی ٹھوس فیصلہ صادر نہیں کر سکتے۔ مثلاً فنِ شاعری میں وہ کس نظریے کے حامی ہیں، اگر ہمیں یہ جاننا ہے تو ان کے مکاتیب سے رجوع کرنا ہوگا۔ ایک جگہ اپنے نظریۂ فن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ میں پرانی لکیر کا فقیر ہوں....... میں ہمیشہ امیر لکھنوی کا یہ شعر دہراتا ہوں جو میرے حسبِ حال ہے۔

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

(ایضاً-ص:۱۲۶)

پروفیسر ارشد کاکوی کو لکھتے ہیں:

''اصلاح کا لینا تو آج کل ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ میں تو پرانی لکیر کا فقیر ہوں اور قدیم طرزِ سخن کا دلدادہ ہوں۔ جدید طرزِ شعر کی غزلوں اور نظموں پر اصلاح دینے کی قابلیت اپنے میں ہرگز نہیں پاتا اور اب کہ ضعفِ پیری نے اعصاب اور دماغ کو معطل سا کر رکھا ہے۔ میں اس خدمت سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ ہرگز یہ نہ سمجھیے کہ میں ٹالتا ہوں۔ میں صدق دل سے یہ رائے دیتا ہوں کہ اگر اصلاح لینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو ڈاکٹر عندلیب شادانی سے استفادہ کیجیے۔'' (ایضاً-ص ص:۱۲۴-۱۲۵)

وحشت کے آخری دور میں ترقی پسند تحریک شباب پر تھی۔ غزلیں کم کہی جاتی تھیں۔ نظموں کا رواج زیادہ تھا۔ آزاد نظمیں بھی لکھی جارہی تھیں۔ شاعری کے نام پر خطابت کو فروغ دیا جارہا تھا۔ وحشت کو یہ چیزیں ناگوار گزرتی تھیں۔ ظفر ہاشمی کو لکھتے ہیں:

''عموماً آج کل نظموں کے لکھنے کا رواج ہے اور وہ لوگ جنھوں نے فن شعر کو باقاعدہ حاصل نہیں کیا ہے طبع آزمائی کرتے ہیں اور مہمل بکتے ہیں۔ نظمیں بے سروپا ہوتی ہیں۔ الفاظ کو معنی سے تعلق نہیں ہوتا۔'' (ایضاً-ص:۸۰)

مکاتیب وحشت کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس کے مطالعے سے وحشت کی زندگی کے کئی اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً، وہ نظریاتی طور پر سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ تو ان کے کلام میں کہیں نہیں ملے گا۔ ہاں سیاسی موضوعات پر مبنی چند اشعار (ہم انھیں سیاسی سے زیادہ ملی/قومی کہیں تو بہتر ہوگا) ان کے کلام میں ضرور مل سکتے ہیں، لیکن وضاحت زیادہ بہتر طور پر مکاتیب ہی سے ہوتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''بنگالے میں مسلم لیگ کی وزارت ہے لیگ کے دشمن سارا الزام وزارت پر لگاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ حکومتِ ہند سارا اختیار گورنر کو دے دے اور وزارت نہ رہے۔'' (ایضاً-ص:۹۹)

جگر مرادآبادی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، علامہ تمنا عمادی وغیرہ وحشت کے عزیز دوستوں میں تھے۔ اس کا علم ہمیں خطوط کے علاوہ اور کہیں سے نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں ان کے کلام میں حسرت، اقبال سیماب، نشتر اور ان کے کئی تلامذہ کا ذکر ہے۔ ایک مکتوب میں جگر مرادآبادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرتِ جگر اب تک کلکتے میں ہیں اور آپ سے ان کی ملاقات ہوجائے تو میرا سلام پہنچا دیجیے اور کہہ دیجیے کہ ان کی بتائی ہوئی دوا پر میں نے عمل شروع کر دیا ہے۔'' (ایضاً-ص:۵۹)

ایک اقتباس اور دیکھیے:

"دائرۂ ادب ڈھاکہ کا ایک مشاعرہ میری صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر شادانی
شریک تھے۔ فضلی صاحب لاہور گئے ہوئے ہیں۔ مشاعرہ بہت کامیاب ہوا۔
ڈاکٹر شادانی نے بھی یہ خیال ظاہر کیا کہ اس سے بہتر صحبت (مخصوص لوگوں کی)
اس سے پہلے ڈھاکہ میں نہیں ہوئی تھی۔ مولانا تمنا عمادی نے ایک دن علامہ کیفی
چڑیاکوٹی کی اور میری دعوت کی اور خوب خوب شعرخوانی ہوئی۔" (ایضاً-ص:۸)

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوگیا۔ ۱۹۵۰ء میں وحشت مشرقی پاکستان کی راجدھانی ڈھاکہ چلے گئے۔ وطن کے چھوٹنے کا غم انھیں مسلسل کھائے جاتا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کلکتے ہی میں گزارے۔ کلکتہ انھیں دل وجان سے عزیز تھا۔ ایک خط میں رقم طراز ہیں:

"وہ خلوص جو مجھے کلکتے کے محبّانِ عزیز میں ملتا تھا ان کا یہاں (ڈھاکہ میں)
فقدان ہے۔ تکلف کی ملاقاتیں دل کو راحت نہیں پہنچاتیں۔ کلکتہ کی بات کلکتہ
کے ساتھ رہ گئی۔" (ایضاً-ص:۱۲)

ہجرت کے بعد کے مکاتیب میں انھوں نے کثرت سے اپنی ضعیفی، آنکھوں کی کمزوری، ناتوانی ولاغری، ذیابطیس کے مرض اور دوسری بیماریوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ایک طرف پاگل بیٹے کی موت اور دوسری طرف وطن سے ہجرت کی وہ تاب نہ لاسکے۔ احباب بھی داغِ مفارقت دیتے گئے اور خود ان کی صحت بھی دن بدن جواب دیتی گئی۔ ان کی آخری عمر کی کہانی انہی کی زبانی سنیے:

"میری ناتوانی اب زوروں پر ہے۔ اعصاب اپنے کام انجام نہیں دیتے اور
دماغ بھی بے دماغی کرنے لگا ہے۔" (ایضاً-ص:۱۲۷)

"میری صحت اب اطمینان بخش نہیں ہے لیکن باعثِ تشویش بھی نہیں ہے۔
چہرے پر جھریاں نہیں ہیں لیکن پیری اپنا کام کیے جارہی ہے۔ ٹانگیں بہت کمزور
ہوگئی ہیں۔ زیادہ تر بستر پر پڑا رہتا ہوں۔" (ایضاً-ص:۱۳۰)

"میں اب مشاعروں کی شرکت کے لیے اپنے میں طاقت بالکل نہیں پاتا۔ اگر
کالج کے مشاعرے کی صدارت کے لیے نامزد نہ کیا جاؤں تو بہتر ہے۔ یہ میں

اپنے دل پر جبر کرکے لکھتا ہوں۔" (ایضاً-ص:۳۸)

"اب چند سطور بھی لکھنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ پنشن کے لیے
کلکتہ کیوں کر جاسکوں گا۔ ضعف حد سے بڑھ گیا ہے۔" (ایضاً-ص:۴۰)

"میں اب صرف زندہ ہوں۔ نقل وحرکت بدقت ہی ممکن ہے۔ رکشا تک کی
سواری بہ مشکل ہوتی ہے۔ ہوائی جہاز کے سفر کا کیا ذکر۔ اب ایک ہی سفر رہ گیا
ہے جس کے لیے زادِراہ بھی ساتھ نہیں ہے!" (ایضاً-ص:۳۰)

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں وحشت کی شکل میں ایسا انسان نظر آتا ہے جس کی حیات، خوشیوں کے ساتھ غم والم کے طویل سلسلے پر مشتمل ہے۔ ان جملوں میں وحشت نے بار بار اپنے بڑھاپے اور اپنی شدید کمزوری کا ذکر کیا ہے۔ ایک طرف انھیں کلکتے کے چھوٹنے کا غم تو تھا ہی، دوسری طرف پیری نے بھی انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ مکرر اس نوع کے جملے کہتے نظر آتے ہیں کہ 'مشکل ہی مشکل کا سامنا رہتا ہے'، 'بس زندہ ہوں'، 'دن بھر بستر پر پڑا رہتا ہوں'، 'میں اب صرف زندہ ہوں'، 'اب ایک ہی سفر رہ گیا ہے جس کے لیے زادِراہ بھی ساتھ نہیں ہے!'۔ آخری وقت میں انھیں ہر طرف سے امراض نے گھیر رکھا تھا۔ ملنا جلنا موقوف ہوا اور صرف دواؤں پر زندہ تھے۔

وحشت انتہائی شریف انسان تھے۔ ان کی شرافت کی جھلک خطوط میں بھی موجود ہے۔ مکاتیبِ وحشت میں اگر ہم غالب کی سی ظرافت تلاش کرنے لگیں تو یہ سعیِ لاحاصل ہوگی۔ وحشت نہایت مصروف انسان تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ بیٹھ کر خطوط لکھا کرتے اور ان میں الفاظ کے گل بوٹے کھلاتے۔ ظرافت سے کام لیتے اور چاشنی پیدا کرتے۔ انھوں نے تو کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ ان کے مکاتیب کبھی شائع بھی کیے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ مکاتیب نذرِ آتش کردیا کرتے تھے۔ اس لیے ہمیں ان کے ہاں غالب کی طرح ظرافت، شوخی، طنز اور لطافت نہیں ملے گی۔ تعلقات کی بے تکلفی ملے گی اور نہ ہی مزاج وفکر کی رنگارنگی۔ لیکن ان کے مکاتیب میں دردمند انسان کے مجروح دل کی پکار ضرور سنائی دے گی۔ زمانے کے ہاتھوں ستائے ہوئے انسان کے غم کی نحیف چیخ ہمیں ضرور متاثر کرے گی۔ شفیق استاد کی محبت یقیناً ظاہر

ہوگی۔ رحم دل باپ کی تکالیف ضرور دکھائی دیں گی۔ مکاتیب وحشتؔ میں ہمیں ایسا انسان ضرور نظر آئے گا، جس کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ وہ خوشامد اور چاپلوسی سے کوسوں دور ہے۔ ان خطوط میں ہمیں ایسا انسان نظر آئے گا، جو کوتاہ قلم ہے، یعنی بہت کم اور مختصر لکھتا ہے، مگر جو لکھتا ہے، سچ لکھتا ہے، کبھی کسی کو نصیحت کرتا ہے۔ کبھی اپنے تلامذہ کو فن کے رموز و نکات سمجھاتا ہے اور کبھی اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہے۔ ایسا نہیں کہ وحشتؔ کے مکاتیب بالکل سپاٹ ہیں۔ ان میں خاص لحاظ، ادبیت اور ایسی ایسی قیمتی باتیں ہیں جو ادبِ اردو کے مورخین کے لیے جواہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں ایسے تنقیدی اشارے ہیں جو تنقید کی موٹی موٹی کتابوں میں بھی نہیں ملیں گے۔

مکاتیبِ وحشتؔ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مصنف کی مکمل شخصیت نہ تصنیف و تالیف کے اندازے سے معلوم ہوتی ہے اور نہ محض موضوعی تحریروں میں شخصیت کے سارے گوشے بے نقاب ہو پاتے ہیں۔ وحشتؔ کے مکاتیب ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت معاون ہیں، کیوں کہ دیگر تصانیف کے مقابلے خط میں شخصی عناصر زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کے خطوط سے ان کے قلب و نظر، فکر و فہم یعنی ان کے ادراک کے بھی پہلو بے نقاب ہوتے ہیں۔ ان کے خطوط سے ان کے شب و روز کی سرگرمیاں اور مصروفیات ظاہر ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ خطوط غالبؔ کے طرز پر ذوقِ مکتوب نگاری کے لیے نہیں لکھے گئے، اس لیے ان میں دلچسپی کے وہ عناصر اور معیار نہیں ہیں، جو غالبؔ کے خطوط کے اوصاف ہیں، لیکن وحشتؔ کے مکاتیب کے تعلق سے اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان خطوط کے مطالعے کے بغیر ہم وحشتؔ کی حیات اور فن کا ناقدانہ جائزہ نہیں لے سکتے۔ یہ خطوط وحشتؔ شناسی میں کئی اہم بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

○○○

وحشتؔ

مشاہیر کی نظر میں

سرزمینِ ہند گونج اٹھی تری آواز سے
شعر نے وحشتؔ ترے اک شور برپا کر دیا

وحشتؔ

خواجہ الطاف حسین حالی

''دیوان وحشتؔ کے مطالعہ سے میرے دل میں بلا مبالغہ ایک عجیب کشش پیدا ہوئی۔ آپ کی طرز سخن سنجی دیکھ کر زمانہ کے انقلاب پر ایک مسرت انگیز تعجب کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ جس بزرگ پر اہل کلکتہ کی طرف سے سنین ماضیہ میں دو بار حد سے زیادہ اعتراضات کی بوچھار ہوئی تھی اور نکتہ چینی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا تھا۔ آج کلکتہ کے ارباب فضل وکمال میں سے ایک یگانہ اور برگزیدہ شخص اسی بزرگ کے تتبع پر فخر کرتا ہے۔ غالباً آپ نے اپنے سن رسیدہ ہم وطنوں سے سنا ہوگا کہ جب مرزا غالب مرحوم اپنے موروثی پنشن کے متعلق گورنمنٹ ہند میں استغاثہ کرنے کی غرض سے کلکتے گئے اس وقت اہل کلکتہ نے ان کے فارسی کلام پر اعتراض کیا تھا جس پر مرزا صاحب نے ایک مثنوی موسوم بہ بادِ مخالف لکھی تھی جو ان کی کلیات میں موجود ہے۔

پھر ایام غدر کے بعد ان کی کتاب ''قاطع برہان'' کے خلاف مولوی احمد علی متخلص بہ احمد رئیس کلکتہ نے ایک مستقل کتاب موسوم بہ ''مؤید البرہان'' نہایت درشت وتلخ لہجہ میں ترتیب دے کر شائع کی تھی مگر آپ نے مرزا کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کر کے ثابت کر دیا کہ سچائی کا مقابلہ کیسی ہی سختی کے ساتھ کیا جائے وہ آخر کار اپنا نقش لوگوں کے دلوں میں جمائے بغیر نہیں رہتی۔ مولانا اگر انصاف سے دیکھیے تو مرزا کا تتبع کرنا درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا مگر آپ نے ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا ہے۔ سچ ہے ''دوران با خبر درحضور ونزدیکان بے بصر دور۔'' تکلف برطرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے مستثنیٰ کر لیا جائے تو آپ کے اردو دیوان کو بے شائبہ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخل مبالغہ نہیں

ہو سکتا اور چونکہ ایشیا کی قدیم شاعری بظاہر چراغ سحری معلوم ہوتی ہے اور فارسی زبان ہندوستان سے آہستہ آہستہ مفقود ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ کیا اردو کیا فارسی دونوں زبانوں میں ایسے دیوانوں کے شائع ہونے کی بہت کم امید ہے۔ خدائے تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے کہ آپ ہمارے قدیم اہل کمال کی یادگار اور ان کا نام زندہ کرنے والے ہیں۔

(مکتوب بنام وحشتؔ، مشمولہ: دیوانِ وحشتؔ، ۱۹۱۰ء)

علامہ شبلی نعمانی

''آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالبؔ اور مومنؔ کی ترکیبیں اور طرزِ ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہیں۔'' (ایضاً)

شوق قدوائی

''دیوانِ وحشتؔ میں کیا اثر ہے جس کے سبب سے وہ وحشت جو مجھے غزلوں کو دیکھ کر ہوا کرتی تھی، رغبت سے بدل گئی۔'' (ایضاً)

ظہیر دہلوی

''آپ (وحشتؔ) کا کلام بلاغت نظام دیکھ کر بخدائے لایزال کسی شاعر کا کلام نظر میں نہیں جچتا۔'' (ایضاً)

علامہ اقبال

''میں ایک عرصہ سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں اور آپ کا غائبانہ مداح ہوں۔ دیوان قریباً سب کے سب پڑھا اور خوب لطف اٹھایا۔ ماشاء اللہ آپ کی طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص طور پر قابل داد ہے۔ فارسی کلام بھی آپ کی طباعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے کے دل پر چھوڑ جائے تو یہ بات آپ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔'' (ایضاً)

ظفر علی خاں

''.........مولوی رضا علی صاحب وحشتؔ کلکتی کے ان سخنوروں میں سے ہیں جن کا کلام اپنی رنگینی و رعنائی کے باعث قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ آپ کی نازک خیالی اور معنی آفرینیاں ذوقِ سلیم سے خراجِ تحسین وصول کرتی ہیں اور ملک کے سربرآوردہ اردو رسائل اپنے حصۂ نظم کو آپ کی غزلیات سے زینت دینا داخلِ فیشن سمجھتے ہیں۔''

(ماخوذ از تبصرہ، مطبوعہ: 'زمیندار' ۱۹۱۰ء، مشمولہ: دیوان وحشت ۱۹۱۰ء)

عبدالحلیم شرر

''حضرت وحشتؔ کی طبیعت شاعری کے لیے بہت مناسب واقع ہوئی ہے۔ کلام میں خاص رنگ اور خاص لطف ہے۔ پرانے مذاق کے نباہنے کے ساتھ جدید رنگ کی شوخیاں اور دلچسپیاں بھی پیدا کرنا حضرت وحشتؔ کا خاص رنگ ہے۔''

(ماخوذ از تبصرہ، مطبوعہ: 'دلگداز' ۱۹۱۰ء، مشمولہ: دیوان وحشت ۱۹۱۰ء)

مولانا حسرت موہانی

''مولوی رضا علی صاحب وحشتؔ متوطن کلکتہ زمانہ موجودہ کے ان چند برگزیدہ شعرا میں سے ہیں جن کے حسنِ کلام پر اردو شاعری کو فخر کرنا چاہیے۔'' (ماخوذ از تبصرہ، مطبوعہ: 'اردوئے معلیٰ'، بابت اپریل، ۱۹۱۰ء، مشمولہ: دیوان وحشت ۱۹۱۰ء، مشمولہ: دیوان وحشت ۱۹۱۰ء)

محشر لکھنوی

''کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنابِ وحشتؔ کو سرمایۂ شاعری من جانب اللہ عطا ہوا ہے۔ اکتسابی کوشش کا ذرا لگاؤ نہیں۔'' (مکتوب بنام وحشتؔ، مشمولہ: دیوانِ وحشتؔ، ۱۹۱۰ء)

ڈپٹی نذیر احمد (بہ زبانِ اقبال عظیم)

''یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ صاحبِ 'مراۃ العروس' نے مولانا وحشت کے بیان

میں پہلے ان کی زبان دانی پر استعجاب ظاہر کیا ہے اور پھر یہ کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا ہے کہ اس زبان دانی کا سبب ان کے اجداد کا دہلی سے تعلق ہے، حالاں کہ یہ استدلال بہت کمزور ہے۔''

(مشرقی بنگال میں اردو، ص:۱۸۲)

اثر لکھنوی

''وحشتؔ ایک بالغ نظر ماہرِ فنِ سخن تھے۔ رنگِ غالبؔ کو اتنی خوبی اور کامیابی سے برتنے والے اس دور میں ان کے سوا، اور کوئی نہ تھا مگر خود ان کا بھی ایک خاص رنگ تھا۔''

(مکتوب بنام وحشتؔ، مشمولہ: دیوانِ وحشتؔ، ۱۹۱۰ء)

نظم طباطبائی

''آپ (وحشتؔ) کے کلام کی داد نہ دینا سخن ناشناسی کی دلیل ہے۔''

(مشمولہ: نقوش و آثار، ڈھاکہ، ۱۹۵۷ء، ص:۹۶)

امداد امام اثر

''میری دانست میں بالیقین آپ (وحشتؔ) مجتہدِ فن ہیں۔ بلاشبہ آپ (وحشتؔ) کا وجود منبعِ فضل و فیض ہے۔'' (ایضاً، ص:۹۷)

منشی دیانرائن نگم

''سخن سرائی میں غالبؔ مرحوم کے پیرو ہیں اور واقعی اکثر اشعار میں غالبؔ ہی کا رنگ موجود ہے۔'' (ماخوذ از تبصرہ، مطبوعہ: 'زمانہ'، کانپور، بابت جون ۱۹۱۰ء، مشمولہ: دیوان وحشت ۱۹۱۰ء)

اکبر الہ آبادی

دیوان سے وحشتؔ کے ہے ہر طبع کو اک انس
دل کھل گئے ہیں رنگِ معانی کے چمن سے

(بحوالہ: حیات وحشت، از: وفا راشدی)

ناطق لکھنوی

وہ جوہرِ پنہاں کہ جو مستور نہیں
وحشتؔ کے سوا اوروں کا مقدور نہیں
اوصاف پہ ہے ان کے ہمیں ناز مگر
وہ اپنے کمالات پہ مغرور نہیں

(وفا راشدی، بنگال میں اردو، ص:۱۱۲)

نیاز فتح پوری

''پڑھا لکھا آدمی جب غزل میں اپنی قابلیت کے اظہار پر آجاتا ہے تو غزل کو بالکل برباد کر دیتا ہے لیکن وحشتؔ کی خوش ذوقی نے کبھی یہ نقص اپنے کلام میں پیدا ہونے نہیں دیا۔''

(ماخوذ از تبصرہ، مطبوعہ: نگار، بابت جون ۱۹۴۶ء)

عندلیب شادانی

''اس زمانے میں بھی جب اہلِ زبان کسی بیرونی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ساحرِ بنگالہ وحشتؔ اپنی زبان دانی اور سخن سنجی کا لوہا منوا چکا تھا اور اس کی شہرت حدودِ بنگال سے نکل کر بہار، یوپی کو تسخیر کرتی ہوئی لکھنؤ اور دہلی سے نکل کر لاہور پہنچی۔'' (مہر نیم روز، کراچی: وحشت نمبر، ۱۹۵۷ء)

ابواللیث صدیقی

''جب علامہ رضا علی وحشتؔ نے غزل گوئی شروع کی تھی تو دورِ جدید میں اردو غزل کے سب سے پہلے سخت گیر نقاد مولانا حالیؔ زندہ تھے اور وحشتؔ نے انھیں سے خراجِ تحسین حاصل کیا، ویسے یہ بات محض رسمی بھی ہو سکتی تھی، لیکن وحشتؔ نے اپنے کلام سے آخر دم تک خود کو اس تحسین و آفرین کا مستحق ثابت کیا جسے ادا کرنے والوں میں شبلیؔ، شررؔ، اقبالؔ، آرزوؔ، صفیؔ، حسرتؔ موہانی سب شامل ہیں۔'' (ایضاً)

ثاقب کانپوری

''حسرت موہانی مرحوم کو بجا طور پر 'اردو غزل کا مسیحا' کہا جاتا ہے مگر افسوس یہ کہ غزل کی حیاتِ نو میں جن دوسرے بزرگوں کا حصہ ہے ان کے مرتبہ اور عظمت کا خاطر خواہ اعتراف نہ کیا گیا— شاد عظیم آبادی، رضا علی وحشت اور عزیز لکھنوی انھیں مسیحا نفسوں میں سے ہیں۔''

(ایضاً)

ل-احمد اکبرآبادی

''جنابِ وحشت نے قدما کی روایاتِ شعری کو بجنسہ قائم رکھتے ہوئے موضوعاتِ غزل کو اپنے اندازِ بیان و اظہار سے سنجیدگی بخشنے کے ساتھ تغزل کی خصوصیات کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔''

(پندرہ روزہ مغربی بنگال، کلکتہ: وحشت نمبر، ۱۹۹۶ء)

آلِ احمد سرور

''وحشت استادِ فن ہیں۔ فن کے لحاظ سے وحشت کا درجہ بلند ہے۔''

(بحوالہ: دبستانِ وحشت کا تنقیدی مطالعہ، از: راز عظیم، ص: ۱۹۴)

کلیم الدین احمد

''کیفی، ناطق گلاوٹھوی، امید امیٹھوی، دل شاہجہاں پوری، آسی، تاجور، بیخود، ساحر، سیماب، وحشت، یگانہ۔ اس گروپ میں نئے اور پرانے رنگ کے شعرا داخل ہیں۔ سب مشاق ہیں اور مختلف مضامین کو صفائی، زور اور پختگی کے ساتھ نظم کر سکتے ہیں۔ انھیں کہنہ مشق اور قادرالکلام کہا جا سکتا ہے...... وحشت کلکتوی پڑھے لکھے شاعر ہیں جو اپنی غزلوں میں اپنی قابلیت سے ناجائز کام نہیں لیتے، لیکن جن کی قابلیت کی وجہ سے غزلوں میں ایک ادبی شان پیدا ہو جاتی ہے۔''

(مشمولہ: اردو غزل، ۱۹۴۰ء کے شعرا کے تناظر میں، مرتبہ: عابد رضا بیدار، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۵۵ء، ص ص: ۱۵-۱۷)

مجنوں گورکھپوری

''وحشت کلکتوی باوجود قدیم اور روایتی دبستان کے شاعر ہونے کے اپنے کلام میں ایک انفرادی لہجہ کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں فارسی کا لطیف عنصر ایک خاص چیز ہے جو غزل کے مزاج کو قائم رکھتے ہوئے شاعر کے کلام کو عام سطح سے کچھ بلند کر دیتا ہے۔...... وحشت کی شاعری کی سب سے زیادہ محسوس اور نمایاں خصوصیت جذبات کا نہایت رچا ہوا توازن اور اندازِ بیان کا عارفانہ ضبط اور سنجیدگی ہے۔''

(مشمولہ: اردو غزل، ۱۹۴۰ء کے شعرا کے تناظر میں، مرتبہ: عابد رضا بیدار، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۵۵ء، ص ص: ۴۳-۴۴)

عبادت بریلوی

''حسرت، اصغر، جگر، اثر، یگانہ اور فراق کے ہم عصروں میں جن شعرا نے جدید غزل کی طرف اپنے میلان کو ظاہر کیا ہے ان میں صفی، ثاقب، وحشت، سیماب، آغا شاعر دہلوی، علی اختر، سائل اور آرزو وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان میں سے بیشتر کا انداز قدیم ہے لیکن کہیں کہیں اس قدامت کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں جدید رنگ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔''

(غزل اور مطالعۂ غزل، ص: ۵۴۹)

سالک لکھنوی

''میرا ایمان ہے کہ وحشت پہلے ایک عظیم انسان اور پھر ایک عظیم شاعر تھا۔ وحشت کی شاعری اردو غزل میں ایک خاص مقام کی مالک ہے۔ آپ ''ترانۂ وحشت'' دیکھ جائیے آپ کو احساس ہو گا کہ قدیم و جدید تغزل کے درمیان جو ایک دیوار ہے وہ کسی نے توڑ دی ہے۔ وحشت کا جو خاص رنگ ہے وہ قدیم ہے نہ جدید۔ دل کی کیفیتیں قدیم و جدید میں تقسیم نہیں کی جا سکتیں۔ امنگوں اور آرزوؤں، کامرانی و ناکامی، امید و یاس کی عمر نہیں ہوا کرتی۔ وحشت کی شاعری انھیں کیفیات سے عبارت ہے۔''

(پندرہ روزہ مغربی بنگال، کلکتہ: وحشت نمبر، ۱۹۹۶ء)

شان الحق حقی

''حضرت وحشت اپنے عہد کے جید اساتذہ میں تھے اور اس جدید دورِ غزل کے ممتاز نمائندہ تھے جو غالب کے آہنگ نو سے متاثر تھا اور آج تک متاثر ہے۔ حضرت علامہ کا کلام دلدادگانِ ادب کے لیے سرمایۂ حیات ہے اور تعشق کے ساتھ تفکر، شستہ مقالی کے ساتھ افکارِ عالی کا ایک مرقع ہے جسے اردو کے ادبِ عالیہ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اردو کو اپنے کلام سے مالا مال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تلامذہ کی ایک کثیر تعداد کو بھی اپنی ذات سے فیض پہنچایا اور بنگال کی فضا میں اردو کا چراغ روشن رکھا جس کی روشنی اب بھی مدھم نہیں ہوئی ہے۔''

(مشمولہ: داستانِ وفا، از: وفا راشدی، ص:۲۴۲)

ہیرالال چوپڑہ

''آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یومِ وحشت کی تقریب میں، میں نے اردو کے حق میں ایک معرکہ آرا تقریر کی تھی جسے بے حد پسند کیا گیا تھا۔ نیز انگریزی کے ایک مقتدر سالنامہ میں وحشت صاحب پر ایک انگریزی مضمون لکھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا تھا۔'' (ایضا، ص:۲۴۸)

ظ-انصاری

''۲۰ ویں صدی کے نصف اول کو چار بڑی شخصیتوں کا ذہن اور فن نصیب ہوا ہے۔ رضا علی وحشتؔ، آرزوؔ لکھنوی، حکیم ناطقؔ لکھنوی اور آغا حشرؔ کاشمیری۔''

(بحوالہ: بنگال میں اردو شاعری، مرتبہ: علقمہ شبلی، مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ص ص: ۱۳۵-۱۳۶)

احتشام حسین

''میں نے بدقسمتی سے حضرت وحشت کے کلام کا زیادہ مطالعہ نہیں کیا۔ اب اگر کتابیں تلاش کروں جو بہت کم دستیاب ہیں اور لکھوں تو اس کے لیے وقت چاہیے۔ یقین کیجیے کہ میں مرحوم کی اہمیت اور عظمت کا قائل ہوں۔ اس لیے رواروی میں کچھ لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔''

(داستان وفا، ص:۲۴۹)

رئیس امروہوی

''وحشتؔ کے کلام و کمال کا اعتراف اس عہد کے تمام اہلِ کمال اور اہلِ کلام نے کیا ہے۔ حالیؔ، اقبالؔ، شبلیؔ، آزادؔ، الغرض کون ہے جو وحشتؔ سے متاثر نہ ہوا۔'' (مقدمہ، حیاتِ وحشت، ص:۱۲)

خواجہ احمد فاروقی

''وحشتؔ نے اپنی خدمات سے یہ ثابت کر دیا کہ اردو صرف دہلی اور لکھنؤ کی زبان نہیں۔ بلکہ پورا ہندوستان اس کی آغوش میں ہے اور بنگال میں بھی ایسی اردو لکھی جا سکتی ہے جس پر اہلِ دہلی و اہلِ لکھنؤ وجد کریں۔ وحشتؔ کے کمالات کا عدمِ اعتراف نہ صرف تاریخی غلطی ہے بلکہ ناسپاسی بھی ہے۔'' (وحشت کی انفرادیت، مطبوعہ: سہ ماہی روحِ ادب، کلکتہ: مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ۱۹۸۴ء)

علامہ تمنّا عمادی

''میں وہاں (کلکتہ) سے اکیسویں دن مولانا وحشتؔ، مولوی بدرالزماں بدرؔ اور ان کے احباب کے حسنِ اخلاق کا معترف اور مولانا وحشتؔ کی مشقِ سخن و مہارتِ فن کا سکّہ اپنے دل پر لیے گھر واپس آیا۔'' (مہر نیم روز، کراچی: وحشت نمبر، ۱۹۵۷ء)

سعید احمد اکبر آبادی

''شعر گوئی کے ساتھ بے ساختگی اور حسنِ ادا کے ساتھ وقار و تمکنتِ بیان حضرتِ وحشتؔ کے تغزل کی خاص خصوصیت تھی اور یہی وہ وصف تھا جس کے باعث وہ قدیم و جدید دونوں طرز کے شعرا میں مقبول ہوئے اور ہر شخص نے ان کے کمال کا لوہا مانا۔'' (ایضاً)

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

''وحشتؔ ہی بنگال کا وہ شاعر ہے جس نے مشاہیر اہلِ قلم حضرات اور اپنے معاصرین کو مجبور کیا کہ ان کے کلام کی طرف دیکھیں اور داد دیں لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کے نامور اہلِ علم و قلم

حضرات نے کلامِ وحشتؔ کے گن گائے ہیں۔" (مجلّہ یادگار وحشت، کلکتہ، مرتبہ: اسحاق راشد، ۱۹۸۱ء)

سید لطیف الرحمٰن

"وحشتؔ صاحب کی شاعری اعلیٰ پایہ کی شاعری ہے اور وحشتؔ صاحب کے بہت سارے اشعار غیر فانی ہیں۔ کیوں کہ انسان کے اندر حسن و عشق کے جذبات فطری اور دائمی ہیں۔"

(نساخؔ سے وحشتؔ تک، ص: ۱۸۹)

ابو محفوظ الکریم معصومی

"کلکتہ جو خاص طور پر اردو زبان کے شیوہ بیان اصحابِ قلم کا گہوارہ بنا اس کی فضا میں ہزار داستان طوطیوں کے نغمے اور نالے گونجتے رہے اور کئی ایک تو ایسے جوہر قابل ہوئے جن کا شمار کسی نہ کسی حیثیت سے اردو زبان کے ثوابت اور سیاروں میں ہوتا ہے۔ اردو میں صنفِ غزل کی جو اپنی الگ کائنات ہے اس کے نظامِ شمسی میں علامہ رضا علی وحشتؔ بلا شبہ اپنا قدرتی مقام رکھتے ہیں۔"

(پندرہ روزہ مغربی بنگال، کلکتہ: وحشت نمبر، ۱۹۹۶ء)

وفا راشدی

"وحشتؔ نے غزل کو نئی زندگی بخشی۔ گویا ان کی غزل کاروانِ ادب کے لیے بانگِ درا بن گئی ہے۔" (حیاتِ وحشتؔ، ص: ۷۲)

اظہر قادری

"وحشتؔ کی شاعری جدید اردو غزل میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں انھوں نے اپنی شاعری میں قدیم رنگ کو ایک نکھرے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے وہاں جدید رجحانات کو بھی اپنے اندر نہایت حسن و خوبی کے ساتھ جذب کیا ہے۔ ہمیں ان کے یہاں صحیح معنوں میں قدیم و جدید کا ایک متوازن امتزاج ملتا ہے۔" (رضا علی وحشتؔ، ص: ۱۷)

رضا مظہری

"غزلوں میں ایسے اشعار کافی ملتے ہیں جہاں جذبات کے ساتھ فکری عناصر بھی نمایاں ہیں۔ ان کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں کہیں ابتذال کی جھلک بھی نہیں ملتی۔ وہ حسن و عشق کے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی غزلوں کو لکھنوی شاعر کی کنگھی چوٹی کی شاعری بننے دیا نہ اس میں کوئی رکاکتِ فکر آنے دی۔" (مجلّہ یادگار وحشت، کلکتہ، مرتبہ: اسحاق راشد، ۱۹۸۱ء)

ابراہیم ہوش

"واقعہ یہ ہے کہ حضرت وحشتؔ جتنے بڑے شاعر تھے، اس سے بڑے انسان تھے۔ ان کی بلند اخلاقی اور اعلیٰ سیرت ان کی تمام شاعرانہ خوبیوں اور محاسن پر حاوی تھی، میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں کوئی دوسرا شاعر ان کا ہم سر نہیں تھا اور نہ شاید ہو سکتا ہے۔"

(سوغات، مرتبہ: اسد الزماں اسد، مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ۱۹۸۱ء، ص: ۲۶۳)

احسن احمد اشک

"غزل کے میدان میں میرؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے بعد وحشتؔ کی طبعِ رسا نے جو حیرت انگیز جولانیاں دکھائی ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں۔ خود ان کی زندگی میں ان کے ہم عصروں میں صفیؔ لکھنوی، شادؔ عظیم آبادی، حسرتؔ موہانی، ناطقؔ لکھنوی اور آرزوؔ لکھنوی جیسے اساتذۂ فن نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا مگر جو چیز وحشتؔ کی شاعری کو ان کے ہم عصروں کی شاعری سے ممیّز کرتی ہے وہ ان کے تحت الشعور کی فنکارانہ عکاسی ہے۔" (مہر نیم روز، کراچی: وحشت نمبر، ۱۹۵۷ء)

افسر ماہپوری

"علامہ وحشتؔ زندگی میں مشہور و قابلِ احترام تھے موت کے بعد وہ لازوال اور قابلِ پرستش ہو گئے۔ وہ ولی نہ تھے مگر ولی کی ہر صفت رکھتے تھے۔ وہ شاعر تھے مگر ان میں کوئی "شاعرانہ برائی" نہ تھی۔ وہ شاعروں میں ولی اور ولیوں میں شاعر تھے۔ محبت ان کی سرشت تھی اور نفرت سے اجتناب ان کا اصول۔" (ایضاً)

اقبال عظیم

''جن حضرات نے مولانا کو ذرا قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مولانا ہر حیثیت سے اس عہد کی یادگار ہیں جس میں کمالِ فن کی ایک پہچان کسرِ نفسی بھی سمجھی جاتی تھی۔''

(مشرقی بنگال میں اردو،ص:۱۷۴)

ڈاکٹر عبدالرؤف

''اساتذہ کے کلام سے وحشت نے جس طرح استفادہ کیا اس کی مثال اس دور میں حسرت کے سوا کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے ان کا کلام نئی پود کے لیے روشنی کا مینارہ ہے جو اسے گمراہی سے بچا سکتا ہے۔'' (پندرہ روزہ مغربی بنگال،کلکتہ:وحشت نمبر،۱۹۹۶ء)

مظفر حنفی

''وحشت کے فن پر غالب کے اثر کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے اور خود وحشت نے بھی کئی مقامات پر غالب سے اثرات قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ غالب نے طرزِ بیدل میں ریختہ کہنے کو قیامت سے تعبیر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں طرزِ غالب میں ریختہ کہنا اس سے بڑی قیامت تھی جس سے علامہ وحشت کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔'' (ایضاً)

جاوید نہال

''وحشت کے بارِ احسان سے بنگال کی اردو شاعری ہمیشہ جھکی رہے گی۔ نساخ، اسخ اور شمس نے اردو شاعری کے ننھے ننھے چراغ انیسویں صدی میں جلائے تھے۔ ان چراغوں سے روشنی لے کر وحشت نے اردو شاعری کا ایک ایسا چراغ جلایا جس کی روشنی کی لہریں دریائے ہگلی سے مل کر گنگا اور جمنا تک پھیل گئیں۔'' (متاعِ ادب،ص ص:۳۱-۳۲)

بشیر بدر

''اس دور کی غزل کی کوئی تاریخ یا تنقیدی مطالعہ سائل دہلوی، احسن مارہروی، نوح ناروی، بیخود دہلوی، ناطق لکھنوی، وحشت کلکتوی، برج موہن دتاتریہ کیفی، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، دل شاہجہاں پوری ....وغیرہ کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔'' (بیسویں صدی میں اردو غزل،ص:۱۰۷)

وہاب اشرفی

''وحشت ایک زمانے میں غالبِ ثانی کہے جاتے تھے......انگریزی اور فارسی میں غیر معمولی صلاحیت بہم پہنچائی۔ یہاں تک کے انگریزی میں مقالے لکھنے لگے۔ فارسی پر دسترس تھی، اس سلسلے میں اقبال بھی متاثر تھے۔ انھیں نیاز فتحپوری نے استادِ سخن کہا ہے۔ شوق نیموی بھی انھیں داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ یہاں تک کے انھیں دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ کی صف کا شاعر سمجھا جانے لگا، محشر لکھنوی اور صفی لکھنوی نے بھی یہی سند دی......ان کے یہاں فارسی ترکیبیں ایک خاص انداز سے ملتی ہیں۔ لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کی پیروی اور بیدل کے آہنگ کو اپنانے کی ایک صورت ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں انفرادی فکر اور اسی حوالے سے فارسی تراکیب کے استعمال کا اندازہ ہوتا ہے......بہرطور، وہی اشعار زندہ سمجھے جائیں گے جن میں وحشت کی اپنی فکر اور اپنی نظام بلاغت کی کیفیت نمایاں ہے اور ایسے اشعار واقعتاً ہیں جن کی بنیاد پر انھیں قابل لحاظ شاعر سمجھا جا سکتا ہے۔ وحشت شاعری کے اسرار ورموز سے اس حد تک واقف تھے کہ ان کے یہاں کسی شعر میں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ نک سک سے درست ان کی شاعری اچھی کلاسکی شاعری کا ایک خوبصورت نمونہ ہے جس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔''

(تاریخ ادب اردو، ابتدا سے ۲۰۰۰ء تک، جلد سوم، ص ص:۱۴۱۱-۱۴۱۴)

مظہر امام

''وحشت نے ہر چند غالب کے رنگِ سخن کا اتباع کیا اور غالب کے رنگ میں کہنے والوں

میں سب سے ممتاز قرار دیے گئے، لیکن وہ غالبؔ کے مقلّد کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے کلام کے انفرادی رنگ و آہنگ کے باعث درجۂ اعتبار تک پہنچے۔ ان کے اشعار خیالات کی گہرائی اور گیرائی، الفاظ کے دلنشیں در و بست اور تراکیب کی خوش ادائی کے باعث فوراً اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔''

(بنگال میں اردو شاعری، مرتبہ: علقمہ شبلی، مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ص:۲۱۲)

اثر صدیقی

''جن لوگوں نے داغؔ اور امیرؔ کی پیروی اختیار کی بہت حد تک ان کے کلام میں رکاکت پیدا ہو چلی تھی۔ ایسے وقت میں سلامت روی کی چال چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ اِدھر حسرتؔ موہانی اور اُدھر وحشتؔ کلکتوی ایسی راہ پر گامزن ہوئے جس نے غزل کی آبرو رکھ لی۔''

(سوغات، مرتبہ: اسد الزماں اسد، مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ۱۹۸۱ء، ص:۲۶۹)

اعزاز افضل

''غالب کے فن نے کلام وحشت کے قالب میں دوسرا جنم لیا تو اس میں ہنسی کی کون سی بات ہوئی؟ اردو کی شعری دنیا میں آواگون کا عمل تو صدیوں سے جاری ہے۔ میر، مصحفی کے قالب میں، سودا ذوق کے قالب میں، بیدل غالب کے قالب میں پہلے ہی جنم لے چکے تھے۔ انیس کو چکبست کے قالب میں حلول کرتے کسی نے نہیں دیکھا؟ داغ کے اوتار تو گلی گلی دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ بعض پاک روحیں یہ دعویٰ بھی کرتی ہیں کہ

هفت صد هفتاد قالب دیده ایم

ادب میں تقلید جرم ہے تو اس کے مجرم دہلی اور لکھنؤ میں بھی دندناتے پھرتے ہیں۔ کلکتے والے وحشت تنہا کالا پانی کیوں کاٹیں؟ عدالت نقد سب کو انڈمان کیوں نہیں بھیج دیتی؟ سورج سے مستعار ہے تو ہوا کرے، چاند کی روشنی بھی اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے۔ چاندنی کو دھوپ کون کہے گا؟ تقلیدِ غالبؔ کے باوجود کلامِ وحشتؔ کی ایک تاریخی حیثیت ہے اور رہے گی۔ سورج اپنا خراج وصول کر چکا۔ اب چاند کا قرض ہم کو چکانا ہے۔ سود نہ سہی، اصل ہی سہی۔''

(خدو خال، ص:۱۴)

علقمہ شبلی

''وحشت صاحب کی عظمت صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ایک اہم اور برگزیدہ شاعر تھے بلکہ بڑی بات یہ ہے کہ اپنی جگہ پر وہ ایک دبستان تھے، جہاں دل و دماغ کی آب یاری کی جاتی تھی۔ ایک انجمن تھے، جہاں ذہنوں کی تربیت ہوتی تھی۔ ان کے اثرِ ترتیب اور فیض صحبت سے ایک ایسی نسل تیار ہوئی جس نے نہ صرف بنگال میں بلکہ بنگال کے باہر بھی شعر و ادب کے گل بوٹے کھلائے اور علم و فن کی وہ شمع روشن کی جس کی لو آج بھی بڑھتی جا رہی ہے اور جس کی روشنی میں کاروانِ ادب رواں دواں ہے۔''

(حرف حرف تلاش، ص۔۳۰)

انور سدید

''یگانہ چنگیزی نے بظاہر بطلانِ غالب کیا ہے لیکن میری نظر میں یہ بھی اعتراف غالب کا ہی ایک زاویہ ہے جو نفی سے اثبات کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس وحشت کلکتوی نے تو غالب کے سامنے جیسے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اسے پنا استاد معنوی تسلیم کر کے اسلوب غالب میں شاعری کرنے کی کوشش کی اور اس میں اتنا درجہ کمال حاصل کیا کہ مولانا الطاف حسین حالی جیسے شاعر نقاد نے بھی اعتراف کیا..... تقلید غالب کو ہمارے عہد تک ایک رجحان خاص کی حیثیت حاصل رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کا ایک مخصوص اسلوب ہے جو لفظ بھی اس کی ٹکسال سے نکلتا ہے اس پر غالب کی ذاتی مہر لگی ہوتی ہے۔ چنانچہ دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ غالب نے وسیع پیمانے پر اعلی درجے کی ترکیب سازی کر کے مستقبل کے بہت سے شاعروں کا کام آسان کر دیا اور فیض، احمد ندیم قاسمی، اور گوہر ہوشیار پوری تک نے غالب سے استفادہ کیا لیکن اس کا اعتراف اس برملا انداز میں نہیں کیا جیسے وحشت نے کیا ہے۔ چنانچہ وحشت غالب کے مثبت اعتراف کا زاویہ ہی نہیں بلکہ یہ غالب کے انداز میں تخلیق شعر کا ایک نقش بھی ہے۔''

(بحوالہ: میرے بزرگ میرے ہمعصر، از: وفا راشدی، ص:۲۷۹)

لطف الرحمٰن

''بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں وحشت نے بنگال سے اور اقبال نے پنجاب سے ایک ایسی صدا بلند کی جس نے اہلِ لکھنؤ کو مزید چونکایا۔.......جس طرح شاد عظیم آبادی نے اہلِ لکھنؤ کو میرؔ اور دردؔ کی طرف متوجہ کیا تھا اسی طرح وحشت نے، لوگوں میں تتبع غالب کا رجحان پیدا کیا۔ بنگال سے اٹھنے والی یہ پہلی ترقی پسندانہ آواز تھی جس نے پوری اردو شاعری کو اپنی طرف راغب کیا۔......غالب کی تقلید تو یگانؔہ نے بھی کی ہے اور بڑی کامیاب تقلید کی ہے۔ گرچہ انھوں نے بتدریج شادؔ اور غالبؔ کے رنگ سخن کے امتزاج سے ایک الگ رنگ کلام پیدا کرلیا تھا لیکن وحشتؔ نے غالب اور میر کی روایت کو نظیری و عرفی کے اندازِ سخن سے مختلط و منضبط کرکے ایک منفرد و باوقار اور متین اندازِ سخن کی تشکیل کی جو ان کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز منصب پر فائز کرتا ہے۔''

(بنگال میں اردو شاعری، مرتبہ: علقمہ شبلی، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ، ص ص: ۱۶۹۔۱۷۰)

کلیم سہسرامی

''وحشت صاحب کی شاعری کی قدر و قیمت اور نوعیت و اہمیت ان کے اسلوب اور طرزِ ادا کی بنا پر ہے۔ ان کے خیال کی پختگی، اندازِ بیان، شیفتگی اور کلام میں فنی محاسن کی عظمت قابلِ توجہ ہے۔''

(مآثرِ بنگال، ص۔۸۱)

راز عظیم

''اپنی انفرادیت کے ساتھ خان بہادر علامہ رضا علی وحشتؔ اس دنیا، اس کائنات کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں ہندوستان بالخصوص بنگالہ کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہے۔''

(دبستانِ وحشتؔ کا تنقیدی مطالعہ، از: راز عظیم، ص: ۲۴۰)

صادق گیاوی

''اگر ہم اردو شعرا میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، اقبالؔ، حسرتؔ اور فانیؔ جیسے شاعروں کو

بڑے شاعر تسلیم کرتے ہیں، وحشتؔ کا شمار بھی انھیں شعرا میں ہونا چاہیے، اس لیے کہ وحشتؔ نے بھی اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ انھوں نے بھی ایسے ایسے شعر کہے ہیں کہ اردو ادب میں اگر وہ شعر نہ ہوتے تو ادب کا بڑا حصہ گوہرِ گرانمایہ سے محروم رہ جاتا۔''

(بحوالہ: مجلّہ بزمِ شاکری)

یوسف تقی

''وحشت کلکتوی کی اصل شناخت کیا ہے؟ کیا ان کا خود کو 'غالب دوراں' کہنا، یا ان کے عقیدت مندوں کا 'غالب زمانہ' کہنا ہی ان کی اصل شناخت ہے؟ یا صرف 'غالب اور مومن کی ترکیبیں اور طرز ادا' کو اپنانا ہی ان کی اصل معراج ہے؟ اگر انہی صفات کو ان کی شاعری کا کل اثاثہ تصور کرلیا جائے تو ان کی اپنی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ جو شاعر صرف انہی خصوصیات کا حامل ہو، اسے شہرت دوام کیسے نصیب ہوسکتی ہے؟ ظاہر ہے، ان خصوصیات کے علاوہ ان کی اپنی انفرادیت بھی ہے اور وہی ان کی شناخت بھی۔''

('وحشت کی شناخت' مشمولہ: وحشت شناسی، مرتبہ: سید علی عرفان نقوی، ص ص: ۲۲-۲۳)

ایم۔اے۔نصر

''وحشت کا شمار ہندوستان کے قابل قدر اساتذہ میں ہوتا تھا۔ 'دیوان وحشت' اور 'ترانۂ وحشت' کا مطالعہ وحشت کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔......اہل نظر اس بات سے کماحقہٗ آگاہ ہیں کہ وحشت نے 'تتبع غالب' تک خود کو محدود نہیں کیا، بلکہ غالب کے اثر سے الگ ہوکر بھی، شاعری کی ہے۔ اور وحشت کی شاعری کا یہ حصہ، ان کے خاص انداز فکر و طرز ادا کا مظہر ہے۔ ان کے مخصوص رنگ میں ڈوبی ہوئی شاعری ہی، وحشت کو 'علامہ وحشت' بناتی ہے۔''

(وحشت شناسی، مرتبہ: سید علی عرفان نقوی، ص: ۳۶)

ابوبکر جیلانی

''وحشت کو غزل کی تہذیبی اقدار اور ثقافتی انداز سے جذباتی لگاؤ تھا۔ اسی لیے وہ غزل کے کلاسکی انداز و آداب اور فنی حسن نزاکت کو مٹتے اور تباہ و برباد ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔

وحشت اپنی غزلوں کے اشعار کے وسیلے سے افکار کے اظہار میں ’غیر ضروری تصرف شعر‘ اور ’بے جا تصرف ہائے زبان‘ کو بالکل گوارہ نہیں کرتے تھے۔‘‘ (ایضاً،ص:۴۲)

ڈاکٹر عبدالمنان

’’علامہ رضا علی وحشت کو اس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت کی تلاش اس مقام پر ہو سکتی ہے۔ وہ غزل کی شمع کو اپنے خونِ جگر سے روشن کرتے تھے اور اپنے عمیق تجربے اور مشاہدے سے زندگی عطا کی تھی جس میں ان کی فنکارانہ بصیرت اور مفکرانہ جودت شامل تھی۔‘‘

(نقد و نگاہ،ص ص:۱۵۱۔۱۵۲)

شعار اللہ خاں رام پوری

’’خان بہادر رضا علی وحشتؔ بیسویں صدی کے ان معروف شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھیں شعر و سخن کی آبرو کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کلاسکی اردو شاعری میں مہارتِ فن کی بدولت منفرد انداز پیدا کیا اور حسرتؔ موہانی کی طرح تمام عمر مشقِ سخن جاری رکھی اور غزل کے گیسو سنوارتے رہے۔‘‘

(بحوالہ: سہ ماہی روحِ ادب، ۱۹۹۲ء، مغربی بنگال اردو اکیڈمی)

ڈاکٹر فضیل احمد

’’حضرت علامہ خان بہادر رضا علی وحشتؔ کی ذات سرزمین بنگال میں غالبِ ثانی کی حیثیت رکھتی ہے...... بنگال میں اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں وحشتؔ مرحوم ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے۔‘‘ (علامہ جمیل مظہری: حیات اور نثری تخلیقات کا مطالعہ، ص ص:۶۷-۶۹)

کلیم حاذق

’’وحشت نے داخلی احساسات کو جن خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے اور لمحاتی کیفیت کے اثر سے ابلنے والے شدید جذبات کی جس طرح عکاسی کی ہے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وحشت کی آنکھیں صرف ریگ زار کی اڑتی ہوئی ریت اور بگولوں کا رقص نہیں

دیکھتیں بلکہ ان کے کان ریت کے اندر جاری آبِ رواں کی گنگناہٹ بھی سنتے ہیں۔ سطحی معنویت سے گریز کرتے ہوئے کسی ایک کیفیت کی سن گن لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی نگاہ جزئیات سے آشنا تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی بے حقیقت باتوں میں ایک لطف پیدا کر دیتے تھے۔‘‘

(سوغات، مرتبہ: اسدالزماں، مغربی بنگال اردو اکادمی، ۱۹۸۱ء، ص۔۳۱۲)

عمر غزالی

’’علامہ رضا علی وحشت ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ مگر ان کی طرح دار طبیعت نے انھیں ایک نقاد ہونے پر مجبور کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیت سے متعلق کوئی مبسوط تحریر سامنے نہیں آئی ہے۔ جب اردو دنیا، بالخصوص سرزمین بنگال نے نساخ جیسی مختلف الجہات شخصیت کو فراموش کر دیا تو پھر وحشت کلکتوی کو بھلانا کون سی بڑی بات ہے۔ تاہم بنگال میں وحشت کو یاد کیا جاتا رہا ہے اور ان کی شاعری پر وقفے وقفے سے مضامین بھی لکھے جاتے رہے ہیں لیکن ان کی تنقیدی بصیرت سے متعلق ہنوز کام باقی ہے۔‘‘

(سہ ماہی مژگاں، کلکتہ، شمارہ: ۳۱-۳۲، ۲۰۰۸ء، ص۔۱۳۷)

○○○

آخری غزل

ذیل کی غزل وحشتؔ کی آخری غزل ہے۔ یہ انھوں نے مارچ ۱۹۵۵ء میں کلکتہ کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی۔ موصوف نے اس غزل کا خطی نسخہ انھی دنوں اپنے دست خاص سے حضرت امیر الاسلام شرقی ساکن ڈھاکہ کو عنایت کی تھی جن کے توسط سے یہ راقم الحروف تک پہنچی۔ اب یہ غزل مشرقی صاحب کے شکریے کے ساتھ نذر قارئین ہے۔ (وفا راشدی)

جو زندگی میں ہمیں کچھ امید ہی نہ رہی
تو زندگی ہی ہماری رہی رہی نہ رہی

دلِ فسردہ نے یوں مجھ کو بے نیاز کیا
کہ دہر میں کوئی شے وجہِ دل کشی نہ رہی

مقامِ شکر ہے، اک ایسا وقت آ پہنچا
کہ دل کے حال کی خود دل کو آگہی نہ رہی

بہت خودی نے خدائی میں سر اٹھایا تھا
بیخودی کا ہے احسان وہ خودی نہ رہی

غلط ہے دوں جو گلستان دہر کو الزام
جب اپنے غنچۂ خاطر میں تازگی نہ رہی

یہ کیا ضرور ہے روؤں میں عیش رفتہ کو
برا ہی کیا ہے جو لب پر ترے ہنسی نہ رہی

یہ کس کی جلوہ نمائی ہے بزم میں وحشت
بقول میرؔ ''چراغوں میں روشنی نہ رہی''

یہ غزل مجھے وفا راشدی کی کتاب 'حیات وحشت' سے حاصل ہوئی۔ چوں کہ یہ ان کی آخری غزل ہے اور کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے، اس لیے اس کی اہمیت کئی اعتبار سے بڑھ جاتی ہے۔ وفا راشدی نے یہ غزل 'چراغوں میں روشنی نہ رہی' کے عنوان سے شامل کی ہے۔
(معید رشیدی)

کتابیات

بنیادی ماخذ

کتاب	مصنف/مرتب	پبلشر/پرنٹر	سن اشاعت
دیوانِ وحشتؔ	رضا علی وحشت کلکتوی	ستارۂ ہند پریس، کلکتہ	1910
ترانۂ وحشتؔ	رضا علی وحشت کلکتوی	مکتبۂ جدید، لاہور	1953
نقوش و آثار	رضا علی وحشت کلکتوی	مکتبۂ عارفین، قرآن منزل، ڈھاکہ	1957
مضامین وحشتؔ	رضا علی وحشت کلکتوی مرتبہ: جمال احمد صدیقی	مغربی بنگال اردو اکیڈمی، کلکتہ	1982
مکاتیب وحشت	رضا علی وحشت کلکتوی مرتبہ: شمس الدین عازم	بزمِ شاکری، کلکتہ	1957

ثانوی ماخذ

کتاب	مصنف/مرتب	پبلشر/پرنٹر	سن اشاعت
اردو ادب اور بنگالی کلچر	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ	1982
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2006

اردو غزل اور ہندوستانی			
ذہن و تہذیب	گوپی چند نارنگ	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2002
اردو غزل گوئی	فراق گورکھپوری	اشرف پریس، لاہور	1955
اردو غزل (۱۹۴۰ء کے شعرا کے تناظر میں)			
	مرتبہ: عابد رضا بیدار	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	1955
اردو غزل	یوسف حسین خان	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	1957
اردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھپوری	سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	1945
اصلاحِ سخن	عبدالعلیٰ شوق سندیلوی	اتر پردیش اردو اکادمی	2004
افہام و تفہیم	ڈاکٹر عبدالمنان	اثبات و نفی پبلی کیشنز، کلکتہ	2003
انیسویں صدی میں			
بنگال کا اردو ادب	جاوید نہال	اردو رائٹرس گلڈ، کلکتہ	....
آبِ حیات	محمد حسین آزاد	کتابی دنیا دہلی	2004
آزادی کی کہانی خود آزاد کی زبانی	ابوالکلام آزاد		
	مرتبہ: عبدالرزاق ملیح آبادی	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	1958
آزادی کے بعد کی غزل			
کا تنقیدی مطالعہ	بشیر بدر	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	1981
بدرالزماں بدر کلکتوی:			
حیات و خدمات	یوسف تقی	دی گلوزی آرٹ پریس، کلکتہ	2004
بنگال میں اردو شاعری	مرتبہ: علقمہ شبلی	مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ	2001
بنگال میں اردو ناول	یوسف تقی	یوسف تقی، مارکوئس لین، کلکتہ	2007
بنگال میں اردو نثر کی تاریخ			
(آغاز تا حال)	سالک لکھنوی	مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ	1998

بنگال میں اردو	وفا راشدی	مکتبہ اشاعت اردو، حیدرآباد (سندھ)	1955
تجلیات قمر	قمر صدیقی		
	مرتبہ: جمال احمد صدیقی	پرنٹ ویل، کلکتہ	1982
تلاش معیار	ڈاکٹر عبدالروف	مکتبہ رحیمی، کلکتہ	1978
جام بیخودی	عباس علی خاں بیخود	جدید اردو، کلکتہ	1945
جام نو	تاباں القادری	مکتبہ قادریہ، کلکتہ	1946
جمیل مظہری			
(ہندوستانی ادب کے معمار)	مظہر امام	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	1992
حرف حرف تلاش	علقمہ شبلی	اثبات و نفی پبلی کیشنز، کلکتہ	2008
حیات وحشت	وفا راشدی	مکتبہ کارواں، لاہور	1982
خدوخال	اعزاز افضل	نیوایشین پرنٹرز، کلکتہ	2003
داستان وفا	وفا راشدی	مکتبہ اشاعت اردو، کراچی	1997
دبستان وحشت کا تنقیدی مطالعہ	راز عظیم	رومی پبلی کیشنز، کلکتہ	1989
دور حاضر اور اردو غزل گوئی	عندلیب شادانی	پرویز بک ڈپو، دہلی	1945
دیوان حالی	الطاف حسین حالی		
	مقدمہ: رشید حسن خاں	اردو اکادمی دہلی، نئی دہلی	2006
دیوان ناطق	ناطق لکھنوی		
	مرتبین: رشید احمد، اقبال عظیم	انجمن تعمیر ادب، چاٹگام، مشرقی پاکستان	1957
سرگذشت آصف	ہارون رشید	مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ	1983
شاعری اور شاعری کی تنقید	عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1975
شعلۂ رنگین	جرم محمد آبادی	کلکتہ اردو پریس، کلکتہ	1961

عباس علی خاں بیخود

فن اور شخصیت   مرتبہ: ڈاکٹر محمد منصور عالم   پریسی زن ٹیکنک پرائیوٹ لمیٹڈ، کلکتہ   1999

غزل اور غزل کی تعلیم   اختر انصاری   قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی   2001

فن شاعری   اخلاق حسین دہلوی   کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی   ....

کلام بیخود   عباس علی خاں بیخود، مرتبین:
رونق نعیم، صفدر علی خاں، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ   2001

کلام (شعری مجموعہ)   سالک لکھنوی   نیو ایشین پرنٹرز، کلکتہ   1999

کلکتہ اک رباب   سید حرمت الاکرام   حلقہ ترویج ادب، مرزا پور، اتر پردیش   1966

کلکتے کی ادبی داستانیں   وفا راشدی   مکتبہ اشاعت اردو، کراچی   1999

کلیات حسرت موہانی   حسرت موہانی   فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ، نئی دہلی   ....

لالۂ صحرا (بزم احباب کولکاتا کا یادگار ادبی مجلّہ)
علقمہ شبلی   بزم احباب، کلکتہ   2003

مآثر بنگال   کلیم سہسرامی
مرتبہ: مظہر الحسنین   دار الادب، پٹنہ   1993

متاع ادب   جاوید نہال   اریب پبلی کیشنز، کلکتہ   1989

مثنوی فریاد داغ   داغ دہلوی
مقدمہ: تمکین کاظمی   کمرشیل بک ڈپو، حیدر آباد   1956

محمد تقی میر   جمیل جالبی   ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی   2001

مشام روح   تاباں القادری   مکتبہ قادریہ، کلکتہ   1951

مشرقی بنگال میں اردو   سید اقبال عظیم   مشرق کوآپریٹیو پبلی کیشنز، ڈھاکہ   1954

مشرقی شعریات اور اردو تنقید   ابوالکلام قاسمی   قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی   2002

مضامین   سالک لکھنوی
مرتبہ: ہمایون جمیل   پرنٹنگ آرٹ، کلکتہ   2006

مغربی بنگال کا شعری و نثری ادب   مرتبین: شاہد ساز، امتیاز احمد   اثبات و نفی پبلی کیشنز، کلکتہ   2008

مقدمہ شعر و شاعری   خواجہ الطاف حسین حالی   ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ   2004

موازنہ انیس و دبیر   شبلی نعمانی   ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ   1994

میرے بزرگ میرے ہم عصر   وفا راشدی   مکتبہ اشاعت اردو، کراچی   1995

نساخ سے وحشت تک   سید لطیف الرحمٰن   مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ   2002

نکاتِ سخن   حسرت موہانی   رئیس المطالع، کانپور   1940

وحشت شناسی   مرتبہ: علی عرفان نقوی   شعبۂ اردو، خضر پور کالج، کلکتہ   2006

ولی (ہندوستانی ادب کے معمار)
نور الحسن ہاشمی   ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی   1990

ہگلی اور اردو ادب   مرتبہ: مشتاق احمد حامی   شمیم بک ڈپو، کلکتہ   1986

رسائل

رسالہ	مقام اشاعت	سن اشاعت	مدیر/مرتب
مہر نیم روز	کراچی	وحشت نمبر (۱۹۵۷ء)	حسن مثنیٰ ندوی، ابوالخیر کشفی
مغربی بنگال	کلکتہ	وحشت نمبر (۱۹۹۶ء)	مصطفٰے اکبر
روحِ ادب	کلکتہ	۱۹۸۴ء	....
روحِ ادب	کلکتہ	۱۹۹۵ء	....
روحِ ادب	کلکتہ	۱۹۹۲ء	....
اردوے معلیٰ	علی گڑھ	اپریل ۱۹۱۰ء	حسرت موہانی
زمانہ	کانپور	جون ۱۹۱۰ء	منشی دیا نرائن نگم

دلگداز	لکھنؤ	اپریل ۱۹۱۰ء	عبدالحلیم شرر
نگار	لکھنؤ	جون ۱۹۴۶ء	نیاز فتحپوری
آبشار	کلکتہ	(خصوصی شمارہ) ۱۹۹۵ء	سالک لکھنوی
مجلّہ یادگار وحشتؔ	کلکتہ	۱۹۸۱ء	اسحاق راشد
مژگاں	کلکتہ	۲۰۰۸ء	نوشاد مومن

○○○